رات کا مسافر

طاہر جاوید مغل

بے پروائی اور بے وقعتی کے سبب عہدِ حاضر کا انسان نہ تو اپنے قول کی پاسداری کرتا ہے اور نہ ہی اپنے فعل کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی کھیل اس کی زندگی کے ساتھ بھی کھیلا جا رہا تھا جس کے قول و فعل میں اگرچہ کوئی تضاد تو نہ تھا مگر اس کی زندگی ایک خاموش وعدے کے عوض گروی رکھ دی گئی تھی جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی ورنہ... بے وفائی کی صورت میں ویرانے اس کے منتظر تھے لیکن جس لمحے کا انتظار اس نے برسوں کیا.... جب اس کی برسات میں بھیگنے کا وقت آیا تو تپتی دھوپ میں اس کے قدم صحرا کی جانب اٹھ گئے۔ جانے یہ اسی بھولے بسرے عہد سے منحرف ہونے کا نتیجہ تھا یا مقدر کی ستم ظریفی کہ کسی کے ہاتھوں کی مہندی اور سہرے کے پھولوں کی مہک بھی اس کے قدموں کو روک نہ سکی... اس نے منہ کیا پھیرا کہ خوابوں نے بھی آنکھوں سے رختِ سفر باندھ لیا... بے سمت بھٹکتے ہوئے اس لمبی مسافت میں اب اسے اجنبی چہروں کے سوا اور کیا ملنا تھا۔ تاریک رستوں پر اس کا ہم سفر بس ایک سایہ تھا جو آسیب کے مانند اسے ایک پل کے لیے بھی خود سے جدا نہ کرتا تھا، خدا جانے یہ محبتوں کی انتہا تھی یا نفرتوں کا انتقام... جو بھی تھا اسے زندگی سے دور جانا تھا، چاہے آگ کا دریا عبور کرتے ہوئے یا گرم صحرا پار کرتے ہوئے... ہر حال میں اس عہد کی پاسداری لازم تھی کہ جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی۔

منظورِ نظر کی نظروں میں رہنے کے لیے ایک اندھے راستے کا

زندہ ماجرا

وہ اپریل کی ایک نیم گرم شام تھی۔ آج میری مہندی کی رسم ادا ہونا تھی۔ زور و شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میری شادی میری تایازاد عارفہ سے ہو رہی تھی۔ وہ لوگ بھی لاہور کے رہائشی تھے اور وہ گلبرگ میں رہتے تھے جبکہ ہم چوبرجی میں تھے۔ ہمارا رشتہ قریباً ڈیڑھ سال پہلے طے ہوا تھا۔ یہ عرصہ دن گن گن کر ہی گزارا گیا تھا اور اب...... آخر کار وہ گھڑیاں آ گئی تھیں جن کا ہر کسی کو شدت سے انتظار تھا اور خاص طور سے مجھے اور عارفہ کو۔

میں سارا دن مختلف کاموں میں مصروف رہا تھا اور اب قریباً تھک کر چور ہو چکا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں بستر پر پڑ کر سو جاتا اور اگلے روز صبح دس بجے سے پہلے بستر نہ چھوڑتا لیکن آج ایسا کیسے ہو سکتا تھا جبکہ یہ میری مہندی کی رات تھی۔

دونوں گھروں میں علیحدہ علیحدہ مہندی ہونا تھی۔ یہ

1973ء کی بات ہے۔ ان دنوں ابھی شادی ہالز کے رواج نے زور نہیں پکڑا تھا اور ابٹن مہندیاں وغیرہ تو گھر سے باہر کرنے کا تصور بھی کسی کے ذہن میں نہیں تھا۔ بڑے بھائی جان نے مہمانوں کے لیے بریانی کی دو دیگیں چڑھوا دی تھیں۔ پورے گھر میں گہما گہمی تھی۔ ڈھولک پر گیت گائے جا رہے تھے۔ خاندان کی عورتوں نے مجھے مہندی لگائی اور رسمیں وغیرہ ادا کیں پھر وہ سب لوگ عارفہ کے گھر چلے گئے۔

اب گھر میں، میں اور بس ایک دو ملازم ہی رہ گئے تھے۔ میں نے عارفہ کو فون کرنا چاہا۔ دوسری طرف سے عارفہ کی چھوٹی بہن نے فون اٹھایا اور شوخی سے بولی۔ ”بس بھائی جان! اب کوئی بات نہیں...... کوئی فون نہیں۔ اب تھوڑا سا انتظار فرمائیے۔ چند گھنٹوں کا فاصلہ ہے پھر جی بھر کر باتیں فرمائیے گا۔“

میں نے اس کی منت سماجت کی لیکن وہ سماج کی دیوار بنی رہی اور مجھے ستاتی رہی۔ میں نے تھک ہار کر فون بند کر دیا۔ ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے بستر پر نیم دراز ہو گیا اور سوچنے لگا، وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے اور مختلف منزلیں یکے بعد دیگرے ہمارے سامنے آتی چلی جاتی ہیں۔

میرا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ والد صاحب کا لکڑی کا کاروبار تھا۔ بڑے بھائی ٹی ٹرالیز بناتے تھے اور ہماری فرم کا اچھا خاصا نام تھا۔ میں بھی گریجویشن کے دوران میں ہی اپنے کاروبار کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ لکڑی یعنی ٹمبر کا کام میری طبیعت کے مطابق تو نہیں تھا لیکن والد کا ہاتھ بٹانے کے لیے ضروری تھا کہ میں اس کام میں آجاؤں۔ آج کل میں والد کے ساتھ دکان پر ہوتا تھا اور اپنی ہمت کے مطابق ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ میری زندگی لگے بندھے راستوں پر بڑے ہموار طریقے سے چل رہی تھی۔ شام تک دکان پر رہتا، پھر اپنے بچپن کے دوست تنویر کے ساتھ گپ شپ کرتا یا فلم وغیرہ دیکھنے چلا جاتا۔ ٹی وی ان دنوں نیا نیا آیا تھا۔ اس میں بھی ہم لوگ بے حد دلچسپی محسوس کرتے تھے۔ اردو ڈراموں کے علاوہ، رابن ہڈ، فیوجی اور آئرن سائڈ جیسی سیریز شوق سے دیکھا کرتے۔ میرا حلقۂ احباب زیادہ وسیع نہیں تھا۔ میں اپنے حال میں مست رہنے والا شخص تھا۔ اسی لیے گھر والے بعض اوقات مجھے پیار سے ہارون کے بجائے ہارون بادشاہ بھی کہا کرتے تھے۔ ہاں تو میں بات کر رہا تھا اپنی مہندی کی رات کی۔ میں تھکن سے چور تھا، ذرا سکون لینے کے لیے بیڈ سے ٹیک لگا کر لیٹ گیا...... میں جو کچھ آپ کو بتانے لگا ہوں، اس سے پہلے میں آپ کو ایک بات سے آگاہ کر دوں۔ میں صدقِ دل سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ میں ایک حقیقت پسند بندہ ہوں۔ میں نے مافوق الفطرت سوچوں کو کبھی اپنے ذہن میں جگہ نہیں دی اور نہ اب دیتا ہوں۔ ہر ناقابل فہم بات کے پیچھے میں نے ہمیشہ ٹھوس وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اور کامیاب رہا ہوں۔

اب میں پھر اصل روداد کی طرف آتا ہوں۔ میں بیڈ سے ٹیک لگا کر لیٹ تو گیا لیکن میرا ابھی سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ مجھے گھر والوں کی واپسی کا انتظار کرنا تھا، مجھے اونگھ سی آنے لگی۔ پلکوں پر بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ میں اسی طرح نیم دراز رہا اور خیالوں کے گھوڑے دوڑاتا رہا۔ وہ نیند اور بیداری کی کوئی درمیانی حالت تھی۔ مجھے ایک دم لگا جیسے اس اکیلے کمرے میں کوئی اور بھی میرے آس پاس موجود ہے۔ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ کمرے کے دروازے کے سامنے نظر آیا۔ وہ ایک سفید ہیولا سا تھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس جس کا سر بھی سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ بس سیاہ اور سفید ڈاڑھی کی جھلک نظر آرہی تھی۔ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”ہارون! کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا...... اور ایسا نہیں ہوا...... اب اس کی قیمت ادا کرنا ہو گی۔“

پھر ایک دم وہ ہیولا اوجھل ہو گیا۔ میں جیسے چونک کر غنودگی کی حالت میں سے نکل آیا۔ کمرا خالی تھا۔ دروازہ بند تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وال کلاک کی ٹک ٹک سنائی دی۔ سوئیاں رات گیارہ بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ میں سوچنے لگا کہ یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کیا ہوا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ قریب ہی ریڈیو سیٹ پڑا تھا۔ میں نے اٹھ کر پہلے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے پھر ریڈیو پر کوئی اسٹیشن تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

غنودگی کی حالت میں جو فقرہ میں نے سنا تھا، وہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا تھا...... ہارون! کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا...... اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہو گی۔

یہ کیا فقرہ تھا؟ مجھے اس کا کوئی سر پیر سمجھ نہیں آیا لیکن عجیب بات تھی کہ فقرے کا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں موجود تھا اور لفظ ہی نہیں، لہجہ، آواز، آواز کا اتار چڑھاؤ، سب کچھ جیسے میری سماعت میں نقش ہو گیا تھا۔ بہر حال اس وقت میں نے اس واقعے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ انسانی تصورات عجیب و غریب شکلیں بناتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی یہ تصورات کسی غیر مرئی آواز کا روپ دھار لیتے ہیں،

کبھی کسی منظر کا۔ کبھی کوئی اندیشہ بن جاتے ہیں اور دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں اور کبھی کوئی خوب صورت سپنا بن کر آنکھوں میں سما جاتے ہیں۔ شاید یہ بھی کوئی ایسی ہی قلبی واردات تھی۔

میرے گھر والوں کی واپسی ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ ایک بار پھر گھر میں شور اور ہنگامہ جاگ اٹھا۔ ڈھولک بجنے لگی اور گیت گائے جانے لگے۔ اب ہر ایک کو آنے والے دن کا انتظار تھا۔ تاریخ تھی 17 اپریل اور یہ دن تھا میری شادی کا۔ ہاں، وہی دن جس کا پل پل انتظار کیا گیا تھا۔

ان دنوں باراتیں شام کے فوراً بعد ہی دلہن کے گھر جا پہنچتی تھیں۔ میری بارات بھی آٹھ بجے کے قریب گلبرگ میں موجود تھی۔ وہ رنگوں، خوشبوؤں اور روشنیوں کی رات تھی۔ ہر طرف قہقہے بکھر رہے تھے۔ نکاح کی رسم کے فوراً بعد کھانا شروع ہو گیا۔ میں اسٹیج پر بیٹھا تھا۔ رواج کے مطابق میرا کھانا اسٹیج پر ہی میز پر سجا دیا گیا۔ میرے دائیں بائیں میرے گھر والے موجود تھے۔ بڑے بھائی فاروق نے میرے لیے کھانا پلیٹ میں نکالا۔ میں نے پہلا لقمہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میری نظر سامنے مہمانوں کی طرف اٹھی۔ بہت سے افراد کے پیچھے مجھے ایک شخص نظر آیا اور مجھے لگا جیسے میری رگوں میں خون جم گیا ہے۔ یہ وہی کل رات والا ہیولا تھا۔ سر سے پیر تک سفید کپڑوں میں ملبوس۔ چہرہ پوری طرح نظر نہیں آتا تھا۔ بس سفید اور سیاہ ڈاڑھی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ وہ جیسے میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

ایک لحظے کے لیے نظر آکر وہ اوجھل ہو گیا۔ میں ہکا بکا سا بیٹھا تھا۔ بڑے بھائی جان نے کہا۔ ”کیا بات ہے ہارون! کیا ہوا؟“

”کک...... کچھ نہیں بھائی جان۔“

”کسی نے کچھ کہا ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”نہیں...... نہیں۔“

”تو کھانا کھاؤ نا بھئی۔“ وہ چمچ میرے ہاتھ میں تھما کر بولے۔

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں اب کھانا کھاتے ہوئے مہمانوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دل پر جبر کر کے میں نے کھانا کھانے کی کوشش کی۔ پتا نہیں کیوں، کل رات سنا ہوا فقرہ...... بے معنی فقرہ پھر میرے کانوں میں گونجنے لگا...... کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہو گی۔

یہ کیا فقرہ تھا؟ یہ کیا لفظ تھے؟

انسان کے دشمن

انسان کے چار دشمن بڑے خطرناک ہیں، ان سے بچنے کے لیے نہایت ہوشیاری اور کوشش درکار ہے۔

1۔ دنیا...... نہایت دھوکے باز اور مکار ہے۔

2۔ نفس...... یہ تمام دشمنوں سے زیادہ عیار ہے۔

3۔ شیطان...... اس کا تو مشن ہی انسان دشمنی ہے۔

4۔ برا انسان...... برا ساتھی، شیطان سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ وہ تو لاحول ولا سے بھاگ جاتا ہے۔ یہ تو ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔

مرسلہ۔ محمد جاوید عباسی، نیو سینٹرل جیل ملتان

میں نے خود کو ملامت کی اور اپنے بے مطلب خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، ماورائی خیالات...... اور توہمات کے لیے میرے ذہن میں کبھی کوئی جگہ نہیں رہی۔ میں نے ہر چیز کو ہمیشہ ٹھوس ثبوتوں اور سائنسی نقطۂ نظر کے ساتھ دیکھا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس رات بھی اس واقعے نے مجھ پر تادیر اثر نہیں کیا۔ میں نے اپنی اس پریشان خیالی کو جلد ہی فراموش کر دیا اور شادی کے ہنگاموں میں کھو گیا۔

کھانے کے بعد پورے جوش و خروش سے مختلف رسمیں ادا ہوئیں اور میری بارات، گاڑیوں کے قافلے کی صورت میں، دلہن کو گلبرگ سے لے کر چوبرجی پارک ہماری رہائش گاہ پر پہنچ گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، اپریل کی وہ شب بڑی خوشگوار تھی۔ موسم قدرے ابر آلود تھا اور ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ گھر میں گہما گہمی تھی۔ آرائشی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ میں بہانے سے بار بار اپنے کمرے کی طرف جاتا تھا۔ میری بہنیں اور کزنز وغیرہ مجھ پر فقرے کستی تھیں اور مجھے وہاں سے چلتا کرتی تھیں۔ انتظار کی گھڑیاں کاٹنا مشکل ہو رہی تھیں۔ کتنا اہم ہوتا ہے یہ شادی کا دن۔ زندگی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے...... اور اس سے بھی اہم شبِ عروس۔ خوشیوں اور مرادوں کی گھڑیاں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جوڑوں کی صورت میں بنایا پھر ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت پیدا کی پھر انہیں قربت کی مسرتوں اور جدائی کی

تکلیفوں سے آشنا کیا...... ایک ایسا نظام بنایا جو اس کائنات میں زندگی کو رواں دواں رکھتا ہے۔

میں گھر کے سامنے گراسی لان پر اپنے دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا۔ مجھے چھیڑنے اور تنگ کرنے میں میرا قریبی دوست تنویر پیش پیش تھا۔ دل کے اندر خوشی ہو تو ہر چیز اچھی لگتی ہے۔ ہم معمولی معمولی باتوں پر بھی قہقہے لگا رہے تھے۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ میری زندگی ایک کتنے سنگین رخ پر مڑنے والی ہے۔ میں ایک ایسے دوراہے پر پہنچ چکا ہوں جس کی ایک جانب میری دلہن ہے، میرا گھر ہے اور بے مثال خوشیاں ہیں۔ دوسری طرف تاریکی ہے، ویرانی ہے اور لرزا دینے والے واقعات ہیں۔

بعض اوقات انسانی زندگی کا رخ موڑنے کے لیے کسی بڑے واقعے یا حادثے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی چھوٹی سی بات، کوئی چھوٹا سا واقعہ بھی تہلکہ خیز تبدیلیاں لے آتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ آج ان باتوں کو کم و بیش 41 سال گزر چکے ہیں۔ میں ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد ریٹائر ہو چکا ہوں۔ میرے بچے ہیں، ان کے بچے ہیں۔ زندگی کا باقی سفر شاید اب بہت طویل نہیں رہا لیکن میں آج بھی اس رات کو اور اس رات میں آنے والی تبدیلی کے بارے میں سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں۔ کیا وہ اتنی ہی بڑی بات تھی جس کی وجہ سے میرے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جس نے مجھے ہی نہیں، میرے اہلِ خانہ اور میرے پورے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا، تہس نہس کر دیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگاتے لگاتے مجھے پیاس محسوس ہوئی تھی۔ میں پانی پینے کے لیے اندر آیا۔ لان میں بھی ایک شامیانہ لگا تھا۔ قنات کے قریب سے گزرتے ہوئے میں ذرا ٹھٹک گیا۔ قنات کی دوسری طرف ہمارے محلے کی ہی دو عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ انہیں ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ کوئی ان کے اتنا پاس ہے اور ان کی آواز صاف سن رہا ہے۔ ایک عورت نے کہا۔

”ہاں...... ہارون ابھی کرتا ورتا تو کچھ نہیں۔ باپ ہی پیسے اس کی جیب میں ڈالتا ہے۔ پتا نہیں کیسے بوجھ اٹھائے گا بیوی کا اور پھر بچوں کا۔“

دوسری عورت نے کچھ اس سے بھی زیادہ سخت بات کی۔ مطلب اس بات کا بھی وہی تھا جو پہلی عورت کی بات کا تھا۔

پہلی عورت نے دوبارہ کہا۔ ”بس بڑوں نے ہی پکڑ دھکڑ کر شادی کر دی ہے۔ اب وہی اس کا گھر بھی چلائیں گے۔“

میں اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہ گیا۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ عورتیں سرگوشی کے لہجے میں زہر اگل رہی تھیں اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں زمین کے اندر گڑ گیا ہوں۔ میں اتنا گیا گزرا تو نہیں تھا جتنا وہ مجھے سمجھ رہی تھیں اور پھر ان کی زبان اور لہجہ...... میرا دل چاہا کہ ان کے سامنے چلا جاؤں اور ان سے پوچھوں کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں اور یہ سب کچھ کہنے کا کیا جواز ہے ان کے پاس۔ میری پیشانی پر پسینا آ گیا۔ کسی وقت ایسا ہوتا ہے۔ بندے کو پتا چلتا ہے کہ اس کی پیٹھ پیچھے کس طرح کی بات کی گئی ہے اور وہ حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔

میں اپنی پیاس وغیرہ بھول گیا اور سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلا گیا۔ چھت خالی تھی۔ میں جیسے نڈھال سا ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ چھت پر بجلی کے وہ تار بچھے تھے جن کے ذریعے آرائشی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ روشنیوں کی جگمگاہٹ چھت پر بھی محسوس کی جا سکتی تھی لیکن میرے اندر کا منظر کچھ اور ہو گیا تھا۔ میرے اندر کی ساری روشنیاں جیسے ایک دم بجھ گئی تھیں۔ گھٹا ٹوپ تاریکی چھا گئی تھی۔ مجھے لگا میں دلہا نہیں ہوں، ایک مرا ہوا شخص ہوں جس کے کفن دفن کا انتظام کیا جانے والا ہے۔ ایک کھنڈر ہوں جو تیز بارش میں کسی بھی وقت مسمار ہو جائے گا یا ایک کھوکھلی جڑوں والا درخت جسے ہوا کا ایک تیز جھونکا اکھاڑ پھینکے گا۔

یہ کیا ہو گیا تھا میرے ساتھ؟ آناً فاناً میں کیا سے کیا بن گیا تھا۔ اردگرد کی خوشیوں، رونقوں اور روشنیوں سے بہت دور چلا گیا تھا میں۔ منظر اجنبی محسوس ہو رہے تھے اور آوازیں غیر لگ رہی تھیں...... ہاں، میں آج بھی سوچتا ہوں، کیا صرف اتنی سی بات تھی کہ میں نے دو عورتوں کو اپنے بارے میں طنزیہ گفتگو کرتے سنا تھا یا پھر کوئی اور وجہ بھی تھی...... کوئی ایسی وجہ جو زیادہ بڑی تھی، زیادہ گہری اور گمبھیر تھی؟

میں قارئین سے کچھ بھی چھپاؤں گا نہیں۔ جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا، صاف سیدھے الفاظ میں بیان کرتا چلا جاؤں گا۔ ممکن ہے کہ کہیں کہیں مجھ سے اتفاق نہ کیا جائے۔ میرے عمل کو غیر حقیقی یا جذباتی سمجھا جائے یا پھر یہ سمجھا جائے کہ شاید اصل روداد سے فلاں واقعے کا زیادہ تعلق نہیں...... لیکن میں وہی بتاؤں گا جو جو میرے ساتھ ہوا اور جو اس کہانی کا حصہ ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں قریباً آدھ گھنٹا اس تاریک چھت پر بیٹھا رہا اور اپنے اندر کی بجھی ہوئی روشنیوں میں سے کوئی کرن ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا لیکن کرن کہیں نہیں تھی۔ روشنی کا نقطہ تک نہیں تھا۔ میں بجھ چکا تھا۔

مکمل طور پر تاریک ہو چکا تھا۔ دل و دماغ پر ایک سیاہ دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی جیسے میرے اندر سے بہ آوازِ بلند کہہ رہا تھا...... ہارون! چلے جاؤ یہاں سے...... بہت دور نکل جاؤ...... سب کچھ چھوڑ دو...... خیر آباد کہہ دو۔ یہاں کچھ نہیں ہے تمہارے لیے...... یہاں رکے رہو گے تو دم گھٹنے سے مر جاؤ گے۔ تم یہاں کے لیے نہیں ہو...... اور یہ سب کچھ تمہارے لیے نہیں ہے۔ تم ایک بے کار انسان ہو۔ دنیا کی حقیر ترین مخلوق ہو۔ تم کسی کے کام کے نہیں ہو۔ اپنا چہرہ چھپا لو...... اپنی شکل لے کر ویرانوں کا رخ کر لو، کسی سمندر کی تہ میں بیٹھ جاؤ...... کسی صحرا کی ریت میں دفن ہو جاؤ یا پھر خاک بن کر دور دراز کی ہواؤں میں بکھر جاؤ۔

کوئی مجھے کھینچ رہا تھا۔ مجھے میرے گھر سے نکال رہا تھا۔ جگمگاتی روشنیوں سے دور لے جا رہا تھا۔ میری دلہن چند قدم کے فاصلے پر حجلۂ عروسی میں موجود تھی۔ میرا انتظار کر رہی تھی۔ میرے قدموں کی چاپ سننے کی منتظر تھی اور میں ذہنی طور پر اس سے ہزارہا میل کے فاصلے پر جا چکا تھا۔ نچلی منزل سے لڑکیوں کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بچے چہکار رہے تھے۔ صحن میں بڑے بھائی جان کھڑے تھے۔ شاید کل کے ولیمے کے لیے ابا جان اور دوسرے بھائیوں سے مشورہ کر رہے تھے۔

میں جیسے ایک سیاہ غبار میں چلتا ہوا نیچے آیا۔ کسی نے مجھ سے کیا کہا، مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں نے کسی کو کیا جواب دیا، مجھے یہ بھی یاد نہیں...... میرے اردگرد اس وقت کیا ہو رہا تھا، میں یہ بھی بھول چکا ہوں۔ مجھے بس اتنا یاد ہے...... بہت سے مہمان سو چکے تھے۔ کئی سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا ہوا والدہ کے کمرے میں پہنچا۔ وہ شاید شکرانے کے نفل ادا کرنے میں مصروف تھیں۔ میں ان کے پاس سے گزر کر اپنی الماری تک آیا۔ الماری میں میرا پاسپورٹ اور کچھ دیگر کاغذات موجود تھے۔ میں نے پاسپورٹ اٹھا کر جیب میں ڈالا، کچھ نقدی الماری میں سے لی، کچھ سلامیوں کی صورت میں میرے پاس پہلے سے موجود تھی۔ میں کسی معمول کی طرح چلتا ہوا صحن میں پہنچا اور باہر سڑک پر آ گیا۔ شاید کسی نے عقب سے مجھے آواز دی تھی، شاید میں نے بھی جواب میں کچھ کہا تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں۔ غالباً یہ کہا تھا کہ میں ذرا بازار تک جا رہا ہوں...... کولڈ ڈرنک لینے......

اور میں نکل آیا تھا۔ اپنی شب عروسی کو چھوڑ کر، اپنی دلہن کو چھوڑ کر اور اپنے جگمگاتے گھر کو چھوڑ کر۔ میرے قدم بے ساختہ اٹھتے چلے جا رہے تھے۔ میرے جسم پر وہی دولھے والا پینٹ کوٹ تھا...... اور ان پھولوں کی خوشبو ابھی تک میرے لباس میں موجود تھی جو رسموں کے دوران میں مجھ پر نچھاور کیے گئے تھے۔ وہ رات قریباً بارہ بجے کا عمل تھا۔ میں نے مین سڑک پار کی اور مزنگ چونگی کی طرف چل دیا۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی۔ جو لوگ لاہور کے اس علاقے کو جانتے ہیں، انہیں معلوم ہوگا کہ چوبرجی پارک اور مزنگ چونگی کے درمیان لاہور کا سب سے بڑا...... بلکہ شاید پاکستان کا سب سے بڑا قبرستان میانی صاحب پڑتا ہے۔ میں اسی قبرستان کے اندر سے گزر رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا اور حد نگاہ تک بس جھاڑیاں تھیں یا قبروں کے بکھرے سلسلے تھے۔ مجھے لگا جیسے میں بھی ایک مردہ ہوں اور ابھی ابھی کسی قبر سے نکل کر چل پڑا ہوں۔ جتنی تاریکی باہر تھی، اس سے کئی گنا زیادہ میرے اندر تھی۔

اچانک مجھے دو جسیم کتے نظر آئے۔ یہ آوارہ کتے جھاڑیوں سے نکل کر تیزی سے میری طرف بڑھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں بھاگ کھڑا ہوتا لیکن میں زندہ کہاں تھا۔ اپنے اندر کی روشنیاں بجھنے کے بعد، میں تو ایک مردہ تھا اور جو پہلے ہی مردہ ہو اسے مرنے یا تکلیف جھیلنے کا ڈر کہاں ہوتا ہے۔ کتے شور مچاتے ہوئے میری طرف لپکے تو میں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا...... ان کا جوش قدرے ماند پڑ گیا۔ وہ جیسے تعجب کے عالم میں مجھے دیکھتے رہے، پھر وہ آگے بڑھے اور ان کی تھوتھنیاں میری ٹانگوں سے آ لگیں۔ مجھے بالکل یہی لگا کہ وہ اپنی تھوتھنیوں کے ساتھ مجھے پیچھے کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ جیسے وہ جان گئے ہیں کہ میں کتنا بڑا قدم اٹھانے جا رہا ہوں۔ وہ مجھے واپس بھیج رہے ہیں۔ مجھے اس سنگین اور بھیانک غلطی سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی دوران میں ایک ٹرک سنسان سڑک پر سے فراٹے بھرتا ہوا گزرا۔ یہ سڑک بس دس پندرہ قدم کی دوری پر تھی۔ ٹرک کے شور اور اس کے کرخت ہارن نے کتوں کی توجہ میری طرف سے ہٹا دی...... وہ ڈرے ڈرے انداز میں پیچھے ہٹے اور پھر جھاڑیوں میں گم ہو گئے۔ میری دیوانگی کا ریلا مجھے پھر اپنے آپ میں بہانے لگا۔ میں سڑک کے کنارے کنارے چلتا مزنگ چونگی پہنچا۔ وہاں جو بس سب سے پہلے نظر آئی، میں اس میں سوار ہو گیا۔ یہ بس چوک یتیم خانے کی طرف جا رہی تھی۔ چوک یتیم خانے کی جانب جاتے ہوئے یہ بس پھر ہماری رہائش گاہ کی جانب سے گزری۔ قریباً ایک فرلانگ کی دوری پر مجھے اپنے دو منزلہ

گھر کی رنگ برنگی روشنیاں نظر آئیں۔ میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ سینے میں پھیلا ہوا غبار کچھ اور بھی گہرا ہوگیا۔ ایک بار جی میں آیا کہ اپنے قدم روک لوں۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ واپس چلا جاؤں ...... لیکن تیر کمان میں سے نکل چکا تھا...... قریباً دس منٹ بعد میں چوک یتیم خانے میں تھا۔ یہاں سے دوسرے شہروں کو جانے والی گاڑیاں بہ آسانی مل سکتی تھیں۔ میں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ یہ جگہ بھی ہمارے گھر سے بہت زیادہ دور نہیں تھی۔ ایک بس کھڑی تھی۔ ساہیوال جانے کے لیے تیار تھی، میں اس میں سوار ہوگیا۔

کچھ واقعات اتفاقاً پیش آتے ہیں اور ہم انہیں اپنے ساتھ اور اپنے حالات کے ساتھ جوڑ لیتے ہیں۔ اب معلوم نہیں کہ بس میں جو تین بہ ظاہر غیر اہم واقعات پیش آئے، ان کا تعلق میری ذات سے تھا یا نہیں لیکن وہ آج تک میرے ذہن پر نقش ہیں۔ میں انہیں بغیر کمی بیشی کے یہاں لکھ دیتا ہوں۔ ہم ابھی بہ مشکل لاہور شہر سے باہر نکلے تھے کہ اچانک بس کے بریک زور سے چرچرائے۔ پھر وہ بری طرح لہرائی۔ مسافروں کے منہ سے بے ساختہ 'یا اللہ خیر' کے الفاظ نکل گئے۔ ڈرائیور گاڑی کو بہت مشکل سے کنٹرول کرسکا تھا۔ دراصل کوئی جانور گاڑی کے سامنے آگیا تھا۔

ایک بار پھر ہمارا سفر شروع ہوا۔ پتا نہیں کیوں میری آنکھوں سے لگاتار آنسو بہتے چلے جارہے تھے، جنہیں چھپانے کے لیے میں آگے کی طرف جھکا ہوا تھا اور اپنی پیشانی اگلی نشست کی پشت سے ٹکائی ہوئی تھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا میرے ساتھ؟ کیوں ہو رہا تھا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

بس لاہور سے ساٹھ ستر میل دور آچکی تھی، جب ایک بار پھر مسافروں کے دل سینوں میں اچھل کر رہ گئے۔ سڑک کراس کرنے والے کسی دیہاتی کو بچاتے ہوئے بس ایک بار پھر بری طرح لہرائی اور سڑک کنارے بجری کے ایک ڈھیر پر چڑھ گئی۔ ڈرائیور بڑبڑانے لگا۔ اس نے بس کو... بہ مشکل پیچھے ہٹایا۔ وہ سخت پریشان نظر آرہا تھا۔ مسافروں میں سے کئی ایسے بھی تھے جو اسے تنقید کا نشانہ بنانے لگے۔ کچھ احتیاط سے گاڑی چلانے کی ہدایت کرنے لگے۔ ڈرائیور بہ ظاہر تجربہ کار ہی دکھائی دیتا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم پھر اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔ تاہم اس مرتبہ گاڑی کی رفتار خاصی کم تھی ...... اور ڈرائیور کے علاوہ مسافر بھی الرٹ نظر آرہے تھے۔ ابھی ہم ساہیوال سے دس پندرہ میل دور ہی ہوں گے کہ ایک بار پھر سب دہل گئے۔ اس مرتبہ گاڑی کے نیچے سے کچھ زوردار آوازیں آئی تھیں۔ جیسے لوہے کے ساتھ لوہے نے زوردار رگڑ کھائی ہو۔ کئی مسافروں نے کلمۂ طیبہ پڑھا۔ ڈرائیور نے گاڑی کنارے پر روک دی۔ کنڈیکٹر بھی نیچے اتر آیا اور ٹارچ کے ذریعے گاڑی کے نیچے تاک جھانک کرنے لگا۔

مجھے ڈرائیور کے الفاظ آج تک یاد ہیں۔ وہ پہلے تو پھیکے سے انداز میں مسکرایا پھر مسافروں کی طرف دیکھ کر اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''میں پندرہ سال سے گاڑی چلا رہا ہوں لیکن اس طرح کا تماشا میرے ساتھ پہلے کبھی نہیں ہوا۔ آپ سواریوں میں سے جو بھی اپنا برا مقدر لے کر اس بس میں بیٹھا ہوا ہے، خدا کے واسطے نیچے اتر جائے۔ نہیں تو ہم کبھی ساہیوال نہیں پہنچیں گے۔''

پتا نہیں میرے دل میں کیا آئی۔ میں خاموشی کے ساتھ اپنی سیٹ سے اٹھا اور نیچے اتر کر چل دیا۔ کئی مسافر... بکابکا سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے بعد سواریوں نے میرے بارے میں کیا کہا یا ڈرائیور اور کنڈیکٹر وغیرہ نے کیا تبصرہ کیا...... مجھے یہ سب جاننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں تو بس اپنے ہی ریلے میں بہتا چلا جارہا تھا...... اور اس وقت مجھے یہی لگ رہا تھا کہ شاید ڈرائیور نے ''برے مقدر والی سواری'' کی جو بات کی ہے وہ میرے بارے میں ہی تھی۔ واقعی مجھ سے برے مقدر والا اور کون ہوسکتا تھا...... جو اپنی من چاہی دلہن کو پھولوں کی سیج پر چھوڑ کر ویرانوں کی طرف نکل آیا تھا۔

اب رات کا آخری پہر تھا۔ کچے راستے کو گھنے درختوں اور گھٹاٹوپ تاریکی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے اپنی چمچماتی ہوئی گھڑی دیکھی۔ فجر کی اذان ہونے میں قریباً پون گھنٹا باقی تھا۔ میں اندازاً ایک فرلانگ چلنے کے بعد کھیتوں کے پاس ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے اردگرد تاریک تنہائی تھی اور ان دیکھے راستے تھے۔ مجھے اپنا گھر یاد آیا۔ اپنی تہجد گزار ماں یاد آئی ...... اور عارفہ یاد آئی۔ میں رونے لگا۔ پہلے سسکیاں لیتا رہا...... پھر ہچکیوں سے میرا سینہ دہلنے لگا۔ میں رویا اور کھل کر رویا لیکن لگاتار بہتے ہوئے آنسوؤں نے بھی سینے کی آگ کم نہیں کی۔ یہاں کوئی مجھ سے پوچھنے والا نہیں تھا کہ...... اے پہلی رات کے سجے سجائے دُلہا تم ان ویرانوں میں بیٹھ کر کیوں گریہ کررہے ہو...... دیکھو، تمہاری کیا حالت ہوگئی ہے۔ تمہارا عروسی لباس مٹی میں لتھڑ گیا ہے۔ تمہارے چہرے پر مسافت کی گرد ہے اور تمہاری آنکھوں میں بربادیوں نے ڈیرے ڈال لیے ہیں...... ہاں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا اور نہ دلاسا دینے والا تھا۔ بس کانوں میں وہی زہریلے الفاظ گونج رہے تھے جو شامیانے کے اندر بیٹھی ہوئی ان دو عورتوں نے کہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ الفاظ صرف ان دو عورتوں نے نہیں کہے، ساری دنیا نے کہے ہیں لیکن میں پھر کہوں...... میں نے اس وقت سوچا تھا اور اب بھی یہی سوچتا ہوں...... کیا بس وہ چند طنزیہ الفاظ ہی تھے جنہوں نے مجھ سے اتنا بڑا فیصلہ کرایا؟ ایسی چھوٹی موٹی باتیں تو ہر جگہ ہوا ہی کرتی ہیں۔ خوشی کے موقع پر بدخواہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ بڑے بڑے اچھوں کو بھی برا بنا دیا جاتا ہے۔ غلط بیانیاں، جھوٹ، الزام تراشیاں، تضحیک، کردارکشی، کیا کچھ نہیں ہوتا لیکن کیا کسی ایسے واقعے کی وجہ سے اتنا بھیانک قدم اٹھایا جاسکتا ہے؟ یا پھر بات صرف اتنی ہی نہیں تھی، اس کے پیچھے کچھ اور بھی کوئی وجہ تھی ...... اور تب ...... ایک بار پھر مجھے اپنی رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہوا۔

میرے کانوں میں وہی ناقابلِ فہم فقرہ گونجا...... یہ کیا الفاظ تھے؟ یہ کیوں کہے گئے تھے؟ کیا یہ بھی بس ایک اتفاق ہی تھا یا پھر یہ اتفاق نہیں تھا۔ میری سماعت ان الفاظ کی بازگشت کو پھر محسوس کرنے لگی ...... کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ ان الفاظ میں اور میرے یہاں اس جگہ موجود ہونے میں ایک تعلق ہے۔ گہرا تعلق۔

میں ان بے معنی الفاظ کی بازگشت سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرنے لگا اور پھر اسی کوشش میں اٹھ بیٹھا۔ میرا نیا نکور پینٹ کوٹ کھیتوں کی مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے جھاڑا اور ایک بار پھر نامعلوم سمت میں چل دیا۔ میں کہاں جارہا تھا۔ سینے میں پھر دھواں سا بھر رہا تھا۔ ذہن میں بار بار یہی خیال آرہا تھا کہ اپنی اس بے کار اور گناہ گار زندگی سے پیچھا چھڑا لوں...... خود کو ختم کرلوں۔ بس یہی ایک حل نظر آتا تھا اپنے اندر کی بے پناہ اذیت سے چھٹکارا پانے کا۔ اچانک مجھے پانی کے بہاؤ کی مدھم آواز سنائی دی۔ میں تھوڑا آگے گیا تو جھاڑیوں کے درمیان ساہیوال کی بڑی نہر نظر آئی۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور شب کی خاموشی میں پانی کے بہنے کی صدا بہت صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں اس وسیع نہر کے کنارے گھاس پر جا کھڑا ہوا۔ پانی کو دیکھنے لگا۔ دل و دماغ میں پیدا ہوجانے والے خیالات بڑے خوفناک تھے۔ مجھے اس پانی کی گہرائی میں اپنی نجات نظر آرہی تھی۔ جو قدم اٹھا کر میں اپنے گھر سے یہاں چلا آیا تھا، وہ بہت بڑا تھا۔ اس کے نتیجے بھی بہت بڑے اور سنگین نکلنا تھے۔ ان سارے نتیجوں اور اندیشوں سے بچنے کا واحد راستہ یہی نظر آرہا تھا کہ میں ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلوں۔ مجھے تیرنا نہیں آتا تھا۔ اگر میں نہر میں کود جاتا تو یقیناً اس دنیا کے غموں سے چھٹکارا پاجاتا۔

اچانک ''اللہ اکبر'' کی صدا میرے کانوں میں پڑی۔ یہ اذان فجر تھی۔ آخر شب کی جادوئی فضا میں یہ آواز ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی سماعت سے ٹکرائی تو جیسے چند لمحوں کے لیے میرے سینے میں سلگتی ہوئی آگ مدھم پڑگئی۔ اسی دوران میں مجھے عقب میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک شخص میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے تاریکی میں دھیان سے دیکھا...... وہ ذرا لمبے قد کا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر گول براؤن ٹوپی تھی۔

وہ ذرا ڈرے ڈرے لہجے میں بولا۔ ''کون ہو تم؟ اور یہاں کیا کررہے ہو؟''

''کک ...... کچھ نہیں۔ بس ویسے ہی کھڑا تھا۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہیں ...... کوئی ...... نشہ وغیرہ تو نہیں کیا ہوا تم نے؟''

''نن ...... نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے مردہ لہجے میں کہا۔

اس شخص کا خوف اب ذرا کم ہوگیا تھا۔ وہ ہمدرد لہجے میں بولا۔ ''مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ میں تمہیں وہاں اس کھیت سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے تم نہر میں گر پڑو گے۔ کہاں سے آئے ہو تم ...... ساہیوال کے تو نہیں لگتے ہو؟''

''نہیں ...... میں ...... ملتان سے آیا ہوں۔'' میں نے بات بنائی۔

اس نے ایک بار پھر مجھے سرتاپا گھورا۔ میرا انتہائی قیمتی سوٹ، مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ ''ہش پپی'' کے بوٹوں کی حالت اس سے بھی پتلی تھی۔ میری گھڑی، میری انگوٹھی وغیرہ مجھے ایک کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ثابت کرتے تھے۔ وہ الجھے الجھے انداز میں مجھے دیکھتا رہا۔ پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چل دیا۔ ہم دونوں کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ایک ٹیوب ویل کے قریب نیم کے پیڑ کے نیچے آبیٹھے۔ اس شخص

نے اپنا صافہ نما کپڑا گھاس پر بچھا دیا تھا۔ اب ہلکا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو زیادہ اچھے طریقے سے دیکھ سکتے تھے۔ اس شخص کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ اردو بولتا تھا تاہم لہجہ کسی حد تک بلوچی تھا۔ اس نے مجھے اپنا نام فیروز خان بتایا اور...... یہ بتایا کہ وہ یہاں ایک پاس کے گاؤں میں اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کی بوڑھی والدہ بھی اس کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ وہ خود کوئٹہ میں ایک ہوٹل چلاتا تھا۔ مہینے دو مہینے بعد یہاں گاؤں کا چکر لگاتا تھا۔ یہ گھر اس کی بیوی کو اپنے والدین کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ میں نے فیروز کو اپنا نام اشرف بتایا اور کہا کہ میں ملتان سے اپنے ایک عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے ساہیوال آیا تھا۔ رات کو کسی بات پر والد سے جھگڑا ہوگیا اور میں ناراض ہوکر ادھر چلا آیا۔

فیروز نے میری بات پر کس حد تک یقین کیا؟ اور پتا نہیں کیا بھی یا نہیں؟ بہر حال اس نے مجھ سے زیادہ سوال جواب نہیں کیے۔ اس کے رویے میں سب سے اہم بات یہی تھی کہ وہ میری حالتِ زار کو دکھ کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور میرے لیے ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ آج شام ہی کوئٹہ کے لیے روانہ ہو رہا ہے اور اگر میں اس سے کسی طرح کی مدد چاہتا ہوں تو اسے بتاؤں۔

ایک دم میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”کیا آپ مجھے اپنے ساتھ کوئٹہ لے جاسکتے ہیں؟ میں چند دنوں کے لیے اپنے گھر اور اپنے ماحول سے دور رہنا چاہتا ہوں۔“

وہ چند لمحے سوچ کر بولا۔ ”لیکن تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔ تمہیں کسی طرح انہیں اطلاع تو پہنچا دینی چاہیے۔“

”آ...... آپ بے فکر رہیں۔ میں انہیں اطلاع پہنچا دوں گا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ اس نے کہا۔

میں نے اسے بتایا کہ وہ کرائے وغیرہ کی فکر نہ کرے، میرے پاس پیسے موجود ہیں۔

وہ بولا۔ ”آؤ، میں تمہیں اپنے گھر لے چلتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ مناسب نہیں ہوگا انکل۔ میرا حلیہ دیکھ کر آپ کے گاؤں والے حیران ہوں گے۔ میں یہاں سے سیدھا ساہیوال ریلوے اسٹیشن چلا جاتا ہوں۔ آپ نے بھی وہاں سے ہی سوار ہونا ہے نا؟“

انکل فیروز کا جواب ”ہاں“ میں تھا۔

کچھ ہی دیر میں ہمارے درمیان سارا پروگرام طے ہوگیا۔ مجھے ساہیوال ریلوے اسٹیشن پر انکل فیروز کا انتظار کرنا تھا۔ اسے شام پانچ بجے تک وہاں پہنچنا تھا۔

میں نے اپنے کپڑے وغیرہ جھاڑے۔ جہاں مٹی کے سخت داغ تھے ان جگہوں کو گیلے رومال سے صاف کیا۔ ٹیوب ویل کے پانی سے منہ ہاتھ بھی دھویا اور اپنے بکھرے بالوں میں کنگھی کی، اس کے بعد میں انکل فیروز سے رخصت ہوکر پکی سڑک کی طرف چل دیا۔ اب میری طبیعت کچھ بدلی ہوئی تھی۔ فجر کے وقت تا دیر رونے کے بعد دل کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہونے لگا تھا۔ اب میں آگے...... اور آگے نکلنا چاہتا تھا۔

میں بذریعہ بس دن گیارہ بجے کے قریب ساہیوال ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ ایک چھوٹے سے ہوٹل سے بسکٹ اور چائے کا ناشتا کیا۔ کچھ بھی گلے سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ یہ سوچ کر آنکھیں پھر نم ہوگئیں کہ اگر اس وقت میں اپنے گھر میں ہوتا تو شاید عارفہ کے گھر والے اس کا ناشتا لے کر ہمارے گھر آئے ہوتے...... ہر طرف کھانوں کی خوشبو اور قہقہے بکھر رہے ہوتے۔

اسٹیشن پر گہما گہمی تھی۔ گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ میں انتظار گاہ سے باہر لکڑی کی ایک بینچ پر جا بیٹھا۔ دل میں پھر دھواں سا جمع ہونے لگا۔ میرے گھر میں کیا ہو رہا ہوگا؟ عارفہ پر کیا بیت رہی ہوگی؟ گھر والے مجھے کہاں کہاں تلاش کر رہے ہوں گے؟ لوگ کس طرح کی باتیں بنا رہے ہوں گے؟ دل چاہا کہ کسی جگہ سے، گھر ٹیلی فون کروں اور گھر والوں کو کم از کم اتنا بتا دوں کہ خیریت سے ہوں۔ والدہ کی صورت نگاہوں کے سامنے گھومی اور یہ خیال مزید پختہ ہونے لگا کہ مجھے کسی طرح گھر والوں کو اپنی خیریت کی اطلاع دے دینی چاہیے۔ میں کافی دیر وہیں بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی عملی قدم اٹھاتا، ایک بار پھر میرے اندر کی ساری بتیاں بجھ گئیں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ مجھے یوں لگا کہ وہی سفید کپڑوں والا ہیولا میرے پیچھے کہیں موجود ہے۔ جسے میں نے اپنی مہندی کی رات دیکھا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ بھی سفید کپڑے میں چھپا ہوا ہے۔ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ وہ مجھے ہرگز واپس نہیں جانے دے گا اور اگر میں جانے کی کوشش کروں گا تو وہ مجھے زبردستی روکے گا۔ شاید زخمی کر دے گا یا پھر مار دے گا۔

مجھے ایک جھرجھری سی آئی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور جو قرآنی سورتیں یاد تھیں، انہیں پڑھنے کی کوشش

کرنے لگا۔ اب میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ میرے گھر سے نکلنے میں دو عورتوں کی زہریلی گفتگو کو اتنا دخل نہیں ہے، جتنا اس سفید پوش ہیولے کو ہے۔ اگر میں ان دو عورتوں کی گفتگو نہ بھی سنتا تو شاید کوئی ایسی بات ہوجاتی جس کی وجہ سے مجھے اپنی دلہن کو چھوڑ کر آنا پڑتا۔ یہ سب کچھ ایک پہیلی کی طرح تھا اور اس کا کوئی پہلو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

پروگرام کے مطابق پانچ بجے سے پہلے ہی فیروز اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ وہ میرے لیے گھر سے آلو والے پراٹھے پکوا کر لایا تھا۔ ساتھ ہی دہی کی چٹنی تھی۔ اس نے بہت اصرار کر کے مجھے دو چار لقمے کھلائے۔ وہ ٹکٹ کے پیسے نہیں لینا چاہتا تھا لیکن میں نے زبردستی دیے۔ وہ دو ٹکٹ لے آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اپنے گھر والوں کو فون کیا؟ میں نے بس اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے بھی مجھے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

گاڑی قریباً دو گھنٹے لیٹ تھی۔ جب گاڑی کی آمد کا اعلان ہوا پلیٹ فارم پر کھلبلی سی مچ گئی۔ قلیوں کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ ہمارے پاس چونکہ برائے نام ہی سامان تھا اس لیے ہم اطمینان سے تھے۔ میں نے یونہی اپنے عقب میں دیکھا۔ ایک بار پھر مجھے یہی لگا جیسے سینے میں میرا دل رک گیا ہے۔ بھاگتے دوڑتے لوگوں کے پیچھے مجھے ایک بار پھر اسی سفید پوش کی جھلک نظر آئی تھی۔ یہ جھلک ایک سیکنڈ کے لیے تھی یا شاید اس سے بھی کم وقت کے لیے۔ میں آنکھیں پھاڑے اس سمت میں دیکھتا چلا گیا۔ فیروز نے میرا کندھا ہلایا۔ ”کیا بات ہے اشرف؟“

”کچھ...... نہیں۔“ میں نے گڑبڑا کر کہا اور ریلوے لائن کی طرف دیکھنے لگا جہاں دور ہماری گاڑی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ کیا میں واہموں کا شکار تھا؟ میری نظریں بار بار دھوکا کھا رہی تھیں؟ مجھے ایک ایسا منظر دکھا رہی تھیں، جس کا کوئی وجود نہیں تھا؟ نفسیات کی زبان میں اسے ”بصری دھوکا“ کہا جاتا ہے...... یعنی Optical illusion۔ ایسے بصری دھوکوں کا تعلق عموماً انسان کے اپنے اندر کی کیفیات سے ہوتا ہے۔

اسی دوران میں گاڑی پلیٹ فارم پر آ گئی۔ ہم اس میں سوار ہوگئے اور ساہیوال سے کوئٹہ کی طرف ہمارے سفر کا آغاز ہوگیا۔ میں گاڑی کی کھڑکی میں سے شمال کی طرف دیکھنے لگا...... شمال کی طرف لاہور تھا...... میرا گھر تھا...... میرے گھر والے تھے...... اور میری دلہن تھی۔ میں ان سب سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

تیسرے روز ہم کوئٹہ میں تھے۔ بلوچستان کا دارالحکومت، ایک خوب صورت شہر۔ یہاں موسم قدرے خنک تھا۔ انکل فیروز کو اب میں فیروز چاچا کہنے لگا تھا اور ایسا فیروز چاچا کی خواہش پر ہی ہوا تھا۔ فیروز چاچا کا خیال تھا کہ ”انکل“ کا لفظ کچھ بھاری بھاری ہے اور اس میں بیگانگی بھی پائی جاتی ہے۔ ان تین دنوں میں فیروز چاچا نے مجھے بہت سہارا دیا تھا۔ ان کے بہت اصرار کرنے پر میں نے انہیں اپنا اصل نام ہارون بتا دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ میرا تعلق ملتان سے نہیں بلکہ لاہور سے ہے لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بتایا تھا اور فیروز چاچا کی دانائی تھی کہ انہوں نے مزید کچھ جاننے پر زور بھی نہیں دیا تھا۔

کوئٹہ کے بارونق علاقے میں فیروز چاچا کا چھوٹا سا ہوٹل تھا لیکن ٹھیک ٹھاک چلتا تھا۔ رات بارہ بجے تک ہوٹل بند ہوجاتا تھا اور ہم اس کے اندر ہی سو جاتے تھے۔ یہ تیسرے روز کی بات ہے، ہم سونے سے پہلے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ فیروز چاچا نے میری گفتگو سے اندازہ لگالیا تھا کہ میں فی الحال پاکستان میں رہنا نہیں چاہتا اور میری خواہش ہے کہ کچھ عرصے کے لیے ایران چلا جاؤں۔ فیروز چاچا کو یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ میرے پاس معقول رقم موجود ہے جو ایران کے سفر میں میرے کام آسکتی ہے۔ فیروز چاچا نے کہا۔ ”ہارون! تم کسی اچھے گھر کے چشم و چراغ لگتے ہو اور پڑھے لکھے بھی ہو۔ میں تمہیں مشورہ دینے کے قابل تو نہیں ہوں پھر بھی ایک بڑے کی حیثیت سے اتنا ضرور کہوں گا کہ وطن...... وطن ہی ہوتا ہے۔ پردیس میں بہت دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ اپنی جان پر بڑا ظلم سہنا پڑتا ہے۔“

”میں نے سب سوچ لیا ہے چاچا...... اور بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔“

”گھر والوں کو جانے کی اطلاع ہے؟“

”میں نے بتایا ہے نا چاچا...... کہ ساہیوال سے ہی فون کر دیا تھا۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

فیروز چاچا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، اگر تم ارادہ کر ہی چکے ہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

کچھ دیر گفتگو کے بعد ہم سو گئے...... لیکن اگلے روز یہ ہوا کہ فیروز چاچا کی مدد لینے کے بجائے میں نے خود ہی ایرانی ویزے کے لیے کوشش شروع کر دی۔ پتا نہیں کیا

ہو رہا تھا میرے اندر۔ دل یہ چاہتا تھا کہ بس جلد از جلد پاکستان کی سرحدوں سے نکل جاؤں۔ پیچھے کا خیال کرتا تھا تو ایک دم میرے اندر کی ساری روشنیاں گل ہو جاتی تھیں۔ یہ اندر کا اندھیرا مجھے ڈراتا تھا اور اس اندھیرے میں ایک سفید پوش کا ہیولا چمکنے لگتا تھا۔

میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کیں۔ پتا چلا کہ ویزے کی درخواست کے لیے سب سے پہلے حفاظتی ٹیکے لگوانے پڑتے ہیں اور اس کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ میں مقررہ اسپتال گیا اور وہاں سے حفاظتی ٹیکے لگوائے۔ حفاظتی ٹیکے لگانے والا بلوچی نوجوان عابد میرے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ دس پندرہ منٹ کی گفتگو میں ہی ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ وہ ملنسار شخص تھا۔ ڈیوٹی کا ٹائم ختم ہوا تو وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے اسکوٹر پر بٹھا کر گھر لے گیا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے مجھے پرتکلف کھانا کھلایا اور ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے لاہور چھوڑنے کے بعد میرے اندر ایک خاص تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ ”مجھ سے ملنے والے“ مجھ سے ہمدردی اور لگاؤ محسوس کرتے ہیں۔ پہلے فیروز چاچا اور اب عابد بھائی بھی ایسے ہی رویّے کا اظہار کر رہے تھے۔ فیروز چاچا کی طرح میں نے عابد کو بھی یہی بتایا کہ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ والد سے جھگڑے کے بعد گھر چھوڑ آیا ہوں اور اب انہیں کچھ کر کے دکھانا چاہتا ہوں۔ میرے اندر کا دکھ میرے لہجے میں بولتا تھا اور سننے والے کو متاثر کرتا تھا۔

میں نے وہ رات عابد بھائی کے گھر ان کی بیٹھک میں ہی گزاری۔ صبح اس نے مجھے ڈبل روٹی، انڈے، بسکٹ اور چائے کا ناشتا کروایا اور اپنے ساتھ ہی اسکوٹر پر دفتر لے آیا۔ دس پندرہ منٹ کے اندر اس نے میرا ٹیکوں کے کورس والا سرٹیفکیٹ تیار کروا دیا۔

میں نے عابد کا شکریہ ادا کیا اور واپس فیروز چاچا کے ہوٹل پہنچ گیا۔ پاسپورٹ میرے پاس موجود تھا۔ سفر کے لیے معقول رقم بھی موجود تھی۔ مجھے امید تھی کہ ایران کے لیے میرا ویزا لگ جائے گا لیکن اگلے روز مجھے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں ایرانی قونصلیٹ پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ پنجاب میں رہائش رکھنے والوں کو ایرانی ویزا کوئٹہ سے نہیں اسلام آباد سے ملتا ہے۔

میں سخت پریشان ہوا۔ کسی بندے نے مشورہ دیا کہ فلاں افسر سے ملو شاید کام بن جائے۔ میں اس افسر کے دفتر کی طرف جانا چاہ رہا تھا جب ایک گارڈ نے مجھے روکا اور سخت کلامی کی۔ بڑا بدتمیز سا بندہ تھا۔ ایسے لوگوں کا دماغ ٹھکانے لگانا مجھے بڑی اچھی طرح آتا ہے۔ وہ اپنے تن و توش میں مجھ سے دوگنا کے قریب تھا لیکن مجھے پتا تھا کہ میں چند سیکنڈ میں اسے ناکوں چنے چبوا سکتا ہوں مگر میں اپنے شہر میں نہیں تھا۔ پردیسی تھا اور بدحال تھا۔ کسی بڑے جھگڑے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے اس خر دماغ گارڈ کی گالیاں بھی سن لیں اور دو چار دھکے بھی کھا لیے۔ اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔ ایک قریبی باغیچے میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور دیر تک آنسو بہاتا رہا۔ ایک بلوچی...... جو شاید میری ہی طرح یہاں کے عملے کا ستایا ہوا تھا، میرے قریب آ بیٹھا اور تسلی تشفی کی باتیں کیں۔

شام کے وقت میں فیروز چاچا کے ہوٹل واپس پہنچ گیا۔ چاچا کے ہوٹل میں میرا قیام و طعام بالکل مفت تھا۔ دلجوئی کی باتیں بھی سننے کو ملتی تھیں۔ سچ کہتے ہیں کہ دنیا میں برے لوگوں کی کمی نہیں تو اچھے لوگوں کی بھی کمی نہیں۔ میں نے وہ رات بے چینی کے عالم میں گزاری اور اگلے روز پھر عابد بھائی کے پاس اس کے دفتر میں جا پہنچا۔ میری توقع کے مطابق عابد بھائی بڑی خوش دلی سے ملا۔ چائے بسکٹ سے میری تواضع کی۔ میری کل کی کارکردگی کے بارے میں پوچھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اسے صورتِ حال بتائی۔ وہ بھی آزردہ ہو گیا۔ میرا کندھا تھپک کر بولا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کل میں تمہارے ساتھ قونصلیٹ جاؤں گا۔“

دفتر کا ٹائم ختم ہو گیا تو عابد مجھے اپنے گھر لے گیا۔ میری دلجوئی کی باتیں کرتا رہا۔ اچھا کھانا کھلایا۔ صبح ناشتے کے بعد وہ مجھے آٹو رکشا میں بٹھا کر ایرانی قونصلیٹ لے گیا...... جس خر دماغ سیکیورٹی گارڈ نے کل مجھ سے بدتمیزی کی تھی، وہ دور کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ بہرحال عابد بھائی کو میرے ساتھ دیکھ کر اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ مجھ سے کچھ کہتا یا مجھے روکنے کی کوشش کرتا۔ ہم دونوں برآمدے سے گزرتے ہوئے سیدھے ہائی کمشنر کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ہائی کمشنر خندہ پیشانی سے ملا۔ عابد کا حال احوال دریافت کیا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ عابد نے سب کچھ تفصیل سے بتایا۔ ہائی کمشنر چند لمحے غور سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر مسکراتے لہجے میں بولا۔ ”ٹھیک ہے، تمہیں ویزا دے دیتے ہیں۔“

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، بہ مشکل شکریے

کے الفاظ کہے۔

گھنٹی بجا کر ایک ملازم کو بلایا گیا۔ اس نے ویزا درخواست کا فارم اور قلم میرے سامنے رکھا اور شائستہ لہجے میں بولا۔ ''اسے پُر کردیجیے۔''

میں نے کانپتے ہاتھوں سے فارم بھرنا شروع کیا۔ اس وقت مجھے مزید حیرت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ ہائی کمشنر صاحب خود اٹھ کر میرے پاس چلے آئے اور میرے قریب کھڑے ہوکر فارم بھرنے میں میری مدد کی۔ اسی دوران میں باہر کھڑے سیکیورٹی گارڈ کو چائے لانے کا آرڈر بھی ہوچکا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہی خردماغ گارڈ میرے سامنے جھک کر چائے پیش کررہا تھا جس نے کل مجھ سے بدزبانی کی اور دھکے دیے تھے۔ میں چاہتا تو کمشنر صاحب سے شکایت کرسکتا تھا مگر میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

عابد بھائی کی کوشش رنگ لائی اور ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہی ایرانی ویزا میرے ہاتھ میں تھا۔ عابد بھائی کے لیے میری آنکھوں میں تشکر کے آنسو آگئے۔ بہ وقتِ رخصت میں نے باقاعدہ عابد بھائی کے ہاتھ چومے اور اس نے مجھے گلے سے لگایا...... ساتھ ہی صدقِ دل سے دعا کی کہ اللہ میری مصیبتیں آسان کرے اور مجھے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل ہو۔ وہ ایک بےلوث شخص تھا۔ میں اس کے بعد اس سے کبھی نہیں ملا لیکن وہ میرے ذہن میں نقش ان گنت یادوں میں سے ایک یاد کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔

میں فیروز چاچا کے ہوٹل کی طرف چل دیا۔ اپنی شادی کی رات کو لاہور چھوڑنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنے اندر تھوڑی سی خوشی محسوس کررہا تھا۔ یہ آگے کے سفر پر روانہ ہونے کی خوشی تھی مگر میں ان سنگین حالات اور واقعات سے بالکل بےخبر تھا جو مجھے آئندہ پیش آنے والے تھے۔ یہ واقعات میرے راستے میں شکاری جانوروں کی طرح گھات لگائے بیٹھے تھے اور میرا انتظار کررہے تھے۔

میں نے جب فیروز چاچا کو بتایا کہ مجھے ایرانی ویزا مل گیا ہے تو وہ بھی بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھے سفر کے بارے میں بےشمار ہدایات دیں (ماضی میں وہ بھی ایک دفعہ ایران کا سفر کرچکا تھا) فیروز چاچا نے مجھے نماز پڑھنے کی ہدایت بھی کی۔ اس نے کہا۔ ''اللہ اپنے بندوں پر مصیبتیں اسی لیے ڈالتا ہے کہ وہ اس کی طرف اپنا دھیان کریں اور جب بندہ دھیان کرلیتا ہے تو مصیبتیں دھند کی طرح چھٹنا شروع ہوجاتی ہیں۔''

فیروز چاچا کی ہدایات کے مطابق ضروری تھا کہ میں کل بس اڈے پر جاکر اپنا ٹکٹ بک کروالوں۔ رات ہوٹل میں گزارنے کے بعد میں صبح بس اڈے پہنچا اور تفتان بارڈر کے لیے ٹکٹ بک کروایا۔ یہیں سے میں نے ایک ایجنٹ کے ذریعے کچھ کرنسی بھی تبدیل کروائی۔ اب میرے پاس پاکستانی روپوں کے علاوہ ایرانی ''تومان'' بھی آگئے۔ بس کے ڈرائیور اسحاق سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس نے میرا قیمتی لباس اور چہرہ مہرہ دیکھ کر مجھے خصوصی اہمیت دی۔ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ نام وغیرہ پوچھا اور لاہور کا حال احوال دریافت کیا۔ مجھے صاف محسوس ہورہا تھا کہ مجھ سے ملنے والے اکثر افراد مجھ میں دلچسپی محسوس کرتے ہیں۔ مجھ سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کے دل میں میرے لیے ہمدردی بھی جاگتی ہے۔ بس ڈرائیور اسحاق سے ہونے والی گپ شپ بھی میرے لیے فائدہ مند رہی اور اس کا پتا مجھے اگلے روز چلا۔

اگلے روز فیروز چاچا اور دیگر لوگوں سے رخصت ہوکر اور فیروز چاچا کی ڈھیروں دعائیں لے کر میں بس اڈے کی طرف روانہ ہوگیا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ یہ بس کے روانہ ہونے کا ٹائم ہے اور میں آدھ پون گھنٹا لیٹ ہوچکا ہوں۔ رکشا پر سوار جب میں بس اسٹینڈ پر پہنچا تو ڈرائیور اسحاق دو تین دیگر سواریوں کے ساتھ کھڑا بےقراری سے میرا انتظار کررہا تھا۔ اسے مجھ پر غصہ تو تھا لیکن مجھے دیکھ کر اس نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائی اور بولا۔ ''ہارون! یار تم نے تو ہمارا بلڈ پریشر ایک دم آسمان کو لگا دیا ہے، کہاں رہ گیا تھا تم؟''

''میں...... بہت بہت معافی چاہتا ہوں اسحاق بھائی! بس سواری ملنے میں ذرا دیر ہوگئی۔''

''کوئی اور ہوتا تو پندرہ بیس منٹ پہلے یہاں سے نکل گیا ہوتا لیکن ام تمہارے لیے رکا رہا۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ اسحاق بھائی...... اور ان سب سواریوں کا بھی جنہیں میری وجہ سے اتنی زحمت ہوئی۔''

میں بس میں داخل ہوا، مجھے کہیں جگہ نظر نہیں آئی۔ میں نے رونی صورت بنالی۔ مجھے لگا کہ شاید اب گھنٹوں تک مجھے یونہی کھڑے ہوکر سفر کرنا پڑے گا۔ ڈرائیور اسحاق نے مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''گھبراؤ نہ یار! ام نے تمہارے لیے بالکل فرنٹ پر ایک سیٹ رکھا ہوا ہے۔''

میں نے شکر کی سانس لی اور فرنٹ پر بالکل اسحاق کے ساتھ جاکر بیٹھ گیا۔ میرے قیمتی لباس اور حلیے کی وجہ سے سب لوگ بڑے دھیان سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور کسی حد تک مرعوب بھی نظر آتے تھے۔ بس میں زیادہ تر

مسافر بلوچی ہی تھے۔ میلے کچیلے سندھی افراد کا ایک گروپ بھی نظر آرہا تھا۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ میں نے سب پر نظر دوڑائی اور یہی وقت تھا جب میری نظر پہلی بار اس پر پڑی۔ وہ سندھی عورتوں اور بچوں کے درمیان بیٹھی تھی، اس کی عمر اٹھارہ اور بیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ دبلی پتلی، تیکھے نقوش والی۔ وہ زیادہ خوب صورت بھی نہیں تھی لیکن اس کے چہرے میں کوئی کشش تھی جو دیکھنے والے کو چونکاتی تھی۔ اس کا رنگ دیگر سندھیوں سے قدرے صاف تھا اور چھوٹی سی ناک میں بڑی سی نتھ چمک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی ناک بہ مشکل نتھ کا بوجھ اٹھا رہی ہے۔ اس کے چہرے کی نمایاں خصوصیت اس کی چنچل آنکھیں تھیں۔ میں اس کی آنکھوں کی بس ایک جھلک ہی دیکھ سکا کیونکہ اس نے فوراً ہی اپنی بھاری اوڑھنی اپنے چہرے کے سامنے کرلی تھی اور رخ بھی ذرا سا پھیر لیا تھا۔

میری ذہنی کیفیت ایسی ہرگز نہیں تھی کہ میں کسی خوب صورت چہرے یا خوب صورت منظر کو دیکھ کر لطف اندوز ہوسکتا۔ میرے سینے میں تو ہر وقت ایک گاڑھا سیاہ دھواں بھرا رہتا تھا اور اردگرد کی کوئی شے بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔

جلد ہی بس چل پڑی اور میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ جوں جوں بس آگے بڑھتی گئی اردگرد کے مناظر بدلتے گئے۔ یہ مناظر میری توجہ کو کسی حد تک اپنی طرف کھینچنے لگے۔ یہ لق و دق صحرائے بلوچستان تھا۔ آبادیاں پیچھے رہ گئی تھیں اور اب میلوں تک کوئی شخص بھی دکھائی دیتا تھا اور نہ کسی آبادی کے آثار۔ بس سیاہ چٹانیں تھیں اور خشک بنجر پہاڑ تھے۔ بڑی دیر تک گاڑی چلتی رہتی تھی، تب کہیں جاکر کسی پہاڑ کی ڈھلوان پر کوئی کچی بستی دکھائی دیتی تھی۔ دھوپ میں جلتی ہوئی اور ریت سے ڈھکی ہوئی۔ نہ کہیں سبزے کا نشان نہ پانی کے آثار۔ بستی کے گھروں کو سفیدی مائل رنگ کیا جاتا تھا۔ سیاہ پہاڑوں کے پیشِ منظر میں یہ گاؤں نما بستیاں کچھ زیادہ ہی سفید دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد ہلکے صحرائی جھکڑ چلنے شروع ہوگئے۔ ریتیلی گردآلود ہوا بس کے شیشوں سے ٹکرانے لگی اور انہیں مزید دھندلا کرنے لگی۔

راستے میں پہاڑوں کے درمیان کہیں کہیں ایک ریلوے لائن کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ میرے پوچھنے پر ڈرائیور اسحاق نے بتایا۔ ''یہ زاہدان کو جانے والا لائن ہے۔''

میں نے اس سے پوچھا۔ ''اسحاق بھائی! یہ ہماری سڑک ایسے ہی تنگ رہے گی یا آگے جاکر کچھ اچھی بھی ہوجائے گی۔''

وہ ہنس کر بولا۔ ''حوصلہ پکا کرو بابو صاحب۔ آگے جاکر یہ اور خراب ہوگا۔''

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہمارا سفر مزید مشکل اور ہچکولے دار ہوتا چلا گیا۔ کبھی کبھی تو لگتا تھا کہ میں بس پر نہیں بلکہ اونٹ پر بیٹھا ہوں اور کسی پرانے دور کا مسافر ہوں۔

وزنی نتھ والی لڑکی کے قریب بیٹھے ایک بڑی عمر کے شخص نے میری طرف اشارہ کیا اور عاجزی کے لہجے میں بولا۔ ''بابو سائیں، کھڑکی پھر کھل گئی ہے، بند کرو۔''

میں نے کھڑکی بند کردی۔ یہ دوسری تیسری بار ہوا کہ میں نے کھڑکی بند کی تھی۔ بےدھیانی میں، میں کھڑکی پھر کھول دیتا تھا...... اور گرم ہوا اندر آنے لگتی تھی، کسی نہ کسی سواری کی درخواست پر مجھے کھڑکی بند کرنا پڑتی تھی۔

آدھ پون گھنٹے بعد پھر یہی ہوا۔ دھندلے شیشے کی وجہ سے مجھے ٹھیک سے نظر نہیں آرہا تھا۔ ویرانے میں اونٹوں کے ایک کارواں کو دیکھنے کے لیے میں نے کھڑکی تھوڑی سی کھولی۔ گردآلود ہوا اندر آگئی۔ اب پھر ایک سواری نے مجھے کھڑکی بند کرنے کے لیے کہا لیکن اس مرتبہ عاجزی کے لہجے میں درخواست نہیں کی گئی بلکہ بڑے سخت لہجے میں چلا کر کہا گیا۔ ''بند کرو...... بند کرو...... نان سینس۔''

مجھے ڈانٹنے والا ایک پچیس چھبیس سالہ شخص تھا۔ چہرہ لمبا، ناک اونچی اور آنکھوں میں غصہ بھرا ہوا تھا۔ وہ بھی سندھی لباس میں تھا اور لڑکی والی نشست کے عین پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اب تک کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی اور اب اگر بولا تھا تو اتنے درشت طریقے سے۔

میرا دماغ کھول گیا۔ میں نے کھڑکی بند تو کردی مگر گھوم کر اسے دیکھا اور کہا۔ ''یار! بات تو تمیز سے کرو۔''

''کیا بات؟...... کیا تمیز...... تم خبیث...... تم......'' اس کو آگے بات نہیں آئی اور وہ کسی نامعلوم زبان میں بڑی تیزی کے ساتھ بولنے لگا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں اپنی نشست سے اٹھا اور غصیلے انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ اس نے بھی فوراً سیل مرغ کی طرح سینہ پھلایا اور میری طرف آیا۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں بس کے اندر ہی ایک دوسرے سے بھڑ جاتے، دو تین افراد ہمارے درمیان آگئے۔ ڈرائیور اسحاق نے بھی بس سڑک کے کنارے روک دی اور بیچ بچاؤ کرانے لگا۔ وہ شخص میری توقع سے زیادہ آتش مزاج تھا۔ تاہم میں نے بھی اسے برابر کے جواب دیے۔ اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ کسی وقت یوں لگتا تھا کہ عربی

جیسی زبان بول رہا ہے۔ کسی وقت اس کی زبان پر سندھی کے لفظ آجاتے تھے۔

سواریوں نے ہم دونوں کو ٹھنڈا کر کے اپنی اپنی نشست پر بٹھایا اور دس پندرہ منٹ کی تاخیر سے بس پھر روانہ ہوئی۔

میرے ساتھ بیٹھا ہوا نوجوان پنجاب سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا نام سلیم تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہ سندھی کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”ان کے پاس سعودی عرب کے ویزے ہیں۔“

”سعودی عرب کے ویزے؟“ میں نے حیران ہو کر کہا۔ ”ان کی حالت تو سعودی عرب والی نہیں ہے۔“

سلیم مسکرایا۔ ”سنا ہے جی شاہ فیصل نے ہماری گورنمنٹ سے خاص رعایت کی ہے اور وہاں سعودی عرب میں ناجائز رہنے والے کئی لوگوں کو ویزے دے دیے ہیں۔ یہ لوگ بھی شاید ان میں سے ہیں۔“

اس دوران میں، میں نے دیکھا کہ اس شخص نے آگے کی طرف جھک کر نتھ والی چنچل لڑکی سے کوئی بات کی۔ لڑکی نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔ بہرحال لڑکی کا چہرہ مجھے نظر نہیں آیا کیونکہ وہ گھونگھٹ کے پیچھے تھا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ لمبے قد والے اس سخت گیر نوجوان کا تعلق اس لڑکی سے ہے۔ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ اس کا کیا لگتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ میرے ساتھ اس کے سخت رویّے کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ میں اس بس میں سب سے خوش لباس اور اچھے حلیے والا شخص تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے دو چار دفعہ بے دھیانی میں لڑکی کا چہرہ دیکھنے کی کوشش بھی کی تھی۔

میں نے سوچا کہ اب اس سلسلے میں محتاط رہوں گا اور کھڑکی بھی بند رکھوں گا۔ خوامخواہ ٹینشن پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

بس نے قریباً 100 کلومیٹر کا سفر طے کیا ہوگا جب ڈرائیور اسحاق نے اسے روک دیا اور مسافروں سے کہا کہ وہ کچھ کھا پی لیں۔ میں نے ویرانے میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، کہیں کوئی ہوٹل نام کی چیز نظر نہیں آئی۔ سواریاں ایک طرف چل پڑی تھیں۔ میں بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔ کچھ آگے گئے تو ایک منظر دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ ایک بہت بڑی چٹان کو کاٹ کر ہوٹل کی شکل دی گئی تھی۔ یہ ہوٹل اندازاً 300 فٹ گہرا اور 100 فٹ چوڑا ہوگا۔ اوپر بوسیدہ چھپر تھے۔ بڑے بڑے مٹکوں میں پانی رکھا تھا۔ یہاں بجلی وغیرہ کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ جہازی سائز کی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں، ان کے آگے لکڑی کی بڑی بڑی میزیں تھیں جن پر لالٹینیں رکھی ہوئی تھیں۔ چارپائیوں پر بڑی بڑی پگڑیوں والے دیونما لوگ بیٹھے تھے۔ کوئی قہوہ پی رہا تھا، کوئی چرس سے شغل کر رہا تھا۔ کوئی کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ میزوں پر ان کا اسلحہ وغیرہ بھی نظر آرہا تھا۔ شوخ آنکھوں والی لڑکی بھی دیگر افراد کے ساتھ ایک چارپائی پر موجود تھی۔ یہ لوگ کھانے کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ہوٹل کا ایک ملازم میرے پاس آیا۔ اس نے میلی سی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔

”کیا کھائے گا بابو جی؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”بس روٹی سالن لے آؤ۔“

چند منٹ بعد میرے سامنے ایک کشادہ سی پلیٹ رکھی تھی۔ اس میں اونٹ کے گوشت کی دو بڑی بڑی بوٹیاں تھیں اور شوربے کے اندر تین سالم آلو بھی نظر آرہے تھے۔ ساتھ میں خمیری روٹیاں تھیں۔ لاہور میں برگر اور چائنیز کھانے والے کے لیے یہ بڑا انوکھا کھانا تھا۔ بہرحال بھوک تھی اس لیے چاروناچار کھانے لگا۔ گوشت ذرا سخت تھا۔ ایک بوٹی کو دانتوں سے توڑنے کی کوشش کی تو وہ میرے ہاتھ سے نکل کر میز پر جا گری اور وہاں سے لڑھک کر زمین پر گر گئی۔

میرے کانوں سے ہنسی کی آواز ٹکرائی۔ جلترنگ جیسی یہ دبی دبی ہنسی انہی افراد کی طرف سے ابھری تھی۔ فوارے کی طرح بے ساختہ ابل پڑنے والی یہ ہنسی اسی شوخ چشم لڑکی کی تھی۔ میں نے چونک کر ادھر دیکھا تو وہ ایک بار پھر گھونگھٹ میں دکھائی دی۔ اونچی ناک والے دراز قد شخص نے لڑکی کو گھورا اور غصے میں کچھ کہا۔ لڑکی رخ پھیر کر بیٹھ گئی۔ دو دیگر عورتوں نے بھی رخ پھیر لیا۔

اس ہوٹل نما جگہ کا ماحول عجیب تھا۔ دیوہیکل انسان اور ان کے اسلحے کو دیکھ دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا۔ میرے قیمتی لباس کی وجہ سے یہ سب لوگ مجھے بڑے دھیان سے دیکھتے تھے۔ کھانا ختم کرتے ہی بس کی سواریاں وہاں سے نکل آئیں اور واپس بس میں آبیٹھیں۔ یہ قریباً ایک گھنٹے کا وقفہ تھا، بس دوبارہ چل پڑی۔

اس مرتبہ میں نے دیکھا کہ نتھ والی چنچل لڑکی کچھ پیچھے چلی گئی ہے۔ اس کا اونچی ناک والا کرخت ساتھی بھی اب ایک پچھلی نشست پر نظر آرہا تھا۔ نوجوان اور لڑکی کی شکل کچھ ملتی جلتی بھی لگتی تھی۔ وہ بہن بھائی ہو سکتے تھے اور قریبی کزن بھی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ لڑکی تو روانی سے سندھی

میں بات کرتی تھی لیکن نوجوان نے مجھ سے لڑتے وقت عربی جیسی زبان بولی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ بہت کم سندھی جانتا ہے۔

صبح آٹھ بجے روانہ ہونے والی بس سہ پہر چار بجے کے قریب نوکنڈی پہنچی۔ پاک ایران بارڈر یہاں سے قریباً پانچ میل دور تھا۔ ہمارے دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہو گئے۔ باوردی اہل کاروں نے کاغذات کی چیکنگ شروع کی۔ سندھی خواتین و حضرات کافی گھبرائے ہوئے تھے۔ اپنے حلیوں سے وہ بے چارے گداگر ہی لگتے تھے۔

میری باری آئی تو پہلے مکمل جامہ تلاشی لی گئی۔ پھر کرنسی کے بارے میں پوچھا گیا۔ میں نے کوئٹہ سے تقریباً 1000 پاکستانی روپوں کو ایرانی کرنسی میں تبدیل کروایا تھا، اس کے علاوہ قریباً 2000 روپیا پاکستانی کرنسی کی صورت میں میرے پاس تھا۔ ان دنوں یہ کافی بڑی رقم تھی۔ میں نے آفیسر سے کہا۔ ”میرے پاس پانچ سو پاکستانی روپے ہیں۔“

اس نے مجھے سرتاپا گھورا پھر مسکرا کر بولا۔ ”لگتا تو ایسا نہیں...... اگر اور پیسے ہیں تو بتا دیں۔ آپ جناب کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔“

اس کے خوشگوار رویّے سے مجھے حوصلہ ہوا اور میں نے جراب میں نیچے کی طرف رکھے ہوئے پانچ پانچ سو کے تین نوٹ اسے دکھا دیے۔ وہ ہنس کر چپ ہو گیا (ایرانی کرنسی ڈرافٹ کی صورت میں تھی)۔

اس دوران میں میری نظر نتھ والی دبلی پتلی لڑکی پر پڑی۔ وہ ہر وقت جیسے اپنے ہی حال میں مست رہتی تھی۔ اب بھی وہ چیکنگ وغیرہ کی پریشانی سے بے پروا صحن میں کھڑی تھی۔ ایک درخت پر بیر کی طرح کا چھوٹا چھوٹا سا پھل لگا ہوا تھا۔ وہ گھونگھٹ میں ہونے کے باوجود پنجوں کے بل کھڑی ہو ہو کر پھل اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اونچی ناک والے کرخت نوجوان نے قریب جا کر اسے منع کیا اور اپنے ساتھ لے کر برآمدے میں آگیا۔ چیکنگ سے فارغ ہو کر ہم سب پھر بس میں آبیٹھے اور بقایا پانچ میل کا فاصلہ طے کر کے پاک ایران بارڈر پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ ”تفتان“ کہلاتی ہے۔

اب شام ہونے والی تھی۔ سورج کا سرخ گولا دور مغربی افق کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ دن بھر کی گرمی کے بعد اب ٹھنڈی ریگستانی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شام کا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا۔ ہمیں آج کی رات اسی ریگستان میں کھلے آسمان کے نیچے گزارنا تھی۔ کسی موزوں جگہ کی تلاش میں ہم تھوڑی دیر ادھر ادھر گھومے۔ پھر ٹیلوں کے پیچھے ایک جگہ قیام کے لیے چن لی۔

بس کی تمام سواریاں تھکی ہاری تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد سب نے اپنی اپنی مرضی کی جگہ بستر وغیرہ بچھانے کے لیے چن لی۔ میرے پاس بستر تو کیا اوپر اوڑھنے کے لیے چادر تک نہیں تھی۔ ایک گلاس تک نہیں تھا کہ پانی ہی پی سکوں۔ بہرحال میرے لباس اور شکل و صورت کی وجہ سے بس کی اکثر سواریاں مجھے کوئی افسر قسم کی شے ہی سمجھ رہی تھیں...... اور کن انکھیوں سے مجھے دیکھتی تھیں۔ ایک ٹیلے کے پاس مجھے تھوڑی سی ہموار جگہ نظر آئی۔ میں نے اس جگہ کو کنکر وغیرہ سے صاف کیا۔ اپنے بوٹوں کے تسمے کھولے، انہیں تکیے کی طرح سر کے نیچے رکھا اور لیٹ گیا۔ اوپر تاریک آسمان تھا اور اس پر ہزارہا ستارے چمک رہے تھے۔ میں نے سوچا یہی آسمان سیکڑوں میل دور لاہور میں بھی دکھائی دے رہا ہوگا۔ یہی ستارے وہاں بھی چمک رہے ہوں گے۔ پتا نہیں، وہاں کیا حالات ہوں گے۔ مجھے کیسے کیسے یاد کیا جا رہا ہوگا اور تلاش کیا جا رہا ہوگا۔ پہلے اپنی والدہ کا تصور ذہن میں آیا، پھر اپنی نوبیاہتا بیوی کا اور آسمان کی طرح بے شمار ستارے میری آنکھوں میں جھلملانے لگے۔ رخساروں پر نمی رینگنے لگی۔ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ کیوں ہوا تھا یہ سب کچھ......؟ اور وہ سفید ہیولا؟ کیا وہ میرا وہم ہی تھا؟ یقیناً وہم ہی تھا لیکن یہ وہم اتنا طاقتور کیوں تھا؟ اور پھر وہ بے معنی الفاظ......؟

اچانک میں اپنے خیالوں سے چونک گیا۔ میرے سامنے کھڑی ناک والا وہی دراز قد نوجوان کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر خشک لہجے میں مجھ سے کچھ کہا۔ اس کی سندھی میں سے بس دو چار لفظ ہی میری سمجھ میں آئے...... ادھر...... عورتیں...... پردہ...... وہاں......

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے پھر سندھی میں کچھ کہا۔ سندھی کچھ کچھ میرے پلّے پڑ جاتی تھی کیونکہ میں کالج کے زمانے میں کچھ عرصہ سانگھڑ میں رہا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے یہاں سے ”بستر“ اٹھانے کے لیے کہہ رہا ہے...... اور کہہ رہا ہے کہ میں ٹیلے کی دوسری طرف چلا جاؤں کیونکہ یہاں میری نظر عورتوں پر پڑے گی۔

وہ بالکل نامناسب بات کر رہا تھا۔ مجھے قافلے سے الگ تھلگ سلانا چاہ رہا تھا۔ یہاں غیر مرد تو اور بھی موجود تھے۔ اس کا نزلہ مجھ پر ہی کیوں گر رہا تھا؟ اتنے میں سندھیوں میں سے گھنی داڑھی والا ایک اور شخص بھی آگیا۔ اس ادھیڑ

عمر شخص کا نام نور بخش تھا۔ اس نے کھڑی ناک والے نوجوان کو تلخ کلامی سے روکنا چاہا اور میری طرف سے بات کی لیکن وہ سنی ان سنی کر کے میرے لیے یہاں سے اٹھنے کا حکم جاری کرتا رہا۔ بات بڑھ گئی۔ جب کھڑی ناک والے نے میرے بوٹ اٹھا کر دور پھینکنا چاہے تو میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ وہ تو جیسے پہلے ہی لڑنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے مجھے زور سے دھکا دیا۔ اب میرے لیے بھی خود کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ تیموری خون نے میرے اندر جوش مارا۔ میں نے سر جھکا کر اس کی کمر کو اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑا اور پوری طاقت سے دھکیلتا چلا گیا۔ وہ قد میں مجھ سے لمبا تھا اور جسم بھی اچھا خاصا تھا لیکن میں نے اس کے قدم جمنے نہیں دیے۔ میں اسے بیس پچیس قدم پیچھے لے گیا۔ ہم عورتوں اور ان کے سامان کے اوپر گرے۔ برتن بکھرتے نظر آئے اور پانی والے چھوٹے مٹکے ٹوٹ گئے۔ عورتیں چلاتی ہوئی ادھر ادھر بھاگیں۔ میں نے کھڑی ناک والے کے چہرے پر کئی زوردار مکے رسید کیے۔ میری طلائی انگوٹھی نے اس کا چہرہ چھیل کر رکھ دیا۔ اس نے مجھے ٹانگوں کی دھکیل سے دور پھینکا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی لاٹھی آ گئی تھی۔ یہ چھوٹی لیکن وزنی لاٹھی تھی۔ اس پر لوہے کے موٹے چھلے سے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ لاٹھی سونت کر دیوانہ وار میری طرف لپکا۔ میں اس وقت تک کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ میرے سر پر وار کیا۔ میں آج بھی یاد کرتا ہوں تو لرز جاتا ہوں۔ وہ اتنا شدید وار تھا کہ اگر مجھے لگ جاتا تو میرا تہلکہ خیز سفر وہیں ختم ہو جاتا...... اور آج میں آپ کو یہ روداد سنانے کے لیے زندہ نہیں ہوتا۔ مجھے نہیں معلوم، میں نے کس طرح خود کو اس وار سے بچایا۔ ہاں یہ پتا مجھے چل گیا کہ میں نے اس شخص کو دوسرا وار کرنے کا موقع نہیں دینا، کیونکہ اگر اسے دوسرا موقع مل گیا تو وہ ضرور میری کھوپڑی توڑ ڈالے گا۔ میرے کانوں میں مرد و زن کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نیچے جھکا اور طوفانی رفتار سے اپنے سر کی ٹکر اس غضب ناک شخص کے سینے پر رسید کی۔ وہ وار کرنے کے لیے لاٹھی اٹھا چکا تھا۔ بھرپور ٹکر نے اسے آٹھ دس قدم پیچھے ہٹا دیا لیکن مسئلہ اب بھی وہی تھا۔ میں نہتا تھا اور آہنی چھلوں والی خطرناک لاٹھی اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی مگر پھر قدرت نے کرشمہ دکھایا۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص پھر میری طرف آتا یا کسی بھی طرح میری ضرب کا جواب دیتا...... ایک دم کھٹکے کی زوردار آواز آئی۔ جیسے لوہا لوہے سے ٹکرایا ہو، اس کے ساتھ ہی کافی ساری ریت میرے حریف کے پاؤں کے پاس سے اچھلی۔ وہ الٹ کر گرا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

پہلے تو کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا ہے، پھر اللہ داد تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب جھک کر اس کا پاؤں دیکھنے لگا، اس کا پاؤں جیسے کسی نے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ تین چار دیگر افراد بھی میرے حریف کی طرف بڑھے۔

''کیا ہوا میڈے سائیں۔'' اللہ داد نے چلا کر پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بس کراہ رہا تھا اور بل کھا رہا تھا۔ ایک شخص نے لالٹین اونچی کی اور تب مجھے بھی پتا چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ یہ لوہے اور لکڑی کا بنا ہوا ایک زنگ آلود پھندا تھا...... جو نہ جانے کب سے ریتیلی مٹی میں دبا ہوا تھا۔ شاید کبھی کسی شکاری نے کسی جانور کے لیے یہ پھندا لگایا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ پھندے کی جگہ بھول گیا ہو، یا کوئی اور وجہ ہوگئی ہو۔ آج اتفاقاً میرے دراز قد حریف کا پاؤں اس پھندے میں جکڑا گیا تھا اور وہ اس جکڑن کی تکلیف سے تڑپنے لگا تھا۔ چند لمحے بعد میں بھی لڑائی کی گرما گرمی بھول کر موقع پر پہنچ گیا۔ میرے دراز قد حریف کے ہاتھوں سے وزنی لاٹھی چھوٹ چکی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پنڈلی دبائی ہوئی تھی اور کراہ رہا تھا۔ اس کی پنڈلی پر خون کی لالی بھی دکھائی دیتی تھی۔ یقیناً وہ ایک سخت جان شخص تھا۔ کوئی اور ہوتا تو کراہنے کے بجائے چلا رہا ہوتا۔ اس پھندے میں ایک طاقتور اسپرنگ تھا۔ وزن پڑنے کے بعد وہ پورے زور سے کھلا تھا اور لوہے کی دو قوسوں نے اس شخص کی پنڈلی، ٹخنے کے اوپر سے بری طرح جکڑ لی تھی۔ ایک قوس تو اس کی پنڈلی کے اندر دھنس گئی تھی اور شاید ہڈی تک جا پہنچی تھی۔ یہ پھندا ایک زنگ آلود زنجیر کے ذریعے ایک پتھر کے ساتھ اٹیچ تھا۔ پھندے کی طرح یہ زنجیر بھی ریت میں دبی ہوئی تھی۔

اگلے دس پندرہ منٹ دراز قد شخص کے لیے بڑے اذیت ناک تھے۔ پھندا چونکہ پرانا ہو چکا تھا اس لیے کھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ دو تین افراد مل کر جب پھندا کھولنے کے لیے زور لگاتے تو دراز قد شخص کا حال اور برا ہو جاتا تھا۔ لالٹینوں کی روشنی میں اس کی پیشانی پسینے سے تر نظر آ رہی تھی۔

میرا ذہن ہمیشہ سے کچھ ٹیکنیکل رہا ہے، میرے بڑے بھائی جان ٹی ٹرالیز بنانے والا ایک بڑا کارخانہ چلاتے تھے۔ مجھے بھی مینوفیکچرنگ کی کافی سمجھ بوجھ تھی۔

میری یہ سمجھ بوجھ اس ویرانے میں اس پھنسے ہوئے شخص کے لیے کام آئی۔ میں نے غور کیا تو اندازہ لگا لیا کہ یہ شکنجہ زور لگانے سے نہیں کھلے گا بلکہ پنڈلی کی ہڈی ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اگر کسی طرح شکنجے کے اسپرنگ کو ایک طرف سے نکال دیا جاتا تو وہ بے پناہ دباؤ ختم ہو سکتا تھا جو اسپرنگ کھلنے کی وجہ سے پنڈلی پر آیا ہوا تھا۔

میں نے وزنی نتھ والی چنچل لڑکی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ ان پریشان کن لمحوں میں وہ اپنا لمبا گھونگھٹ بھی بھول چکی تھی۔ میں نے ادھیڑ عمر اللہ داد سے کہا۔ ''چاچا! تمہارے سامان میں کوئی پیچ کش وغیرہ ہوگا؟''

ایک دوسرا شخص بولا۔ ''ہاں سائیں، مینڈے پاس ہے پیچ کش۔''

وہ دوڑ کر گیا اور لکڑی کے دستے والا ایک چھوٹا سا پیچ کش لے آیا۔ میں لالٹینوں کی روشنی میں شکنجے کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔ دراز قد شخص کا خون بہہ بہہ کر ریت میں جذب ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا، وہ بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ طاقتور اسپرنگ کے ایک سرے کو اسٹیل کی ایک موٹی پن کے ذریعے لاک کیا گیا ہے۔ یہ پن سوراخ میں سے نکل جاتی تو اسپرنگ کا ایک سرا آزاد ہو جاتا اور اسپرنگ کھینچنے سے باہر نکل آتا۔ میں نے ہتھوڑی کا کام ایک گول پتھر سے لیا۔ پیچ کش کے سرے کو سوراخ میں ڈال کر تین چار ہلکی چوٹیں لگائیں تو لوہے کی پن باہر نکل آئی۔ جو کام بے پناہ زور لگانے کے باوجود نہیں ہو سکا تھا، وہ ایک پن نکل جانے سے ہو گیا۔ اسپرنگ باہر آ گیا اور اس کے ساتھ ہی دراز قد شخص کا لہولہان پاؤں شکنجے میں سے نکل آیا۔

سب نے سکھ کی سانس لی۔ اللہ داد اور دیگر عمر رسیدہ افراد نے مجھے باقاعدہ شاباش دی۔ دراز قد شخص کا نام مجھے جعفر معلوم ہوا۔ وہ اب لڑنے کے قابل کہاں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی زخمی پنڈلی دبا رکھی تھی اور کراہتا چلا جا رہا تھا۔

میں وہاں سے اٹھ کر فاصلے پر چلا گیا۔ عمر رسیدہ سندھی افراد میں سے ایک مفلوک الحال شخص کا نام نور بخش تھا۔ یہ بندہ دیسی طریقۂ علاج جانتا تھا۔ اس کے پاس مرہم پٹی کا برا بھلا سامان بھی موجود تھا۔ اس ویرانے میں زخمی جعفر کے لیے اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔ نور بخش نے اس کا خون بند کرنے کی کوشش کی۔ خون کا رساؤ کم ہو گیا تو اس کے زخم پر اچھی طرح پٹی باندھ دی گئی۔ باقی سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر ساکت و جامد بیٹھ گئے۔ سب کے ذہن میں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں ارد گرد ایسا کوئی اور پھندا موجود نہ ہو۔

☆☆☆

اگلا دن بڑا اہم تھا۔ ایرانی اہلکاروں نے ہمارے کاغذات وغیرہ چیک کرنا تھے اور ہمیں ایران میں داخلے کی اجازت ملنا تھی۔ بس کی بیشتر سواریوں کی حالت گداگروں جیسی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان لوگوں کو ایران میں ''انٹری'' مل جائے گی۔ میں اپنے بارے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ سب نے برا بھلا ناشتا کیا اور دھڑکتے دلوں کے ساتھ بارڈر کی طرف چل دیے۔ دراز قد جعفر کے پاؤں پر بھاری بھرکم پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ دو سندھی افراد کے سہارے چل رہا تھا۔ اس نے ابھی تک مجھ سے نظر نہیں ملائی تھی۔ اس کے لمبوترے چہرے پر کدورت کے آثار تھے۔ حالانکہ رات کو جو کچھ بھی ہوا، اس میں سراسر اسی کا قصور تھا۔ باقی سب لوگ مجھ سے بہت زیادہ مرعوب نظر آنے لگے تھے۔

بارڈر پر پہنچے تو وہاں ایرانی بارڈر پولیس کے اہلکار تو نظر آئے لیکن کوئی افسر قسم کا شخص دکھائی نہیں دیا۔ ہمیں روکھے لہجے میں انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ ہم وہیں ایک طرف گھاس پر بیٹھ گئے۔ کچھ لوگوں نے اپنے سامان کے اوپر بیٹھنا مناسب سمجھا۔ جعفر کا چہرہ بری طرح تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں سرخی سی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا پاؤں کی سوجن کی وجہ سے اسے تیز بخار بھی ہو گیا تھا۔

قریباً دو ڈھائی گھنٹے کے مشکل انتظار کے بعد ہمیں ایک ایرانی افسر کی صورت نظر آئی۔ اس نے اشاروں کنائیوں اور ٹوٹی پھوٹی انگلش میں ہمیں بتایا کہ ان کے بارڈر انسپکٹر کو حادثہ پیش آ گیا ہے۔ وہ بولا۔ ''یہ بات کلیئر ہے کہ جب تک تم لوگوں کے کاغذات چیک نہیں ہوتے، تم ایران میں داخل نہیں ہو سکتے اس لیے صبر سے انتظار کرو۔''

میں نے مترجم کے فرائض انجام دیتے ہوئے ایرانی افسر کی یہ بات بس کی دیگر سواریوں تک پہنچائی۔ سب کے چہرے لٹک گئے۔ جعفر بھی غصیلے انداز میں بڑبڑا رہا تھا۔

بس کی تقریباً تمام سواریوں نے ایک طرح سے مجھے اپنا لیڈر بنا لیا تھا۔ یہ وہی اندھوں میں کانا راجا والی بات تھی۔ وہ سب میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ مدقوق چہرے والے ایک دیہاتی نے بڑی مایوسی سے کہا۔ ''بابو جی! آپ پڑھے لکھے ہیں، ان سے بات کریں۔ اگر ہم آج یہاں سے نہ نکل سکے تو کسی اور مصیبت میں پڑ جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ”میں کیا بات کروں، میں بھی آپ لوگوں کی طرح انجان ہی ہوں۔“

عورتیں اور بچے بھی پریشان نظر آرہے تھے۔ گرمی اور پیاس علیحدہ پریشان کررہی تھی۔ بس کی ساری سواریاں بلند آواز میں باتیں کررہی تھیں۔ پھر کچھ لوگ احتجاجی انداز میں شور مچانے لگے۔ اب دوپہر کے بارہ بج چکے تھے۔ شور بڑھا تو ایرانی اہلکاروں میں سے ایک سینئر بندہ باہر آیا۔ اس نے وردی پہنی ہوئی تھی اور اس کی پیشانی کافی چوڑی تھی۔ اس نے قدرے نرم لہجے میں مجھ سے بات چیت شروع کردی۔ اس نے انگریزی میں کہا۔ ”مجھے اردو وغیرہ بالکل نہیں آتی۔ میں کیسے آپ لوگوں سے سوال جواب کرسکتا ہوں۔ مجھ سے پاسپورٹ بھی چیک نہیں ہوں گے۔“

پھر اچانک جیسے اس کے ذہن میں خیال آیا۔ مجھے سرتاپا دیکھ کر بولا۔ ”اگر آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں اور پاسپورٹوں کا اندراج رجسٹر میں کردیں تو کام آسان ہوسکتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں یہ کرسکتا ہوں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

اس شخص نے مجھے ساتھ لیا اور بارڈر انسپکٹر کے سجے سجائے ٹھنڈے دفتر میں پہنچ گیا۔ بس کی سواریاں گرتی پڑتی ہمارے پیچھے آرہی تھیں۔ اس شخص نے مجھے کچھ ضروری ہدایات دے کر ایک بڑی میز کے سامنے ایک لگژری کرسی پر بٹھادیا اور میں نے مسافروں کے پاسپورٹ چیک کرنے شروع کردیے۔ میں سوٹڈ بوٹڈ تھا، کرسی پر بیٹھ کر مجھے لگا جیسے واقعی کوئی افسر ہوں۔ اپنے اس خیال پر میں خود ہی ہنس دیا۔ صرف چار دن پہلے ایرانی دفتر کے ایک معمولی گارڈ نے مجھے گالیوں سے نوازا تھا اور باقاعدہ دھکے دیے تھے۔

اگلے دو گھنٹے میرے لیے کافی کٹھن تھے۔ پٹھانوں اور سندھی بھائیوں کے نام خاصے مشکل اور گنجلک تھے۔ خاص طور سے خواتین کے نام۔ ان کا اندراج رجسٹر پر کرنا میرے لیے کافی مشکل ثابت ہورہا تھا۔ مجھے ہر مسافر سے دو چار سوال بھی کرنا پڑرہے تھے۔ جعفر تو زخمی ہونے کی وجہ سے باہر ہی بیٹھا رہا۔ بہرحال اس کی ساتھی لڑکی کو اندر میرے سامنے آنا پڑا۔ میں کچھ اور بھی اکڑ کر بیٹھ گیا۔ لڑکی اندر آئی۔ وہ واضح طور پر ڈری سہمی ہوئی تھی۔ میں نے ذرا رعب سے اس کا نام پوچھا۔ ”تمہارا نام؟“

”مہرالنساء ...... سائیں۔“

”یہ سائیں کیا ہے۔ صرف اپنا نام بتاؤ۔“

”مہرالنساء ...... جی۔ گھر میں مہرو کہتے ہیں۔“

”والد کا نام؟“

”غلام نبی...... جی۔“ وہ ذرا جھجک کر بولی۔

”والدہ کا نام؟“

”حبیبہ مائی۔“

”یہ پاسپورٹ پر فوٹو تمہاری ہے؟“

”ہاں جی۔“

”اپنا چہرہ دکھاؤ۔“ میں نے رعب سے کہا۔ حالانکہ چہرہ میں نے دیکھا ہوا تھا۔

وہ چپ ہوگئی۔ پھر لرزاں لہجے میں بولی۔ ”سائیں...... میں پردہ کرتی ہوں۔“

میں بھی اسے ستانے پر تلا ہوا تھا۔ ویسے یہ ضرورت بھی تھی کہ اس کی شکل دیکھی جاتی۔ میں نے کہا۔ ”چہرہ نہیں دکھاؤ گی تو کارروائی کیسے پوری ہوگی؟ چلو، اٹھاؤ یہ گھونگھٹ۔“

اس نے بے بسی سے دائیں بائیں دیکھا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ کچھ دیر تک شدید تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے لرزتے ہاتھ سے گھونگھٹ تھوڑا سا ہٹایا۔ چنچل آنکھوں میں فی الحال شوخی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔ چھوٹی سی نازک ناک میں چاندی کی وزنی نتھ ظلم ڈھا رہی تھی۔ عام شکل وصورت کے باوجود اس میں کشش تھی۔ میں اسے زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ”ٹھیک ہے۔“ میں نے بھاری آواز میں کہا۔

اس نے گھونگھٹ دوبارہ نکال لیا۔

میں نے رجسٹر میں اس کا پاسپورٹ نمبر درج کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ جعفر تمہارا کیا لگتا ہے؟“

”وہ جی...... وہ جی...... بابو سائیں......“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے پاتی، ایرانی افسر اندر آگیا۔ اس نے مجھے جلدی جلدی کام نمٹانے کو کہا اور میرے اب تک کے کام کو چیک کرنے لگا۔ مہرو کا اندراج ہوچکا تھا۔ وہ باہر چلی گئی اور اس کی جگہ ایک اور عورت اندراج کے لیے آگئی۔

یہ کام مکمل ہوتے ہوتے قریباً ڈھائی بج گئے۔ ایرانی افسر نے خوش خلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے لیے لنچ منگوایا۔ ایرانی طرز کی بریانی اور روسٹ چکن تھا۔ ساتھ میں خوشبودار قہوہ۔ مجھے اے سی والے ٹھنڈے دفتر میں بیٹھ کر لنچ کرنا اچھا لگا۔

کچھ دیر بعد جب میں باہر نکلا تو پھر وہی گرمی تھی اور وہی پھٹے پرانے کپڑوں والے میرے مسافر ساتھی۔ بچے

ریں ریں کررہے تھے اور مائیں انہیں جھڑکیاں دینے میں مصروف تھیں۔ مجھے لگا جیسے میں یورپ کے کسی ترقی یافتہ ملک سے نکل کر اچانک تیسری دنیا کے کسی مصیبت زدہ ملک میں آگیا ہوں۔

ہم ایرانی علاقے میں داخل ہوئے اور کچھ دور تک پیدل چلے۔ یہاں ماحول بدلا ہوا تھا اور صفائی ستھرائی نظر آتی تھی۔ ہمیں لے کر جانے والی بس سامنے ہی کھڑی تھی۔ یہ جرمنی کی بنی ہوئی شاندار بس تھی اور ان دنوں دنیا کی بہترین بسوں میں شمار ہوتی تھی۔ میرے ساتھیوں نے مجھے عزت بخشتے ہوئے فرنٹ سیٹ پر جگہ دی۔ جعفر بھی دو افراد کے سہارے لنگڑاتا ہوا بس میں آبیٹھا۔ بھاری نتھ والی مہرو بھی اس کے ساتھ تھی۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ اس کے علاوہ مجھے ایک اور بات بھی عجیب لگی تھی۔ مہرو نے اپنی والدہ کا نام ”حبیبہ“ لکھوایا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اندرون سندھ عورتوں کے ایسے نام نہیں ہوتے، خاص طور سے پرانی عورتوں کے۔ کیا ”حبیبہ“ کا تعلق سندھ سے نہیں تھا؟ جعفر کو سندھی کیوں نہیں آتی تھی؟ کیا جعفر اور مہرو قریبی رشتے دار تھے؟ ایسے ہی کئی سوال میرے ذہن میں چکراتے رہے اور ہماری لگژری بس ایرانی شہر زاہدان کی طرف محوِ سفر رہی۔

جعفر کے چہرے پر میرے لیے اب بھی بیگانگی اور کدورت کے آثار تھے۔ وہ اور مہرو اس دفعہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے جعفر کی پیشانی پر گاہے بگاہے بل پڑ جاتے تھے۔ اس نے اپنا زخمی پاؤں اٹھا کر نشست پر رکھ لیا۔ میں نے دیکھا کہ مہرو نے اپنی بھاری اوڑھنی کے اندر سے اپنا نازک ہاتھ نکالا اور آہستہ آہستہ جعفر کی پنڈلی دبانے لگی۔ وہ جب سے زخمی ہوا تھا، وہ اس کا خاص خیال رکھ رہی تھی۔

میرا تجسس اب کافی بڑھ چکا تھا۔ میرے ساتھ والی نشست پر رحیم یار خان کا ایک غریب صورت نوجوان امین بیٹھا تھا۔ وہ بھی روزگار کے سلسلے میں قسمت آزمانے کے لیے کویت کی طرف جانا چاہ رہا تھا۔ کوئٹہ میں وہ سندھی افراد کے ساتھ ہی بس میں سوار ہوا تھا۔ میں نے امین سے پوچھا۔ ”یہ جو لڑکی ہے لال اوڑھنی والی، یہ کیا لگتی ہے جعفر کی؟“

”یہ بہن ہے جی اس کی۔“ امین نے کہا۔ ”یہ اسے اپنے ساتھ عراق لے کر جارہا ہے۔ یہ وہیں عراق میں ہی رہتا ہے نا۔ شاید بغداد میں۔“

”لیکن...... لیکن لڑکی تو سندھی ہے اور یہ جعفر شاید عربی بول رہا تھا۔“

”مجھے اس بارے میں زیادہ پتا تو نہیں ہے جی۔ میرا خیال ہے کہ یہ جعفر صیب عراق میں پلا بڑھا ہے جبکہ یہ لڑکی یہاں نواب شاہ میں رہی ہے اپنی دادی کے پاس۔ باپ شاید فوت ہوچکا ہے۔“

میرا تجسس ان دونوں کے بارے میں کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ بہرحال امین کو اس بارے میں اس سے زیادہ معلوم نہیں تھا۔

بس صاف ستھری سڑکوں پر رواں دواں رہی اور میرا ذہن بھی مختلف سمتوں میں بھاگتا رہا۔ پچھلے چند دنوں میں جو کچھ ہوا وہ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ اپنی مہندی کی رات میں نے غنودگی کی حالت میں اپنے سامنے ایک سفید ہیولا دیکھا۔ اس نے چند ناقابلِ فہم الفاظ کہے...... کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی...... اور پھر شادی کی رات میں نے دو عورتوں کا مکالمہ سنا۔ وہ قنات کے پیچھے بیٹھی بول رہی تھیں۔ ان عورتوں کے الفاظ نے میرے اندر کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ کیا وہ اتنی ہی بڑی بات تھی کہ اس کے نتائج اتنے برے نکلتے؟ کبھی کبھی میرے ذہن میں ایک عجیب خیال آتا تھا۔ میں سوچتا تھا...... کیا وہ عورتیں وہاں موجود بھی تھیں یا نہیں؟ کہیں وہ میرا واہمہ ہی تو نہیں تھا۔ بصری واہمے کی طرح سماعتی واہمہ یعنی Audio Illusion

اچانک میں اپنے سنسنی خیز خیالات سے چونک پڑا۔ ایک شخص بڑے غصے سے چلایا تھا۔ یہ شخص بس کے تین چار ایرانی مسافروں میں سے ایک تھا۔ دراصل سندھی افراد کے گروہ میں سے ایک چھوٹے بچے نے ایرانی کا بوٹ گندا کردیا تھا۔ بچے کا شاید پیٹ خراب تھا۔ اس نے بس کے فرش پر ہی اپنی حاجت پوری کرلی تھی۔ اب ایرانی کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ وہ غصے سے سرخ ہوکر تابڑتوڑ فارسی بول رہا تھا۔ بچے کے مفلوک الحال والدین لرزہ براندام تھے، ایک مرد نے اپنی چادر سے ایرانی کا بوٹ صاف کیا مگر اس کا غصہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ ہم سب پاکستانی خود کو خجل محسوس کررہے تھے...... اور کسی حد تک سہم بھی گئے تھے۔ آدھ پون گھنٹا بولنے کے بعد ہی ایرانی کا ٹمپریچر کسی حد تک کم ہوا۔

باقی کا سفر گہری خاموشی اور تناؤ کی کیفیت میں گزرا۔ خدا خدا کرکے زاہدان کے مضافات نظر آنے شروع ہوئے۔ زاہدان ایران کے اچھے اور خوب صورت شہروں

میں سے ایک ہے۔ یہاں کے باشندوں میں سکھ بھی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ شہر کا نام زاہدان بھی سکھوں کی وجہ سے ہی پڑا۔ ان کی لمبی لمبی ڈاڑھیاں دیکھ کر باہر سے آنے والے لوگوں نے سمجھا کہ یہ متقی و پرہیزگار مسلمانوں کا شہر ہے۔ اس لیے اسے زاہدان یعنی زاہدوں کے رہنے کی جگہ کہا جانے لگا۔

بس ایک خوب صورت اسٹینڈ پر رکی۔ شہر کی شان وشوکت دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ شیشے کی طرح صاف شفاف سڑکیں، بلند عمارتیں، باغیچے۔ صفائی ایسی کہ بس دیکھتے ہی رہ جائیں۔ ہم آہستہ آہستہ بس سے اترے۔ زاہدان کی خوشبودار، ٹھنڈی ہوا نے استقبال کیا۔ زخمی جعفر بھی اپنی بہن اور ایک دوسرے شخص کے سہارے بہ مشکل بس سے اترا۔ ایک بار دل چاہا کہ اس سے دو چار الوداعی کلمات کہوں لیکن پھر اس کا سوجا ہوا تھوبڑا دیکھ کر ارادہ ملتوی کردیا۔ ویسے بھی اب میں تنہائی اور سکون کی ضرورت محسوس کررہا تھا۔

میرے پاس سامان نہ ہونے کے برابر تھا۔ بس ایک شاپر سا تھا جس میں میں نے پانی کی دو تین بوتلیں اور کھانے پینے کی اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔ ذرا آگے جا کے مڑ کر دیکھا تو حیرت ہوئی۔ سندھی مسافروں کا گروہ میرے پیچھے آرہا تھا۔ جیسے انہوں نے مجھے مستقل طور پر اپنا راہنما تصور کرلیا ہو اور اب میرے نقشِ قدم پر چلنا چاہتے ہوں۔ مجھے الجھن محسوس ہوئی۔ میں تو خود ''راہ گم کردہ'' مسافر تھا۔ میرے اندر اتنی اہلیت کہاں تھی کہ کسی معاملے میں ان لوگوں کی راہنمائی یا مدد کرسکتا۔ میں رک گیا۔

''کیا بات ہے بزرگو؟'' میں نے اللہ داد سے پوچھا۔

وہ عاجزی سے بولا۔ ''بابو سائیں! تم پڑھے لکھے ہو، بات کرسکتے ہو۔ رہنے کے لیے جو جگہ تمہیں ٹھیک اور چنگی لگے گی، وہاں ہم بھی رہ لیں گے۔ کوئی سستا سا سرائے مل جائے تو سب کے لیے ٹھیک رہے گا۔''

میں نے ذرا بیزاری سے کہا۔ ''چاچا! ابھی میرا، کسی سرائے میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ لوگوں نے جو کرنا ہے اپنے طور پر کرلیں اور یہ جعفر بھی تو ہے تمہارے ساتھ۔ یہ تو تھوڑی بہت یہاں کی زبان بھی جانتا ہوگا۔''

''اس کو تو اپنی پڑی ہوئی ہے بابو سائیں۔ آپ ہی کچھ مدد کرو نا......''

ابھی ہم بات ہی کررہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ یہ واقعہ آج تک پوری تفصیل کے ساتھ میرے ذہن پر نقش ہے۔ میں اس کو اپنے لیے ایک شرم ناک واقعہ ہی کہوں گا۔ ان لمحوں میں جو ذلت میں نے اپنے لیے اور دیگر ساتھیوں کے لیے محسوس کی، وہ تاحیات یاد رہے گی۔ ہوا یوں کہ جب ہم وہاں کھڑے باتیں کررہے تھے قریب ہی ایک ایرانی اسکول میں چھٹی کی گھنٹی بج رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں بچے اسکول سے باہر سڑک پر نظر آنے لگے۔ یہ سب لڑکے تھے۔ ان کی عمریں چھ سات سال سے لے کر چودہ پندرہ سال تک تھیں۔ جب یہ بچے اسکول سے باہر آئے، مسافروں میں سے ایک بوڑھا ایک درخت کی اوٹ میں بیٹھ کر پیشاب کررہا تھا۔ پتا نہیں ان بچوں کے ذہن میں کیا بات آئی۔ ان میں سے کچھ نے پہلے مفلوک الحال مسافروں پر آوازے کسے، پھر انہیں پتھر مارنے شروع کردیے۔ شاید وہ انہیں گداگر سمجھے تھے یا پھر چور اچکا تصور کررہے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ماضی قریب کا کوئی تلخ واقعہ ان کے طیش کا سبب بنا ہو۔ جس وقت یہ واقعہ ہوا، میں اور اللہ داد باقی قافلے سے بیس پچیس میٹر دور کھڑے باتیں کررہے تھے۔ قافلے میں ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔ عورتیں چلانے لگیں۔ مسافروں کے ہاتھوں سے بستر بند گر گئے اور وہ کنستر وغیرہ بھی جن میں انہوں نے آٹا یا چاول قسم کی اشیا ڈال رکھی تھیں۔ ماؤں سے بچے علیحدہ ہوگئے اور شوہروں سے بیویاں۔ ایرانی بچے انہیں پتھر مار مار کر بھگا رہے تھے۔ میں بھی بھاگ کر ایک دیوار کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ مفلوک الحال سندھی ساتھی میرے سامنے سے یوں دوڑتے ہوئے گزر رہے تھے جیسے ان کے پیچھے موت کے فرشتے لگے ہوں۔ ایک لڑکی دھڑام سے میرے قدموں میں گری۔ وہ چلائی۔ ''بابو سائیں بچاؤ۔''

میں نے دیکھا یہ وہی بھاری نتھ والی مہرو تھی۔ اس کی پیشانی سے خون رس رہا تھا۔ میں نے اسے دیوار کے ساتھ لگا کر اپنی اوٹ میں لے لیا۔ امید تھی کہ ہم بپھرے ہوئے لڑکوں کی نظر سے بچ جائیں گے لیکن پھر ایک گھر کی چھت پر کھڑے شخص نے ہمیں دیکھ لیا۔ اس نے انگلی سے ہماری طرف اشارہ کیا اور فارسی میں چلا کر کچھ کہا۔ تین لڑکوں کی ایک ٹولی گلی سے نکل کر ہماری طرف آئی۔ ایک لڑکے کے ہاتھ میں ہاکی اسٹک تھی۔ اس نے مہرو کو دیکھ لیا۔ وہ پُرطیش انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

''رک جاؤ...... اسٹاپ اٹ۔'' میں چلایا۔

ایک لڑکے نے مجھے دھکا دے کر مہرو سے علیحدہ کرنا

چاہا۔ میرا سر پیچھے دیوار سے ٹکرایا اور آنکھوں میں تارے سے ناچ گئے۔ جب دوسرے لڑکے نے مہرو کے جسم پر ہاکی سے ضرب لگانا چاہی تو میں نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ تیسرا لڑکا قد میں ذرا لمبا تھا۔ اس نے عقب سے میرے کوٹ کا کالر پکڑ کر کھینچا اور مجھے گرانے کی کوشش کی۔ اب ضروری تھا کہ میں دفاع کرتا۔ میں نے سامنے والے لڑکے کے پیٹ میں لات رسید کی اور ایک جھٹکا دے کر ہاکی اسٹک اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ مہرو پشت سے میرے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ دائیں طرف والے لڑکے نے میری گردن پر گھونسا رسید کیا۔ میں نے بھی بے دریغ ہاکی گھمائی جو اس کی کنپٹی کے پاس لگی۔ وہ سر پکڑ کر اوندھے منہ گرا۔ یقیناً اس کی پیشانی کی کھال پھٹ گئی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر باقی دونوں لڑکے الٹے قدموں پیچھے ہٹے۔ یہ سارا واقعہ بہ مشکل آٹھ دس سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا تھا۔ میں نے مہرو کا بازو پکڑا اور ایک تنگ گلی میں بھاگا۔ چھت پر کھڑا شخص بلند آواز سے چلا رہا تھا۔ شاید دیگر لڑکوں کو بتا رہا تھا کہ ہم اس طرف سے بھاگ رہے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کس طرف جاؤں۔ ہم بیس پچیس قدم آگے گئے تھے کہ دور کچھ فاصلے پر مجھے ایک نیون سائن نظر آیا۔ اس پر جو الفاظ لکھے تھے، وہ یقیناً پولیس اسٹیشن کے ہی تھے۔

''آؤ مہرو۔'' میں نے مہرو کا بازو کھینچا اور پولیس اسٹیشن کے رخ پر بھاگا۔

لیکن ابھی ہم نے بہ مشکل آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ گلی کے ایک موڑ پر دو تین ایرانی نظر آئے۔ ان میں سے ایک درمیانی عمر کا فربہ اندام شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں دور سے ہی ایک موٹی لکڑی دکھائی دی۔ یہ لکڑی اس نے یقیناً ہتھیار کے طور پر ہی اٹھا رکھی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ زور سے بولا اور انگلی سے ہماری طرف اشارہ کیا۔ میں مہرو کو کھینچ کر ایک اور گلی میں داخل ہوگیا۔ یوں لگتا تھا کہ گھیرا تنگ ہوگیا ہے اور ہم ان مشتعل لوگوں سے بچ نہیں سکیں گے۔ ایرانی اسکول بوائے کے زخمی ہونے سے یہ معاملہ یقیناً اور بھی سنگین ہوگیا تھا۔ ہمارے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ اچانک مجھے اپنے سامنے ایک اسٹیشن وین نظر آئی۔ اسے ایک دیوار کے ساتھ پارک کیا گیا تھا۔ میری نظر وین کی کھڑکی سے گزری اور مجھے پتا چل گیا کہ اس کا بائیں جانب والا دروازہ لاک نہیں ہے۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر جھٹکا دیا۔ سلائڈنگ دروازہ کھل گیا۔ میں مہرو کو گھسیٹ کر اندر لے آیا اور دروازہ بند کردیا۔ بہ ظاہر گلی خالی تھی لیکن کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ میں صرف دعا ہی کرسکتا تھا کہ کسی نے ہمیں وین میں گھستے دیکھا نہ ہو۔

ہم پچھلی نشستوں کے درمیان دبک کر بیٹھ گئے۔ چند ہی سیکنڈ بعد اس گلی میں مشتعل لڑکے اور دیگر افراد داخل ہوگئے۔ وہ چاروں طرف بھاگ رہے تھے، ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے ہاتھوں میں ہاکیاں یا لکڑیاں نظر آرہی تھیں۔ کچھ نے پتلونوں کی وزنی بیلٹس ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھیں، وہ گاڑیوں کے اندر جھانک رہے تھے اور ہر ایسی جگہ پر نگاہ دوڑا رہے تھے جہاں کسی کے چھپنے کا امکان ہوسکتا تھا۔

اندر مہرو کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور چنچل آنکھوں میں دہشت کے ڈیرے تھے۔ میں دو نشستوں کے درمیانی خلا میں سیدھا لیٹ گیا...... میں نے مہرو کو اپنے اوپر لٹالیا۔ اب اس کے سوا چارہ ہی نہیں تھا۔ وین کے اندر نیم تاریکی تھی اور ہم امید کرسکتے تھے کہ شاید ہمیں دیکھا نہ جاسکے۔

''سائیں! یہ لوگ مار دیں گے ہم کو۔'' مہرو کراہی۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا کہا۔

وین کے اردگرد بھاگ دوڑ کی آوازیں آرہی تھیں۔

پھر وین ہولے ہولے ہلی۔ وہ لوگ یقیناً اندر جھانک رہے تھے۔ یہ نازک ترین گھڑیاں تھیں۔ ہم اپنی جگہ پتھر کے بت بن گئے۔ مہرو بے چاری کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا اور یہ برق رفتار دھڑکن میں صاف محسوس کررہا تھا۔ خود کو اوجھل رکھنے کے لیے وہ میرے بالکل ساتھ لگی ہوئی تھی۔ خدا خدا کرکے یہ مشکل ترین گھڑیاں گزریں اور وین کے اردگرد قدرے سکون محسوس ہوا۔

بہرحال یہ سکون تادیر برقرار نہ رہا۔ کچھ دیر بعد وین کو ایک زور کا جھٹکا لگا اور کوئی شخص دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ چند سیکنڈ بعد گاڑی کے اگنیشن میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور وہ اسٹارٹ ہوگئی۔

مہرو نے خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک بار پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ اسی طرح نشستوں کے درمیان پھنسی پھنسائی لیٹی رہی۔ اسٹیشن وین اب تیزی سے چل رہی تھی اور موڑ وغیرہ کاٹ رہی تھی۔ پتا نہیں یہ شخص کون تھا؟ ہمیں دیکھ لیتا تو اس کا ردِعمل کیا ہوتا؟ اسکول بوائے سے جو ہاکی اسٹک میں نے چھینی تھی، وہ ابھی تک میرے پاس موجود تھی۔ اپنے دفاع کے

لیے میں اسے استعمال کرنے کی ہمت بھی اپنے اندر رکھتا تھا۔

قریباً دس منٹ تک زاہدان کی سڑکوں پر چلنے کے بعد وین رک گئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سایہ دار درختوں کے درمیان یہ ایک خاموش جگہ تھی۔ گاڑی والے نے انجن بند کیا۔ اب اگر وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا تو ہمیں فوراً دیکھ لیتا...... اور پھر یہی ہوا۔ اس ڈاڑھی والے نیم گنجے شخص نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہاکی کے دستے پر میری گرفت مضبوط ہو گئی لیکن اس کے بعد جو ہوا، وہ توقع کے مطابق نہیں تھا۔ وہ شخص پہلے فارسی میں کچھ بولا پھر انگریزی میں کہنے لگا۔ ”گیٹ ڈاؤن...... ناؤ گیٹ ڈاؤن۔“

میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہ ہماری موجودگی کے بارے میں جانتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے ہاتھ بڑھا کر سلائڈنگ دروازہ کھول دیا۔ پہلے مہرو اٹھ کر باہر نکلی پھر میں بھی نکل آیا۔ ہاکی اسٹک میں نے وین کے فرش پر ہی رہنے دی تھی۔

یہ ایک درمیانی عمر کا گورا چٹا ایرانی تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر بل تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر شکستہ انگلش میں بولا۔ ”میں نہیں جانتا تم کون ہو لیکن لڑکے کو چوٹ لگا کر تم نے بے وقوفی کی ہے۔ اگر تم ان کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ یقیناً تمہاری دو چار ہڈیاں توڑ ہی ڈالتے۔“

میں نے بھی انگریزی میں کہا۔ ”جناب! ہم نے یہ سب خود کو بچانے کے لیے کیا۔ شاید آپ کو معلوم نہیں وہ لڑکے بے وجہ......؟“

”اچھا اچھا ٹھیک ہے...... مجھے وضاحت کی ضرورت نہیں۔“ اس نے میری بات کاٹی اور بولا۔ ”اب جاؤ یہاں سے...... اور ان سے بچ کے رہنا۔“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے وین اسٹارٹ کی اور ایک موڑ کاٹ کر درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔

ہم اپنی جگہ سکتہ زدہ کھڑے تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ جہاں برے لوگ ہوتے ہیں، وہاں اچھے بھی ہوتے ہیں۔

مہرو ابھی تک تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کروں؟ لڑائی کے دوران میں وہ شاپر بھی میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا جس میں، میں نے کھانے پینے کی اشیا رکھی ہوئی تھی۔ اب میں بالکل خالی ہاتھ تھا۔ مہرو کا حال بھی یہی تھا۔ اس کے سر پر شاید کوئی پتھر لگا تھا۔ بالوں میں سے خون رس کر پیشانی تک آ گیا تھا۔ میرے کہنے پر اس نے اپنی بھاری اوڑھنی سے خون صاف کیا۔

”اب کہاں جانا ہے تو نے؟“ میں نے بیزار لہجے میں اس سے پوچھا۔

”بابو سائیں...... مم...... میں نے پا (بھائی) کے پاس جانا ہے۔“

میں نے جھلا کر کہا۔ ”تو مجھے کیا پتا کہ اب کہاں ہے وہ تیرا پا؟ خوامخواہ کی مصیبت ڈال دی ہے تم لوگوں نے مجھے۔ سریش بن کر چمٹ گئے ہو مجھ سے۔“

مجھے غصے میں دیکھ کر وہ ناک سے سوں سوں کی آواز نکالنے لگی اور پھر رونے لگی۔ قریب سے دو سائیکل سوار ہمیں گھورتے ہوئے گزرے۔ اس کی وجہ سے کوئی اور مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ میں نے ڈانٹ کر کہا۔ ”اب یہ رونا دھونا بند کر۔ کسی اور مصیبت میں نہ ڈال دینا۔“

اس نے سہم کر اپنے ہونٹ بھینچ لیے تاہم اس کا سینہ وقفے وقفے سے ہچکی سے دہلتا رہا۔ میں نے اسے ساتھ لیا اور پیدل ہی ایک طرف چل دیا۔ جب کوئی سڑک پار کرنا ہوتی تھی، مجھے اس کا ہاتھ پکڑنا پڑتا تھا۔ پھر میں نے مستقل طور پر ہی اس کی کلائی پکڑ لی یعنی ایک پردیسی دوسرے پردیسی کا ہاتھ تھام کر پناہ کی تلاش میں نکلا تھا۔ ہر گھڑی یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں ہم غلطی سے پھر اسی طرف نہ نکل جائیں جہاں اسکول کے لڑکوں سے واسطہ پڑا تھا۔

مجھے پتا چلا تھا کہ یہاں زاہدان میں مسافر سرائے بھی ہوتی ہیں جہاں پردیسیوں کو بہت کم قیمت پر رہائش اور کھانے کی سہولت مل جاتی ہے۔ میں نے راستے میں دو چار لوگوں سے پوچھا اور مہرو کو لے کر ایک ایسی ہی مسافر سرائے میں آ گیا۔ یہ ایک ہال نما کمرا تھا۔ اس کمرے کی دونوں سائڈز پر بھی چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ تاہم دروازہ کسی کمرے کا نہیں تھا۔ فرش پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں، کئی مسافران چٹائیوں پر ہی تکیے وغیرہ رکھے سو رہے تھے۔ ان میں ایک دو فیملیاں بھی تھیں۔ ایک فیملی شاید پاکستانی تھی۔ میں مہرو کے ساتھ ایک کمرے میں آ گیا۔ وہ مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کا بھائی بہت پریشان ہوگا۔ وہ زخمی بھی ہے۔ پتا نہیں اس کی کیا حالت ہوگی۔

میں نے اسے تسلی تشفی دی۔ سرائے کے ملازم سے کھانا منگوایا۔ عجیب طرز کی لبوتری سی روٹی تھی اور ساتھ کسی ترکاری کا سالن تھا۔ مجھے بھوک محسوس رہی تھی لیکن مہرو نے چکھ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ مجھ سے سندھی لہجے میں کہنے لگی کہ میں باہر جاؤں اور پتا کروں کہ بس کے باقی مسافر کہاں گئے ہیں۔

میں نے کہا۔ ”بے وقوفی کی بات نہ کرو۔ ابھی لڑکوں والا معاملہ تازہ ہے۔ ہمیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہ ہو اور وہ لوگ ہمیں تلاش کررہے ہوں۔“

اس کے سر پر پتھر لگنے سے کٹ سا آگیا تھا۔ میں باہر گیا اور ایک میڈیکل اسٹور سے اس کے لیے دوا لے کر آیا۔ پھر اپنے ہاتھ سے یہ ”پاؤڈر میڈیسن“ اس کے کٹ پر لگائی۔ مجھے اس کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اس کے پاس کوئی سفری کاغذ نہیں تھا پاسپورٹ، ٹکٹ وغیرہ اس کے بھائی جعفر کے پاس تھے۔ ایسے میں اگر کوئی پوچھ تاچھ کرلیتا تو یہ لڑکی مصیبت میں پڑسکتی تھی اور اس کے ساتھ ہی میں بھی۔

ہم نے رات جیسے تیسے گزاری۔ اگلے روز میں نے اس سے کہا۔ ”میں باہر نکل کر کچھ پتا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم کمرے کے اندر ہی رہنا۔ کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”سائیں! اگر کسی نے کچھ پوچھا تو؟“

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”تم بس سندھی ہی بولنا۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ تمہیں اس کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔“

اسے ضروری ہدایات دے کر میں باہر نکل گیا۔ میں نے دو تین جگہ سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ تفتان بارڈر سے زاہدان کی طرف آنے والی بسوں کا اسٹینڈ کس طرف ہے۔ کہیں سے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ جواب مل بھی جاتا تو ابھی اس طرف جانے میں خطرہ تھا۔ میں گھومتا گھومتا ایک بازار میں نکل گیا۔ یہاں کپڑوں کی بہت سی دکانیں بھی تھیں۔ ان میں زنانہ گارمنٹس کی شاپس بھی تھیں۔ میرے ذہن میں بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ سب سے پہلے اس مہرو نامی لڑکی کا حلیہ تبدیل کرنا ضروری ہے۔ میں نے ایک مقامی طرز کی سستی سی شلوار قمیص لے لی۔ اوپر پہننے کے لیے وہ گاؤن تھا جو اکثر ایرانی خواتین زیب تن کرتی تھیں۔ براؤن رنگ کا ایک اسکارف بھی لباس کا حصہ تھا۔

میں یہ چیزیں لے کر سہ پہر کے وقت سرائے پہنچا تو مہرو نے رو رو کر برا حال کیا ہوا تھا۔ ”بابو سائیں! دیر کیوں لگائی؟“ اس نے شکوہ کناں لہجے میں پوچھا۔

”بس دیر ہوگئی۔“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

”سائیں! پتا چلا کچھ پا (بھائی) کا؟“

”اب یہ کام اتنی جلدی نہیں ہونے والا۔ کچھ ٹائم لگے گا اس میں۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”اور تم مہربانی فرما کر ذرا حلیہ بدلو۔ اتارو یہ بدبودار کپڑے۔“

”جی؟“ وہ چونک کر بولی۔

میں نے کپڑوں والا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ لو، ادھر پیچھے زنانہ حمام ہے۔ وہاں جاکر نہالو اور پہن لو۔“

اس نے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پریشان ہوکر بولی۔ ”یہ کپڑے سائیں؟“

”ہاں یہی۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

وہ کچھ دیر ہچکچاتی رہی لیکن جب میں نے سختی سے کہا تو وہ کپڑے لے کر حمام کی طرف چلی گئی۔

وہ قریباً آدھ گھنٹے بعد واپس آئی تو کافی بدلی ہوئی تھی۔ اس کا گندمی رنگ نکھر انکھرا تھا۔ اس نے اسکارف بھی باندھ لیا تھا۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اسے جاذب نظر کہا جاسکتا تھا۔ اس کی آنکھیں خوب صورت تھیں لیکن فی الوقت ان میں گہری پریشانی کی دھند تھی۔

یہ مسافر سرائے زیادہ صاف نہیں تھی۔ کھانا بھی ناقص تھا۔ باتھ روم کی طرف سے کسی وقت بدبو کا جھونکا بڑے ہال کمرے تک آجاتا تھا۔ میں نے سوچا کوئی بہتر جگہ تلاش کرنی چاہیے۔ میری اگلی منزل تہران تھی لیکن تہران روانہ ہونے سے پہلے میں اس مصیبت سے جان چھڑانا چاہتا تھا جو مہرو کی صورت میں مجھ سے چمٹ گئی تھی۔ میں رات کو بھی صدق دل سے دعا کرتا رہا تھا کہ اس کے وارث اسے ڈھونڈتے ہوئے پہنچ جائیں اور میں اسے ان کے حوالے کردوں۔ آج صبح جب میں باہر نکلا تھا، اس وقت میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی تھوڑی دیر کے لیے آیا تھا اور وہ یہ کہ کیوں نہ میں سرائے واپس ہی نہ جاؤں میرا کون سا سامان وہاں پڑا تھا لیکن پھر میرے ذہن نے یہ بات قبول نہیں کی۔ وہ جو بھی تھی مسلمان تھی اور میری ہم وطن تھی۔ میں یوں پردیس میں اسے چھوڑ جاتا تو میرا ضمیر یقیناً مجھے ملامت کرتا۔

اگلے روز صبح سویرے اسے چھوڑ کر میں کسی اچھی جگہ کی تلاش میں نکلا۔ اچھی جگہیں تو بہت تھیں لیکن ان کے کرائے بھی بہت تھے۔ کافی کوشش کے بعد میں ایک مناسب جگہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ ایک سستا سا ہوٹل تھا۔ دوسری منزل پر چھ سات کمرے بنے ہوئے تھے۔ کرایہ پاکستان کرنسی کے حساب سے قریباً 100 روپے یومیہ تھا۔ میں نے اپنے پاسپورٹ کے ذریعے ہوٹل کے رجسٹر میں اندراج کرایا۔ مہرو کا اندراج میری بیوی کے طور پر ہوا۔ شکر کا مقام تھا کہ اندراج کرنے والے نے مہرو کا پاسپورٹ طلب نہیں کیا۔

سہ پہر تک ہم اس نئی جگہ منتقل ہوگئے۔ رات کو سونے کا ٹائم ہوا تو میں نے مہرو سے کہا۔ ”میں فرش پر چادر بچھا لیتا ہوں۔ تم بیڈ پر سو رہو۔“

وہ لرز کر بولی۔ ”یہ کیسے ہوسکتا ہے بابو سائیں؟ آپ اوپر سوئیں، میں نیچے سو جاؤں گی۔“

میں نے بہت کہا لیکن وہ نہیں مانی۔ مسلسل نفی میں سر ہلاتی رہی۔ اس نے دیوار کے ساتھ ایک چادر بچھالی اور صوفے کی ایک گدی تکیے کے طور پر رکھ لی۔ ہم اکیلے کمرے میں تھے اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے خوف نہیں کھا رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ میری ذات پر بہت بھروسا کررہی تھی۔ میں بستر پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ پریشان لہجے میں بولی۔ ”بابو سائیں! میرا پا (بھائی) بہت گھبرا رہا ہوگا۔ پتا نہیں کہاں کہاں مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ میں کیا کروں؟“

میں نے کہا۔ ”میں تمہیں کیا بتاؤں کہ تم کیا کرو۔ مجھے تو خود پتا نہیں کہ کیا ہورہا ہے۔ مجھے تو یہ بھی ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں تمہارا وہ پا (بھائی) مجھ پر تمہیں اغوا کرنے کا الزام ہی نہ لگادے۔“

”اغوا؟ یہ کیا ہوتا ہے بابو سائیں؟“ وہ معصومیت سے بولی۔

میں نے سٹپٹا کر کہا۔ ”کسی کو زبردستی اٹھا کر اپنے ساتھ لے جانا۔“

”نہیں نہیں بابو سائیں! تم بہت اچھا ہے۔ ہمارا پا (بھائی) بھی بہت اچھا ہے۔ وہ اس طرح کبھی نہیں سوچ سکتا اور پھر میں خود بھی تو سب کچھ بتاؤں گی اس کو۔“

”وہ مجھے بہت غصے والا لگتا ہے اور سندھی بھی نہیں لگتا۔ تم پوری سندھن ہو۔ وہ تمہارا بھائی کیسے بن گیا؟“

”وہ ادھر عراق میں رہتا ہے بابو سائیں۔ ہم وہاں نواب شاہ میں رہتا۔ اس لیے وہ ذرا اور طرح کا لگتا ہے۔“

”مجھے تمہاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آرہیں۔“ میں نے کہا اور بستر پر نیم دراز ہوگیا۔ پھر اچانک ایک نئی بات میرے ذہن میں آئی۔ میں نے مہرو سے پوچھا۔ ”تم نے رجسٹر میں اپنی ماں کا نام حبیبہ مائی لکھوایا تھا۔ ہمارے سندھ میں تو عورتوں کے نام اس طرح کے نہیں ہوتے۔“

”ماؤ (ماں) تو عراق کی رہنے والی تھی نا سائیں۔“

”یعنی تمہاری ماں عراق کی تھی اور باپ سندھ کا؟“

”جی سائیں! یہ بڑی پرانی بات ہے، انگریزوں کے وقت کی۔ میرا ابا انگریزوں سے لڑتا تھا، پھر وہ بھاگ کر عراق چلا گیا۔ نواب شاہ میں رہتا تو انگریز اسے جندہ نہ چھوڑتے۔ اس وقت میرے ابے کی عمر کوئی بیس سال تھی۔ وہاں بغداد میں وہ سخت مجدوری کرتا رہا۔ وہاں پر ہی اس کو میری ماؤ (ماں) ملی۔ دونوں کا سنجوگ ہوگیا۔“

”اب کہاں ہے تمہارا ابا؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے ایک سرد آہ کھینچی۔ ”وہ تو سات آٹھ سال پہلے فوت ہوگیا تھا۔ اب میں اپنے تاؤ کے پاس رہتی تھی اور داڈی (دادی) کے پاس۔“

”اور تمہاری ماؤ؟“

”وہ بھی کچھ سال پہلے اللہ سائیں کے پاس چلی گئی تھی۔“

”وہ بھی یہیں پاکستان میں فوت ہوئی؟“

”نہیں وہ وہاں بغداد میں ہوتی تھی۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ کیا تمہارا باپ پاکستان واپس آگیا تھا اور ماؤ وہیں رہی تھی؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ ”ہاں بابو سائیں! ان دونوں کے درمیان بگاڑ ہوگیا تھا۔ میں پانچ چھ سال کی تھی جب میرا ابا مجھے لے کر پاکستان آگیا تھا۔ میرا پا (بھائی) جعفر مجھ سے بڑا تھا۔ وہ وہیں ماؤ کے پاس رہ گیا۔ شروع میں ابا سوچتا تھا کہ شاید میری ماؤ میرے پا کو لے کر پاکستان آجائے گی۔ پر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ نہ ہی پھر میرا ابا سائیں کبھی واپس عراق گیا۔ پر وہ میری ماؤ کو یاد جرور کرتا تھا۔“

”کیا تم بھی اپنی ماؤ کو یاد کرتی تھیں؟“

”ہاں...... کچھ کچھ...... لیکن میں اپنے پا جعفر کو زیادہ یاد کرتی تھی۔ وہ مجھ سے چار پانچ سال بڑا ہے۔ ہم اکٹھے کھیلا کرتے تھے، پھر میں ابا سائیں کے ساتھ پاکستان آگئی۔ وہ وہاں اکیلا رہ گیا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اب تیرہ چودہ سال بعد وہ تم کو بغداد سے ڈھونڈتا ہوا وہاں نواب شاہ پہنچا؟“

مہرو نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا اور اس کی ناک کی تھلی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمکنے لگی۔ میرے سوالوں کے جواب میں مہرو نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں رک رک کر جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

مہرو کا بھائی جعفر بغداد میں رہا لیکن اپنے باپ اور بہن کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ اس کی بہن مہرو پاکستان کے شہر نواب شاہ میں کہیں رہتی ہے اور ایک پسماندہ بستی میں اپنے تایا کے پاس تنگی کی زندگی گزار رہی ہے۔ دوسری طرف جعفر کا شمار کھاتے پیتے

لوگوں میں ہوتا تھا۔ اس کے دل میں اکثر یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ پاکستان جائے اور اپنی بہن سے ملے۔ اس کے بعد کوشش کرے کہ وہ اس کے ساتھ بغداد چلی آئے۔ وہ پاکستان پہنچا اور مہرو کو ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ اس نے مہرو کو اپنے ساتھ چلنے پر کیسے راضی کیا اور مہرو کے تایا نے کیسے اجازت دی، یہ ایک علیحدہ کہانی تھی۔ بہرحال اب مہرو اپنے بھائی کے ساتھ اپنی رضامندی سے بغداد جارہی تھی۔ سندھی قافلے میں جو نور بخش نام کا بوڑھا شخص تھا، وہ بھی دور نزدیک سے مہرو کا رشتے دار ہی تھا اور ان دونوں کے ساتھ بغداد جارہا تھا۔ اب راستے میں یہ واقعہ ہوگیا تھا اور سب لوگ بکھر کر رہ گئے تھے۔ شوخ آنکھوں والی یہ بھولی بھالی سی مہرو میرے پلے بندھ گئی تھی اور میری مصیبتوں میں اضافہ کررہی تھی۔

اپنی روداد سنانے کے بعد وہ فرش پر میرے جوتوں کے پاس ہی لیٹ گئی اور آنکھیں بند کرلیں۔ میں کافی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور مختلف سوچیں میرے ذہن پر حملہ آور ہوتی رہیں۔ میں جو کچھ پیچھے چھوڑ آیا تھا وہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔ بہرحال اس کے عجیب عجیب نقشے میرے ذہن میں بن رہے تھے اور میرے اندر خوف جگا رہے تھے۔ ذہن میں خیال آتا تھا، پتا نہیں، وہاں کیا قیامت مچی ہوگی؟ مجھے کیسے کیسے تلاش کیا جارہا ہوگا؟

جسم تھکن سے چور تھا۔ کچھ ہی دیر بعد میں سوگیا۔ دوبارہ آنکھ کسی شور کی وجہ سے کھلی تھی۔ یہ بھی پتا نہیں چلا کہ شور کس چیز کا تھا۔ شاید کوئی زور سے بولا تھا یا پھر کوئی دروازہ زور سے بند ہوا تھا۔ میں نے دیکھا، مہرو فرش پر الٹی سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ بالوں کی لٹیں گندمی چہرے پر بکھری تھیں۔ میں نے اس کی طرف سے نگاہ چراتے ہوئے ایک چادر اس پر ڈال دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ سوئی رہے گی لیکن وہ اٹھ بیٹھی۔ اس نے پہلے اوڑھنی اپنے سینے پر درست کی۔ پھر آنکھیں مل کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔

میں دوبارہ لیٹ گیا۔ وہ واش روم میں چلی گئی اور وضو کرکے باہر آگئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھی۔ نماز کے بعد وہ ناک سے سوں سوں کی آواز نکالتے ہوئے دعا کرتی رہی۔ یقیناً اپنے وارثوں سے دوبارہ ملنے کی دعا کررہی تھی۔

یکا یک نچلی منزل سے پھر شور کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پہلے ایک دروازہ زور سے بند ہوا پھر دو تین افراد بلند آواز میں گرجنے برسنے لگے۔ یقیناً یہ ایرانی ہی تھے۔

میں نے باہر والی کھڑکی ذرا سی کھولی اور احتیاط سے جھانکا۔ ہوٹل کے سامنے سڑک پر ایرانی پولیس کی دو گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ دو باوردی اہل کاروں کے ساتھ دو تین سادہ پوش افراد بھی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان کو دیکھ کر میرا خون رگوں میں جم سا گیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ نوجوان ان افراد میں شامل تھا جنہوں نے اسکول کے سامنے لڑائی کے بعد ہمارا پیچھا کیا تھا۔

تو کیا ہمیں ڈھونڈ لیا گیا تھا؟ یا پھر ویسے ہی یہاں تلاشی وغیرہ ہورہی تھی؟ یہ شاہ ایران رضا شاہ پہلوی کا دور تھا۔ ایجنسیاں بہت سرگرم نظر آتی تھیں..... مجھے معلوم ہوا تھا کہ مشکوک افراد کے لیے اکثر ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز میں چیکنگ وغیرہ ہوتی ہے۔

مہرو دعا سے فارغ ہوئی اور ڈری ڈری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ''کیا ہوا بابو سائیں؟'' اس نے پوچھا۔

''یہاں ہوٹل میں تلاشی ہورہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ ہمیں ہی ڈھونڈ رہے ہوں۔''

''ہائے اللہ، اب کیا ہوگا بابو سائیں؟'' مہرو کا رنگ ہلدی ہوگیا۔

اب سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔ شاید اہلکار اب تلاشی لینے کے لیے اوپر آرہے تھے۔

میری سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا۔ میں نے مہرو سے کہا۔ ''مہرو! تم اپنی نماز جاری رکھو۔ وہ لوگ تمہیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں گے تو ہوسکتا ہے کہ واپس چلے جائیں۔ وہ اس حلیے میں تمہیں بالکل نہیں پہچان سکیں گے۔''

''لیکن بابو سائیں.....''

''بس کوئی سوال نہیں۔'' میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''تم نماز پڑھو، میں دروازہ کھول دیتا ہوں۔''

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ اَن لاک کردیا اور خود واش روم میں چلا گیا۔ لرزتی کانپتی مہرو نے میری ہدایت کے مطابق نفلی نماز شروع کردی تھی۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ وہ لوگ اب اوپر کی منزل پر تھے۔ دروازے دھڑا دھڑ بجائے جارہے تھے۔ اہلکاروں کی آوازیں گرج دار تھیں۔ وہ فارسی بول رہے تھے۔ میں واش روم کی دیوار کے ساتھ لگ گیا اور... کی ہول میں سے چابی نکالنے کے بعد ہول میں سے جھانکنے لگا۔ مجھے کمرے کا بیرونی دروازہ نظر آرہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس دروازے پر بھی زور سے دستک ہوئی۔ میری ہدایت کے مطابق مہرو نماز پڑھنے میں مشغول رہی۔ دوسری

تیسری دستک کے بعد دروازے کا ہینڈل گھوما اور ایک باوردی اہلکار اندر آیا۔ مجھے بس اس کی ٹانگیں اور پیٹ ہی نظر آرہا تھا۔ اس نے کمرے میں کھڑے ہوکر چاروں طرف دیکھا، یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ آخر یہ لمحے گزر گئے۔ اہلکار واپس چلا گیا اور دروازہ بند کردیا...... اپنے بدلے ہوئے لباس اور حلیے کی وجہ سے مہرو سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی گئی تھی۔ میں جلدی سے باہر آیا اور دروازہ پھر اندر سے لاک کردیا۔

مہرو کی پیشانی پر پسینا نظر آرہا تھا۔ نماز پڑھتے ہوئے اس نے اپنی اوڑھنی کو اس طرح سر اور چہرے پر رکھا تھا کہ اس کی تھلی بالکل نظروں سے اوجھل رہی تھی۔ یہ تھلی بڑی خطرناک تھی اور فوراً اس کی پہچان کراسکتی تھی۔ تھلی کے علاوہ وہ سندھی لباس بھی ایک شاپر میں موجود تھا جو مہرو نے مسافر سرائے میں بدلا تھا۔ یہ شاپر بھی سامنے الماری میں ہی رکھا تھا۔ اگر تلاشی لینے والے تھوڑی سی کوشش اور کرتے تو ہم سخت مصیبت میں پھنس سکتے تھے۔

میں نے سب سے پہلے تو مہرو سے وہ وزنی تھلی اتروائی اور اسے ٹشو پیپر میں لپیٹ کر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا۔ اس کے بعد مہرو کا سندھی لباس بھی اچھی طرح الماری کے عقبی خلا میں چھپا دیا۔

''بابو سائیں! کون لوگ تھے یہ؟'' مہرو نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ وہی تھے جن کے ساتھ ہماری لڑائی ہوئی ہے۔ ساتھ میں پولیس کے لوگ بھی تھے۔''

مجھے نیچے سڑک کی طرف سے کچھ آوازیں آئیں۔ میں نے کھڑکی کی درز میں سے احتیاط کے ساتھ نیچے دیکھا۔ باوردی ایرانی اہلکار چار پانچ افغانی باشندوں کو گرفتار کرکے گاڑی میں بٹھا رہے تھے۔ یقیناً یہ لوگ ہوٹل کی تلاشی میں ان کے ہتھے چڑھے تھے۔ ممکن تھا کہ مہرو کی طرح ان کے پاس بھی سفری کاغذات نہ ہوں۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں ایک بڑی مصیبت سے بچالیا تھا۔

وہ دن بھی ہم نے ہوٹل کے اسی کمرے میں چھپ کر گزارا۔ مہرو نے مجھے اپنے بارے میں کچھ مزید باتیں بھی بتائیں مثلاً یہ کہ اس کی دادی اس سے بہت پیار کرتی ہے لیکن اب وہ بہت بیمار رہتی ہے اور سوچتی ہے کہ اس کے بعد اس کا کیا ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اسے بھائی جعفر کے ساتھ عراق بھیجنے پر تیار ہوگئی ہے...... مہرو نے اپنے معصوم لب و لہجے میں یہ بھی بتایا کہ اس کا بھائی جعفر اسے بغداد لے جاکر کسی اچھی جگہ اس کی شادی کرنا چاہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

وہ بڑی خدمت گزار قسم کی لڑکی تھی۔ میں کھانا لاتا تو وہ کہتی۔ ''پہلے آپ کھائیں بابو سائیں۔ میں بعد میں کھاؤں گی۔''

میں نہانے کے لیے باتھ روم میں گیا تو اس نے وہاں پہلے ہی صابن تولیا وغیرہ رکھ دیا اور بالٹی بھر دی۔ نہاتے ہوئے میں نے کی ہول سے کمرے میں جھانکا۔ وہ اپنی پرانی اوڑھنی سے میرے بوٹ صاف کررہی تھی۔

رات کو عجیب واقعہ ہوا۔ مہرو کل رات کی طرح فرش پر چادر بچھا کر سوچکی تھی۔ میں بستر پر کروٹیں لے رہا تھا۔ اسی دوران میں ہوٹل کے نچلے حصے سے موسیقی کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ جدید قسم کی موسیقی تھی جس میں شور شرابا زیادہ ہوتا ہے۔ میں کچھ دیر تو انتظار کرتا رہا کہ شاید یہ سلسلہ رک جائے لیکن ایسا نہیں ہوا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نیند تو ابھی ویسے بھی نہیں آرہی تھی۔ کمرے کی مدھم روشنی میں میں نے دیکھا سوئی ہوئی مہرو کے چہرے پر سادگی اور معصومیت ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ جوان لڑکی نہ ہو چھوٹی سی بچی ہو...... میں نے اس کے جسم پر چادر درست کی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ دروازے کو باہر سے لاک کرنے کے بعد میں سیڑھیاں اترا اور نچلی منزل یعنی گراؤنڈ فلور پر چلا گیا۔ اب رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ڈائننگ ہال کی اکثر روشنیاں بجھ چکی تھیں اور ایک دو کے سوا سب میزیں خالی نظر آتی تھیں۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر دو ملازم اونگھ رہے تھے۔

میں ایک کوریڈور میں داخل ہوا تو موسیقی کی دھما دھم مزید شدت سے سنائی دینے لگی۔ یہ دھما دھم سیاہ رنگ کے ایک دروازے کے پیچھے سے ابھر رہی تھی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر دروازے کو تھوڑا سا اندر کی طرف دھکیلا۔ موسیقی کی آواز کان پھاڑنے لگی۔ اندرونی منظر دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ یہاں تین چار درجن لوگ موجود تھے۔ ان میں زیادہ تعداد نوجوان لڑکے لڑکیوں کی تھی۔ یہ ہپیوں کا کوئی گروہ تھا اور شاید آج شام ہی اس ہوٹل میں اترا تھا۔ یہ نیم برہنہ مرد و زن اندھا دھند ناچ رہے تھے۔ کچھ کے ہاتھ میں شراب کے جام تھے، کچھ سگریٹ وغیرہ کے کش لے رہے تھے۔ اس پورے ہال میں چرس کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی اور نیم تاریکی میں رنگ برنگی روشنیاں اسپارک کررہی تھیں۔

ابھی میں حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک لمبی تڑنگی گوری نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مجھے تیزی سے اندر کھینچ لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ایک دم میرے ساتھ کیا ہوگیا

ہے۔ میں دیوانہ وار رقص کرتے لوگوں کے گھیرے میں تھا۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے، نازیبا حرکات کر رہے تھے۔ نیم عریاں جسم موسیقی کی تیز لہروں پر اندھادھند تھرک رہے تھے۔ مجھے اندر کھینچنے والی دراز قد لڑکی نے مجھے بھی رقص میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ بار بار اپنی طرف کھینچا۔ میرے ہونٹوں سے بدبودار وھسکی کا جام لگانا چاہا۔ میں نے خود کو بہ مشکل اس سے علیحدہ کیا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن تب ایک اور قیامت میرے سامنے آگئی۔ چوبیس پچیس سال کی یہ خوش اندام ہپی لڑکی دھوئیں کے مرغولوں میں سے نکلی اور جونک کی طرح مجھ سے چمٹ گئی۔

''ڈانس بوائے ڈانس...... ڈانس بوائے ڈانس۔'' وہ مسلسل کہتی جارہی تھی۔

میں خود کو چھڑانے کے لیے اس سے کوئی زبردستی بھی کرنا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہوجائے۔ جب وہ حد سے بڑھنے لگی اور اس نے مجھے نیچے گرانے کی کوشش کی تو میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ ایک دم برہم ہوگئی۔ ہاتھ ہلا ہلا کر انگلش میں پتا نہیں کیا کیا بولنے لگی۔ ایک ہٹے کٹے ہپی نے دیکھ لیا تھا کہ میں نے لڑکی کو زور سے دھکا دیا ہے اور وہ گرتے گرتے بچی ہے۔ درمیانی عمر کا یہ ہپی نشے میں چور تھا۔ بڑے غصیلے انداز میں میری طرف آیا۔ بالکل ایسے ہی لگا جیسے مجھے تھپڑ مارنا چاہ رہا ہے۔ اگر وہ یہ غلطی کر گزرتا تو یقیناً اس کے لیے...... بلکہ ہم دونوں کے لیے بہت برا ہوتا۔ میں تھپڑ کھا کر چپ رہنے والا شخص نہیں تھا۔ بہرحال اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس سے پہلے کہ ہٹا کٹا ہپی مجھ تک پہنچتا، ایک شخص تیزی سے میرے اور ہپی کے درمیان آگیا...... اس نے کہہ سن کر ہپی کو آگے بڑھنے سے روک لیا۔ یہ کوئی پاکستانی لگتا تھا۔ اس نے صرف ایک نیکر پہن رکھی تھی اور اس کے پورے جسم پر لپ اسٹک کے نشان نظر آرہے تھے۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ یہ رحیم یار خان کا وہی امین نامی نوجوان تھا جس نے بس میں ہمارے ساتھ زاہدان تک کا سفر کیا تھا۔ امین کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ وہ خود بھی نشے میں چور تھا۔ اس کی توانا گردن کی رگیں نشے کی حدت سے پھولی ہوئی تھیں۔

''امین! تم یہاں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''یہی بات میں آپ سے بھی پوچھ سکتا ہوں جی۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

موسیقی کے شور کی وجہ سے ہم دونوں کو بہت زور سے بولنا پڑ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''میں اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ بس غلطی سے یہاں آگیا۔''

''یہ اچھی غلطی ہے۔ آپ بھی تھوڑی دیر انجوائے کرلو۔ یہ کھاتے پیتے ہپی ہیں۔ سب کچھ ان کے خرچے پر ہی ہورہا ہے۔''

یہ امین کا ایک نیا روپ تھا۔ بس میں وہ مجھے ایک غریب صورت، شریف النفس لڑکا نظر آیا تھا جو حق حلال کی روزی کے لیے پردیس کا رخ کررہا تھا لیکن یہاں وہ کسی اور ہی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نشے کے ساتھ ساتھ حرص و ہوس کی چمک بھی تھی۔ مجھے اس سے کراہت محسوس ہوئی۔ اسی دوران میں ایک ذرا صحت مند ہپی لڑکی نظر آئی اور ڈارلنگ کہتے ہوئے امین سے لپٹ گئی۔ امین کے سرخ و سپید جسم پر نظر آنے والے سرخ نشان شاید اسی بھدی سی ہپی لڑکی کی لپ اسٹک کے تھے۔

میں نے حیران نظروں سے دیکھا۔ کئی بدمست جوڑے ہال کے فرش پر پڑے ہوئے تھے اور اردگرد کے ماحول سے یکسر بے پروا نظر آتے تھے۔ شاید امین بھی کچھ دیر بعد گندگی کی اسی دلدل میں دھنسنے والا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ شاید چرس کا دھواں بھی مجھ پر اثر کررہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے تھرکتے جسموں کے درمیان سے راستہ بنایا اور ہال کمرے کا دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل آیا۔

مجھے مہرو کی فکر تھی۔ میں اسے کمرے میں مقفل چھوڑ آیا تھا۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ آہستہ سے چابی گھما کر دروازہ کھولا۔ یہ دیکھ کر شاک لگا کہ مہرو ڈری سہمی میرے بستر پر بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ بالکل زرد ہورہا تھا۔ مجھے دیکھ کر جیسے اس کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور میرا بازو پکڑلیا۔ روہانسی آواز میں بولی۔ ''آپ کہاں چلے گئے تھے بابو سائیں! آپ مجھ کو بتا کر تو جاتے۔''

''سوری...... سوری۔ میں نے سوچا کہ تمہیں بے آرام نہ کروں۔ میں بس ذرا سڑک تک گیا تھا۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا، جیسے جاننے کی کوشش کر رہی ہو کہ میرے بیان میں جھوٹ کتنا ہے اور سچ کتنا۔

''یہ نیچے کوئی ناچ گانا ہورہا ہے بابو سائیں!''

''پپ...... پتا نہیں۔ میں اس طرف گیا ہی نہیں۔'' میں نے کہا۔

میرا بازو بدستور اس کے نازک ہاتھوں کی گرفت میں تھا۔ جیسے اس پردیس میں یہ بازو ہی اس کا واحد سہارا ہو اور وہ ہرگز اسے چھوڑنا نہ چاہتی ہو۔ وہ بدستور روہانسی آواز میں بولی۔ ''بابو سائیں! آگے ایسا مت کرنا۔ یہ دیکھو میرا کلیجا کیسے دھک دھک بج رہا ہے۔'' اس نے کسی چھوٹی بچی کی سی معصومیت کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھا۔

میں سٹپٹا گیا۔ اسے دلاسا دیتے ہوئے بولا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ تمہیں تمہارے بھائی کے حوالے کرنے سے پہلے کہیں نہیں جاؤں گا۔''

وہ رات بھی جیسے تیسے گزر گئی۔ پاکستان، لاہور...... اور اپنے گھر کی یاد آتی رہی۔ آنکھیں بھیگتی رہیں اور خشک ہوتی رہیں۔ اگلے روز صبح میں ناشتا لینے کے لیے نیچے گیا تو ایک بار پھر امین پر نظر پڑی۔ وہ موٹے نقوش والی قدرے فربہ اندام گوری کے ساتھ موجود تھا اور مزے سے اورنج جوس پی رہا تھا۔ دو تین اور جوڑے بھی اردگرد موجود تھے۔ ہم دونوں کی نگاہیں ملیں لیکن کوئی بات نہیں ہوئی۔

ہماری بات دوپہر کے وقت ہوئی۔ اس وقت امین اکیلا تھا، اس نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ ہم دونوں لابی کے ایک صوفے پر آبیٹھے۔ باہر آنے سے پہلے میں نے مہرو کو اچھی طرح تسلی دے دی تھی کہ میں ہوٹل کے اندر ہی موجود ہوں۔

امین کا نشہ اب اترا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ رات والے واقعات پر شرمندہ نظر آئے گا لیکن کوئی خاص شرمندگی مجھے اس کے چہرے پر نظر نہیں آئی۔ اس کے بجائے اس نے مجھے قدرے شوخ نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''ہارون بھائی! آپ تو چھپے رستم نکلے۔''

''کیوں، کیا ہوا ہے؟''

''نہیں...... کچھ برا تو نہیں ہوا۔ اگر کوئی لڑکی آپ کے ساتھ ہے تو اچھا ہی ہے۔ یہ سب کچھ یہاں کے ماحول کے مطابق ہی ہے۔'' اس نے اپنے میلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ اندھے کو سارے اندھے ہی نظر آتے ہیں۔ جو تم سمجھ رہے ہو، ویسا کچھ نہیں ہے۔ یہ کوئی اور عورت نہیں...... وہی سندھی لڑکی ہے جس نے بس میں ہمارے ساتھ سفر کیا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے اس کا بھائی بھی ساتھ ہی تھا۔''

''اوہو...... تو یہ اس عراقی جعفر کی بہن ہے۔'' امین کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے اور وہ حیران نظر آنے لگا۔ ''لیکن ہارون صاحب! اس کا بھائی اور وہ رشتے دار نور بخش کہاں ہیں؟''

''تمہیں نہیں معلوم، وہاں بس سے اترنے کے بعد کیا ہوا تھا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''وہ سب کچھ تو بہت شرمندہ کرنے والا تھا۔ سمجھ ہی نہیں آئی، ایک دم کیا ہوگیا تھا جی۔ وہ لڑکے تو اس طرح پتھر مارنے لگے تھے جیسے ہم کوئی آوارہ جانور ہیں اور ان کے محلے میں گھس آئے ہیں۔ جس کا جدھر منہ اٹھا ادھر بھاگ گیا۔ میرے کندھے پر بھی ایک پتھر لگا تھا جی۔ میں ایک کوڑے دان کے پیچھے چھپ گیا اور پھر وہاں سے نکل کر ایک چھوٹی گلی میں گھس گیا۔ قسمت اچھی تھی کہ کسی نے سامنے سے مجھے پکڑا نہیں اور میں بڑی سڑک پر آگیا...... اور آپ کے ساتھ کیا ہوا؟'' آخر میں اس نے مجھ سے پوچھا۔

''وہی کچھ جو دوسروں کے ساتھ ہوا۔'' میں نے کہا اور پھر اس واقعے کی مختصر روداد اسے سنادی۔

پوری روداد سننے کے بعد وہ بولا۔ ''اب اس لڑکی کا کیا کریں گے آپ؟''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا۔ اس کے پاس پاسپورٹ ہے اور نہ کوئی اور کاغذ۔ پولیس اسٹیشن نہیں جاسکتا، نہ کسی اور ادارے سے رجوع کرسکتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کسی مصیبت میں نہ پڑ جائے وہ...... اور ساتھ میں، میں خود بھی۔''

امین بولا۔ ''ویسے تہران میں دو تین سندھی فیملیوں کے پتے میرے پاس ہیں، اگر یہ لڑکی ان فیملیوں تک پہنچ جائے تو ہوسکتا ہے کہ اپنے وارثوں سے بھی مل جائے......''

میں نے امین کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ نیت کا ٹھیک بندہ نہیں۔ وہ مجھے اس بات کے اشارے دے رہا تھا کہ وہ اس بے آسرا لڑکی کو اپنے ساتھ تہران لے جاسکتا ہے اور اس کے وارثوں تک پہنچانے کی کوشش بھی کرسکتا ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ سندھی قافلے کے لوگوں کی اگلی منزل تہران ہی تھی۔

میں نے کل رات امین کو جس حالت میں دیکھا تھا، اس کے بعد میں اس پر ہرگز اعتبار نہیں کرسکتا تھا...... اور مہرو کے سلسلے میں تو ہرگز نہیں۔ میں نے یہ موضوع ہی بدل دیا اور دیگر باتوں میں مصروف ہوگیا۔ ان دو چار دنوں میں ہی امین ان ہپی لوگوں کے ساتھ خوب گھل مل گیا تھا۔ اس کے منہ سے چرس کی ہلکی سی بو بھی آرہی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ عنقریب کسی برے چکر میں پھنسنے والا ہے۔ گفتگو کے دوران میں اس نے بتایا کہ ویسے تو وہ کویت پہنچنے اور محنت مزدوری کرنے کا ارادہ رکھتا

ہے لیکن کبھی کبھی اسے یہ بھی لگتا ہے کہ ان مزدوریوں میں بندہ اور بندے کی عمر خرچ ہو کر رہ جاتی ہے۔

وہ رازداری کے لہجے میں بولا۔ ”ویسے ہارون بھائی! ایک بڑے منافع بخش کام کا پتا مجھے چلا ہے۔ ابھی میں خود ریسرچ کر رہا ہوں، کسی نتیجے پر پہنچ گیا تو پھر آپ کو بھی بتاؤں گا۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیسے بتاؤ گے، میں تو بغداد جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور تم نے خیر سے پہنچنا ہے کویت۔“

”لیکن ہارون بھائی! جانا تو میں نے بھی بغداد سے ہو کر ہی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہاں دس پندرہ روز ہم رکیں گے بھی۔“ ”ہم“ سے اس کی مراد یقیناً اس کے لوفر ہی ہم سفر ہی تھے۔

اس نے پتلون کی ایک جیب میں سے بوسیدہ بٹوا نکالا اور پھر ایک پرچی پر ایک فون نمبر لکھ کر مجھے دیا۔ یہ کسی یوتھ ہاسٹل کا نمبر تھا۔ کہنے لگا۔ ”ہارون بھائی! بغداد میں آپ اس نمبر پر مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے رابطہ ہو جائے گا۔“ پھر ذرا چونک کر بولا۔ ”لیکن ہارون بھائی! آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ بغداد کیوں جا رہے ہیں آپ؟“

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ آنکھوں میں نمی سی آگئی۔ میں نے کہا۔ ”وہاں میرا کوئی اپنا ہے۔“

”کوئی رشتے دار ہے؟“

”رشتے دار تو غم دیتے ہیں۔ وہ غم لینے والا ہے، درد بانٹنے والا ہے۔ بڑا غم گسار، بڑا مہربان۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ میرے بہت سے دکھوں کا مداوا کرے گا اور میرا ہاتھ بھی پکڑے گا۔“

”اللہ کرے جی کہ آپ کی امیدیں پوری ہوں...... ویسے پردیس میں ایسی امیدیں کم ہی پوری ہوتی ہیں۔“

میں چپ رہا۔ اسے کیا جواب دیتا...... دیتا بھی تو شاید اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ اسے کیا پتا تھا کہ میں کس کی بات کر رہا ہوں۔ میں عالی مرتبت حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی بات کر رہا تھا۔ وہ بغداد میں ہی مدفون تھے۔ ان کے مزار اور عالی شان مسجد کی تصویریں میں نے کئی بار دیکھی تھیں۔ اب وہی جگہ مجھے اپنی طرف کشش کر رہی تھی۔ میں غموں کے ایک ناقابلِ فہم گھیرے میں تھا۔ ایک ریلا سا تھا جو مجھے اپنے ساتھ بہاتا چلا جا رہا تھا۔ ایسے میں کسی اللہ والے کے دستِ مہربان کی ضرورت مجھے بڑی شدت سے محسوس ... ہو رہی تھی۔ میں کہیں بھی جانے سے پہلے، کسی بھی ملک کا رخ کرنے سے پہلے ایک مرتبہ حضرت شیخ جیلانیؒ کے روضے پر جانا چاہتا تھا۔

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ وہی بھدی سی سفید فام لڑکی دوبارہ نظر آئی جو کل رات جونک کی طرح امین سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں میں سگریٹ تھا۔ وہ ہمارے پاس بیٹھنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور امین سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

اب میں اور مہرو تہران کی طرف محوِ سفر تھے۔ جرمنی کی شاندار ایئر کنڈیشنڈ بس تھی جس میں باہر کی گرمی بالکل بے اثر ہو جاتی تھی۔ کسی رن وے کی طرح کشادہ اور صاف شفاف سڑک پر بس بڑے ہموار طریقے سے تیرتی چلی جا رہی تھی۔ مہرو مقامی لباس میں تھی۔ اس نے اپنا چہرہ حجاب میں چھپا رکھا تھا۔ وہ میرے پہلو میں بالکل خاموش اور اداس بیٹھی تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ تہران میں کچھ سندھی فیملیوں کے ایڈریس میرے پاس ہیں، ان میں دو فیملیاں نواب شاہ کی بھی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں سے اس کے وارثوں کا کچھ پتا چل جائے۔ یہ فیملیاں ایک ہی بڑی بلڈنگ میں رہتی تھیں اور یہ ایڈریس میں نے امین اکرم سے ہی لیا تھا۔

سڑک کی دونوں جانب ہمیں کہیں کوئی بڑا درخت نظر نہیں آیا۔ چھوٹے چھوٹے قصبے دکھائی دیتے تھے جو نہایت خوب صورت اور صاف ستھرے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ لوگوں نے جدید گھر اور شیشے کی نفیس دکانیں پیرس سے منگوا کر یہاں رکھ دی ہیں۔

راستے میں ایک جگہ بس کچھ دیر کے لیے رکی۔ میں اور مہرو بھی ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے نیچے اتر آئے۔ یہاں موسم بدلا ہوا تھا۔ ہوا میں ٹھنڈک تھی۔ سامنے ہی ایک بہت بڑا راؤنڈ اباؤٹ تھا، جس کے اندر باغیچہ سا بنا ہوا تھا۔ یہاں بہت سی درمیانی عمر کی ایرانی عورتیں بیٹھی اور لیٹی ہوئی خوش گپیوں میں مصروف تھیں اور کچھ سو رہی تھیں۔ میں اور مہرو یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ عورتیں اتنی بے فکری سے لیٹی ہوئی تھیں۔ مہرو کی نگاہیں شرمیلے انداز میں جھک گئیں۔ بہرحال یہ یہاں کا رواج تھا۔

ہم کچھ کھانے کے لیے ڈھونڈ رہے تھے۔ ایک ہوٹل میں داخل ہوئے تو جیسے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ بہت سے ایرانیوں کی میزوں پر بکروں وغیرہ کی ابلی ہوئی سریاں رکھی تھیں۔ وہ چھری کانٹے سے ان سریوں کو نوچ

نوچ کر کھا رہے تھے۔ ہلکی سی بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔

”بابو سائیں! میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ مہرو نے کہا۔

میں اسے لے کر فوراً باہر نکل آیا۔ ایک اسٹال سے ہم نے دو چکن برگر لیے اور واپس بس میں آن بیٹھے۔ پتا نہیں کیا بات تھی میں جب بھی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا، مجھے وہ فقرے ضرور یاد آجاتے تھے جو میں نے اپنی مہندی کی رات اپنے کمرے میں سنے تھے۔ جب سے میں اس طویل سفر پر روانہ ہوا تھا، وہ فقرے مجھے دوبارہ سنائی نہیں دیے تھے اور نہ ہی وہ ہیولا نظر آیا تھا۔ جس نے پہلے مہندی کی رات اور پھر شادی کی شام مجھے اپنی جھلک دکھائی تھی۔ اس کے باوجود پتا نہیں کیوں کھانا شروع کرتے ہوئے مجھے اس ہیولے کی اور ان فقروں کی یاد ضرور آتی تھی اور چند لمحوں کے لیے جسم پر کپکپی سی طاری ہو جاتی تھی۔ یہ بات مہرو نے بھی نوٹ کی تھی اور ایک دو بار مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ میں کھانا شروع کرتے ہوئے ایک دم چپ سا کیوں ہو جاتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں اس کا کوئی معقول جواب اسے نہیں دے سکا تھا۔

ایک طویل سفر کے بعد ہماری بس عظیم الشان تہران کے مضافات میں پہنچ گئی۔ پہلے بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں وغیرہ نظر آئیں پھر شاندار عمارتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دیکھ دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی کہ اہلِ تہران کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی ہے۔ جابجا وسیع باغات اور آبی گزرگاہیں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ باغات اور شاہراہوں پر جگہ جگہ شاہ ایران کے مجسمے نصب تھے۔ جوں جوں ہم تہران کے قریب پہنچتے گئے، عمارتوں کے نقشے بدلتے گئے اور ان کی بلندی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان فلک بوس عمارتوں کے پس منظر میں پہاڑ تھے اور دور برفیلی چوٹیوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔ ہم جیسے رنگ و بو کی کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئے تھے۔

بس سے اترے تو شام ہو چکی تھی۔ ہم دونوں کچھ دیر پیدل ہی چلتے رہے۔ پھر ایک شاندار باغیچے میں بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے ہمیں کوئی چھوٹا سا ہوٹل تلاش کرنا تھا۔ وہیں باغیچے میں بیٹھے بیٹھے مہرو بولی۔ ”بابو سائیں! آپ تھک گئے ہیں تو میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔“

میں سٹپٹا گیا۔ ”تمہاری عقل کام کر رہی ہے یا نہیں؟ کیا میرا اور اپنا تماشا بنانا چاہتی ہو۔“ میں نے غصے سے کہا۔

وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

کچھ دیر بعد ہم پھر چل پڑے۔ ہم دو مسکینوں کی طرح تھے جو انتہائی خوش لباس لوگوں اور نہایت قیمتی گاڑیوں والے ایک ”پیرس نما شہر“ میں گھوم رہے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے ایک اندرونی سڑک پر ہمیں اپنے بجٹ کے مطابق ایک سستا سا ہوٹل مل گیا۔ یہاں اندراج کے لیے پھر میرا پاسپورٹ استعمال ہوا۔

یہاں کمرے میں پھر وہی مسئلہ تھا۔ ایک ہی ڈبل بیڈ تھا۔ میرے بہت منع کرنے کے باوجود مہرو نے یہاں بھی وہی ترتیب بنائی۔ یعنی خود لکڑی کے فرش پر چادر بچھالی اور مجھے بستر پر سلایا۔ کافی تھکاوٹ تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم سو گئے۔ آنکھ کھلی تو رات کے دس بج چکے تھے۔ بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ مہرو کا چہرہ بھی بھوک کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ہم نے کمرا لاک کیا اور نکل آئے۔ تہران رنگوں اور روشنیوں میں جگمگا رہا تھا۔ یہ سستا علاقہ تھا اس کے باوجود لاہور کے مال روڈ یا میکلوڈ روڈ سے کم دکھائی نہیں دیتا تھا...... ایک جگہ ہمیں ایک ریڑھی پر کھانے پینے کی اشیا نظر آئیں۔ ہم نے

دوبرگر اور لسی کے دو گلاس لیے اور چل پڑے۔ کھاتے رہے اور ساتھ ساتھ اردگرد کے مناظر دیکھتے رہے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی ایک ہی جیسی عمارتیں اور سڑکیں نظر آرہی تھیں۔

اگلے دو تین منٹ کافی پریشانی میں گزرے۔ مہرو نے پوچھا۔ ”کیا ہوا بابو سائیں؟“

”لگتا ہے ہم راستہ بھول گئے ہیں۔“ میں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

”اب کیا ہوگا؟“ وہ منمنائی۔

میں کیا جواب دیتا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ ذہن پر زور دیا اور پھر اندازے سے ایک راستہ منتخب کر کے اس پر چل پڑا۔ ہم قریباً ایک گھنٹے تک جوتیاں چٹخاتے رہے لیکن کہیں کوئی جانی پہچانی عمارت نظر آئی اور نہ راستہ۔ ہم گم ہو چکے تھے۔ آخر میں ایک بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے فٹ پاتھ پر رکھے لکڑی کے بینچ پر بیٹھ گیا اور سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ تھکن اور پریشانی سے برا حال تھا۔ یہ خیال سوہانِ روح بنا ہوا تھا کہ میرا پاسپورٹ وغیرہ بھی ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ سنگین غلطی مجھ سے یہ ہوئی تھی کہ ہوٹل سے نکلتے وقت میں نے ہوٹل کا نام غور سے دیکھا اور نہ ہی ہوٹل کا کارڈ اپنی جیب میں رکھا۔ ہم کسی کو بتا بھی نہیں سکتے تھے کہ ہم نے کہاں جانا ہے۔

”یا اللہ اب میں کیا کروں؟“ میں نے دل ہی دل میں پکارا۔

بے بسی کا یہ عالم تھا کہ رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ اگر ہم وہ ہوٹل نہ ڈھونڈ سکے تو کیا ہوگا؟ کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد ہم پھر چل پڑے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹا مزید تہران کی سڑکوں پر گھومے اور بالکل نڈھال ہو گئے۔ شدید پریشانی کے سبب میرے بازو میں درد ہونے لگا...... مجھے یوں محسوس ہوا کہ بے ہوش ہو کر گر جاؤں گا۔ سب سے زیادہ فکر مجھے اپنے پاسپورٹ اور کاغذات وغیرہ کی تھی۔

مہرو نے کانپتے لہجے میں کہا۔ ”اب ہم کیا کریں گے بابو سائیں؟“

میں نے جھلا کر جواب دیا۔ ”اب ہم نے کیا کرنا ہے۔ جو کریں گے یہاں کے پولیس والے ہی کریں گے۔ ہمیں اٹھا کر کہیں جیل میں ڈال دیں گے اور ہم سڑتے رہیں گے وہیں پر۔“

”بابو سائیں! آپ کسی اچھے بندے سے بات کر کے دیکھو، شاید وہ ہماری کوئی مدد کر سکے۔“

”کس سے بات کروں؟ کون سمجھے گا یہاں ہماری بات؟“ میں نے تقریباً چلا کر کہا۔

”بابو سائیں! مجھ پر کیوں غصہ ہوتے ہیں، میرا کیا قصور ہے؟“

”ہاں سارا قصور میرا ہی ہے۔ میں ہی گناہ گار ہوں۔ جوتے مارو میرے سر پر۔ میں نے ہی تمہیں اپنے ساتھ چمٹایا ہوا ہے۔ تمہیں اپنے ساتھ لیے لیے پھر رہا ہوں۔ مجھے ہی شوق چڑھا ہوا ہے تمہارے ساتھ سیر سپاٹے کرنے کا۔ بے وقوف کہیں کی...... الو کی پٹھی...... میں نے کہا بھی تھا کہ کمرے میں رہ...... میں کھانے کے لیے کچھ لے کر آجاتا ہوں...... لیکن تو کسی کی سنتی بھی ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب تیری وجہ سے...... سب تیری وجہ سے ہے۔“ میں دہاڑ کر بولا۔

قریب سے گزرتے ہوئے دو ایرانی چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ یہ رات ایک بجے کا عمل تھا۔ ویک اینڈ کے باوجود سڑکوں پر رش کم ہو گیا تھا۔ میری ڈانٹ سن کر وہ بالکل گم صم ہو گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ حجاب کے اندر سسکیاں لے رہی ہے۔

میں اٹھ کر ایک بار پھر چل دیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ وہ بڑے اذیت ناک لمحے تھے۔ میں انہیں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ اچانک مجھے عقب سے مہرو کی آواز آئی۔ وہ کراہ کر پہلو کے بل پختہ سڑک پر گری تھی۔ دراصل یہ موٹر سائیکل پر سوار دو اوباش لڑکے تھے۔ انہوں نے مہرو سے بدتمیزی کی تھی اور ان کا دھکا لگنے سے وہ گر گئی تھی۔ اب وہ موڑ کاٹ کر راہِ فرار اختیار کر رہے تھے۔ یہ سارا منظر ایک سیکنڈ کے اندر اندر میری نظروں سے گزر گیا اور میری سمجھ میں بھی آگیا۔ میں پہلے ہی غصے سے بھنایا ہوا تھا۔ نتیجے سے بے پروا ہو کر میں موٹر سائیکل کے پیچھے بھاگا۔ ساتھ ہی میں چنگھاڑا تھا۔ ”ٹھہرو حرامزادو۔“

مجھے خود پر جھپٹتے دیکھ کر موٹر سائیکل چلانے والا بوکھلا گیا۔ موٹر سائیکل ایک بڑے ڈسٹ بن سے ٹکرائی اور بری طرح ڈگمگا گئی۔ پیچھے بیٹھا ہوا لڑکا اس پر سے گر گیا لیکن اس کا ساتھی بھاگ نکلا۔ یہ ایک دبلا پتلا لڑکا لگتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھی اٹھ کر بھاگ نکلتا، میں نے اسے چھاپ لیا۔ اس نے فارسی میں مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی اور میرے سینے پر سر کی ٹکر مار کر مجھے گرانا چاہا۔ یہ سارے داؤ پیچ میرے آزمائے ہوئے تھے۔ میں نے نہ صرف اس کا یہ وار بچایا بلکہ اس کی گردن پر ایسا زوردار جھانپڑ رسید کیا کہ وہ چار پانچ میٹر تک لڑھکتا چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا میری ٹانگ اس کے

سینے پر پڑی اور وہ ڈسٹ بن سے ٹکرا کر پھول دار پودوں میں گرا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا واسطہ کسی کمزور بندے سے نہیں پڑا۔ وہ پھولوں والی کیاری سے اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کے پیچھے لپکنا چاہا لیکن مہرو نے میرے راستے میں آکر مجھے روک لیا۔ ”نہیں بابو سائیں...... جانے دیں...... دفع ہو گیا ہے...... جانے دیں۔“

یہ ایک چھوٹی سی نیم تاریک سڑک تھی۔ بس چند دکانوں کے اندر ہی روشنی نظر آرہی تھی۔ اردگرد کسی شخص نے یہ منظر نہیں دیکھا۔ میں نے اپنا لباس درست کیا...... مہرو سے اس کی خیریت پوچھی...... اور تب ایک بار پھر اس کے ساتھ چل دیا۔ اس بار میں مہرو کے آگے آگے چلنے کے بجائے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اب میرا رخ قدرے بڑی اور روشن سڑک کی طرف تھا۔ مہرو کچھ مزید سہم گئی تھی۔

یوں لگتا تھا کہ چل چل کر اب ہم دونوں کی ہمت جواب دینے والی ہے۔ اچانک مہرو نے ایک طرف انگلی اٹھائی اور بولی۔ ”بابو سائیں...... وہ دیکھیں جرا۔ وہ کون ہے؟“

میں نے اس کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھا اور یکایک دل خوشی سے سینے میں اچھل پڑا...... یہ ایک لمبے قد کا انگریز تھا اور اسے میں نے اسی ہوٹل میں دیکھا تھا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔

میں بھاگتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ہیلو...... ہاؤ آر یو۔“

میں اسے کیا بتاتا کہ میں کیسا ہوں۔ میں نے دردناک لہجے میں اسے بتایا کہ میں ہوٹل کا راستہ بھول گیا ہوں اور اپنی ساتھی کے ساتھ قریباً تین گھنٹے سے دربدر پھر رہا ہوں۔

اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل سے بیئر کا ایک طویل گھونٹ لیا اور مسکرا کر انگلش میں بولا۔ ”مجھے نہیں پتا تم کہاں رہے ہو...... لیکن اب تم اپنے ہوٹل سے زیادہ دور نہیں ہو۔ وہ سامنے دیکھو۔ یہی ہوٹل ہے۔“

میں حیرت سے گنگ ہو کر عمارت کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یہ ہوٹل کا عقبی دروازہ ہے۔ وہ سفید رنگ والا بڑا دروازہ سامنے کی طرف ہے۔“

اس نے مجھے اور مہرو کو ساتھ لیا اور تیس چالیس قدم چل کر سامنے کی طرف آگیا۔ میں ہوٹل کا سفید بڑا دروازہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یوں لگا کہ خوشی سے آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں گے۔ ہم بوسیدہ لباس والے اس دراز قد گورے کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہوئے۔ وہ بہ ظاہر شائستہ نظر آتا تھا لیکن گاہے بگاہے چور نظروں سے مہرو کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اس زمانے کا ایران کچھ زیادہ ہی آزاد خیال تھا۔ چلتی پھرتی عورتوں کو ایسے ہی بے باک نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ گورا...... امریکن ہے اور اکیلا ہی مڈل ایسٹ کی سیاحت کو نکلا ہوا ہے۔ اس کا نام اینڈرسن معلوم ہوا۔

میں اپنے کمرے میں یوں آیا جیسے پانی سے بچھڑی ہوئی مچھلی واپس تالاب میں آتی ہے۔ سب سے پہلے الماری کا اندرونی خانہ کھول کر اپنا پاسپورٹ اور نقدی وغیرہ چیک کی...... پاسپورٹ کو باقاعدہ ہونٹوں سے لگا کر چوما اور اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں احتیاط کے ساتھ رکھ لیا۔

مہرو اپنے فرشی بستر پر کسی مجرم کی طرح گم صم بیٹھی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ راستے میں میری طرف سے اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس وقت پریشانی ہی اتنی تھی کہ میں اپنے لب و لہجے پر کنٹرول نہ رکھ سکا۔

میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ اٹھ کر صوفے پر بیٹھ جائے۔ وہ پہلے تو جھجکتی رہی لیکن جب میں نے ذرا تحکم سے کہا تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے مہرو! میں نے تم سے سخت لہجے میں بات کی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے اس کے لیے معاف کر دو۔“

وہ ایک دم تڑپ سی گئی۔ ”آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں بابو سائیں! کیوں مجھ کو گناہ گار کر رہے ہیں۔ معافی تو مجھے آپ سے مانگنی چاہیے۔ میں نے اپنی مصیبتیں آپ کے گلے میں ڈال دی ہیں۔ میرے لیکھ ہی ایسے ہیں۔ اللہ سائیں کرے میرا ابا مجھے مل جائے...... یا پھر ویسے ہی مجھے موت آجائے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

میں نے کہا۔ ”دیکھو، میں نے تمہیں رلایا ہے اور غلطی رونے والے کی نہیں ہوتی رلانے والے کی ہوتی ہے۔ اسی لیے تم سے معافی مانگ رہا ہوں۔ بولو معاف کیا ہے یا نہیں؟“

وہ ایک دم کرسی سے اٹھ کر میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ میرے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ”بابو سائیں! کہاں آپ کی شان...... کہاں میں گلیوں میں رلنے والی نیچ ذات...... آپ مجھے اتنا شرمندہ نہ کریں سائیں کہ میری جان ہی نکل جائے۔“

میں نے اسے اٹھا کر دوبارہ کرسی پر بٹھایا۔ تسلی آمیز

انداز میں اس کا کندھا تھپکا اور اسے نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ چھوئی موئی کے پھول جیسی تھی۔ جلدی سے مرجھا جاتی اور جلدی سے کھل بھی جاتی تھی۔ اس نے اسکارف کے پلو سے اپنی نم آنکھیں صاف کرلیں۔ میں نے کہا۔ ”چلو اب دوبارہ دوستی ہوگئی ہے۔ اس خوشی میں کل دوپہر تمہیں ہوٹل سے اچھا سا کھانا کھلواؤں گا۔ تمہاری پسندیدہ بریانی......“

وہ کچھ دیر سوچ کر بولی۔ ”نہیں...... بابو سائیں! آپ کے پاس پیسے کم ہیں۔ ہم فضول خرچی نہیں کریں گے۔ ہم بریانی کھائیں گے لیکن خود پکا کر۔ آپ مجھے دو چار چیزیں لادیں، میں آپ کو سندھی بریانی کھلاؤں گی۔“

”پکاؤ گی کہاں؟“

”یہاں ساتھ والے کمرے کے پیچھے باورچی خانہ بھی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے بابو سائیں! بڑا صاف ستھرا ہے۔ برتن وغیرہ بھی ہیں۔“

”نہیں۔ میں تمہیں اس بکھیڑے میں نہیں پڑنے دوں گا۔“

”نہیں بابو سائیں! آپ کے لیے پکا کر مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ مجھے بہت جیادہ اچھا لگے گا۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

اس کا انداز بالکل سادہ اور صاف ستھرا تھا۔ اس کے رویے میں کہیں کوئی ذرا سی آلائش بھی نظر نہیں آتی تھی۔ مجھ سے بالکل ایسے ہی بات کرتی تھی جیسے اپنے گھر کے دیگر افراد سے کرتی ہوگی۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”چلو ٹھیک ہے لیکن اب سو جاؤ۔ رات بہت زیادہ ہوچکی ہے۔“

وہ بڑی فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلا کر اپنے فرشی بستر پر لیٹ گئی۔ اس کی گردن پر کھرونچے کا سرخ نشان ابھی تک نظر آرہا تھا۔ یہ نشان انہی اوباش لڑکوں کی بدتمیزی کا نتیجہ تھا جو راستے میں ہم سے ٹکرائے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں تہیہ کیا کہ صبح ناشتے کے بعد پہلا کام یہی کروں گا کہ ان سندھی فیملیز کا سراغ لگاؤں جو یہاں تہران میں موجود تھیں۔ میری دلی خواہش تھی کہ مہرو جلد از جلد اپنے وارثوں کے پاس پہنچ جائے یا کم از کم ایسے قابل بھروسا لوگوں کے پاس پہنچ جائے جو اسے اس کے وارثوں تک پہنچا سکیں۔

صبح مہرو کو سمجھا بجھا کر میں ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا۔ اس مرتبہ میں نے ہوٹل کا کارڈ جیب میں نہ رکھنے والی غلطی نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ پاسپورٹ بھی میرے پاس ہی تھا۔ امین کا دیا ہوا ایڈریس میرے پاس موجود تھا۔ میں نے دو بسیں بدلیں اور پھر قریباً تین کلومیٹر پیدل چل کر اس ایڈریس تک جا پہنچا۔ یہ ایک سرکاری دفتر کی عمارت تھی۔ یہ جان کر مجھے ازحد حیرت ہوئی کہ یہاں کوئی سندھی یا پاکستانی فیملی قیام پذیر نہیں تھی۔ نہ پہلے کبھی ایسا ہوا تھا۔ یہاں بس فرسٹ فلور پر بیرون ملک جانے والوں کو انجکشن وغیرہ لگائے جاتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ امین نے مجھ سے سفید جھوٹ بولا تھا۔ اس سے امین کی نیت بھی ظاہر ہوتی تھی۔ میری عقل پر پتھر پڑ جاتے اور میں اسے اس کے حوالے کردیتا تو اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

میں تھکا ہارا سہ پہر کے وقت واپس ہوٹل پہنچا۔ اس بات کا افسوس تو تھا کہ اس کے والی وارثوں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا لیکن اس بات کا اطمینان بھی تھا کہ ابھی وہ میری ہم سفر تھی اور کسی غیر یقینی صورتِ حال کا شکار نہیں تھی۔ ہوٹل واپس پہنچ کر میں نے اسے بتایا کہ ابھی یہاں کسی سندھی فیملی کا سراغ نہیں ملا۔ وہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔

اس نے کمرے کو آئینے کی طرح صاف ستھرا کردیا تھا۔ ہر چیز قرینے سے اس کی جگہ پر رکھی تھی۔ میں ہوٹل آتے ہوئے مہرو کی بتائی ہوئی اشیا لے آیا تھا۔ یہ اسپیشل سندھی بریانی کی چیزیں تھیں۔ چاول، چکن، آئل، پیاز، لہسن اور مسالے وغیرہ۔ بریانی اس نے رات کو پکانی تھی، اس لیے دوپہر کی پیٹ پوجا کے لیے میں دو بڑے برگر اور لسی کی بوتلیں لے آیا تھا۔

کھانا کھاتے کھاتے وہ اچانک بولی۔ ”آپ کی شادی ہوئی ہے بابو سائیں؟“

”ہاں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”کتنے بچے ہیں؟“

”بچہ ابھی کوئی نہیں۔“

”آپ کی زال کیسی ہے سائیں؟“ (زال یعنی بیوی)

”بہت اچھی...... بہت نیک۔“

”آپ اسے چھوڑ کر روزی کمانے نکل آئے ہیں۔ وہ آپ کو بہت یاد کرتی ہوگی۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”ہاں، بہت یاد کرتی ہوگی۔“ اس کے ساتھ ہی میری نگاہوں میں دلہن بنی عارفہ کا چہرہ گھوم گیا۔ مجھے لگا جیسے وہ ابھی تک حجلۂ عروسی میں بیٹھی منتظر نظروں سے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے۔ میرے قدموں کی چاپ کا انتظار کررہی ہے۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”اور تمہاری شادی کب ہورہی ہے؟“

اس کی کالی سیاہ آنکھوں میں ایک دم رنگ سے بکھر گئے۔ شرما کر بولی۔ ”مجھے کیا پتا جی...... میرے بڑوں کو پتا ہوگا یا پھر میرے پا کو پتا ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”کیا تمہارا اپنا کوئی خیال نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ تمہارے اردگرد کوئی ایسا نہیں جو تمہارے ساتھ شادی کے لیے مناسب ہو؟“

وہ ایک دم ہنس پڑی۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”نہیں بابو سائیں۔“ میں نے اسے کھوجنے والی نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ ”تم ہنسی کیوں ہو؟“

وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”بس ایسے ہی ہنسی نکل گئی بابو سائیں۔“

”ہنسی ایسے ہی تو نہیں نکلتی۔ کوئی وجہ ہوتی ہے۔“

”بس غلطی ہوگئی جی۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

میں نے اسے اس بارے میں تھوڑا سا کریدا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے تائے چاچے کے لڑکوں میں سے کوئی لڑکا ہے جو اسے پسند کرتا ہے اور اس کے آگے پیچھے پھرتا رہتا ہے لیکن اسے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ ویسے بھی مہرو کی معصومیت ایسے معاملوں میں حد سے بڑھی ہوئی تھی۔

عصر کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ بڑے عرصے بعد دل چاہا کہ مسجد میں جا کر نماز پڑھوں۔ میرے اندر جو جان لیوا ٹوٹ پھوٹ مچی ہوئی تھی، وہ کسی روحانی سہارے کا تقاضا کرتی تھی اور مصیبت میں خدا سے بڑا سہارا اور کون ہوسکتا تھا۔ میں اپنے ساتھ ساتھ مہرو کے لیے بھی دعا مانگنا چاہتا تھا کہ اس کا بھائی جلد سے جلد مل جائے اور وہ اس دیارِ غیر میں کسی بڑی مصیبت کا شکار ہونے سے بچ جائے۔ اس سے بڑی مصیبت کیا تھی کہ اس کے پاس سفری کاغذات تک نہیں تھے۔ وہ کسی بھی وقت حوالات میں پہنچ سکتی تھی۔

مسجد زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے وضو کیا اور جماعت میں شامل ہوگیا۔ جب بائیں جانب سلام پھیرا تو میری نظر سب سے پہلے مہرو کے بھائی جعفر پر پڑی۔ جعفر کے ساتھ ہی سفید ڈاڑھی والا نور بخش نماز پڑھ رہا تھا۔ نور بخش کے ساتھ ہی ایک اور ادھیڑ عمر سندھی تھا۔ اس کے سر پر سندھی ٹوپی کے بجائے بڑی سی پگڑی تھی۔ یہی لوگ مہرو کے وارث تھے۔ مجھے لگا کہ دعا مانگنے سے پہلے ہی دعا قبول ہوگئی ہے۔ سینے سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہوئی۔ میں اٹھ کر اگلی صف تک پہنچا اور دراز قد جعفر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ چند سیکنڈ کے اندر اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے...... آخری رنگ میں شدید حیرانی کے ساتھ ساتھ غصے کی جھلک بھی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرے ساتھ لنگڑاتا ہوا آٹھ دس قدم پیچھے آگیا۔ باقی دونوں افراد بھی ہمارے پیچھے آئے۔ جعفر تیز تیز کچھ بولنے لگا۔ مسجد کے صحن میں اس کی آواز بلند ہوتی چلی جارہی تھی۔

وہ یقیناً مہرو کے بارے میں ہی پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ مہرو میرے پاس ہے اور خیریت سے ہے لیکن میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کا پارہ چڑھتا جارہا تھا۔ اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا اور چلانے لگا۔ وہ عربی میں کہیں کہیں اردو کے لفظ بھی بول جاتا تھا۔ غالباً وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کروں۔

عمر رسیدہ نور بخش میرے اور جعفر کے درمیان آیا۔ اس نے جعفر کو بہ مشکل پیچھے ہٹایا۔ میں نے نور بخش سے کہا۔ ”تایا اس کو سنبھالو۔ میں اسے بتا بھی رہا ہوں کہ مہرو میرے پاس ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔“

نور بخش کی اردو بھی اتنی اچھی نہیں تھی۔ بہرحال وہ میری بات سمجھ گیا۔ اس نے جعفر کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی پھر مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ ”کہاں ہے ہماری دھی (بیٹی) ہمیں جلدی سے اس کے پاس لے جاؤ۔ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہم دیوانہ ہوگیا ہے سائیں۔“

پگڑی والا سندھی مجھے زاہدان والی بس میں نظر نہیں آیا تھا۔ یقیناً یہ یہاں کا کوئی مقامی سندھی ہی تھا۔ میں ان تینوں افراد کو لے کر ہوٹل میں پہنچا۔ مخصوص انداز میں دروازے پر دستک دی تو مہرو نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی اور وہ بریانی کے لیے پیاز وغیرہ کاٹ رہی تھی۔ اپنے سامنے اپنے بھائی کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں حیرت اور خوشی کی یورش ایک ساتھ نظر آئی۔ پھر وہ چلا کر اپنے بھائی جعفر سے لپٹ گئی۔ وہ بلند آواز میں رونے لگی تھی۔ عمر رسیدہ نور بخش مسلسل اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

مہرو کے رونے سے دراز قد جعفر نے پتا نہیں کیا مطلب لیا۔ اس کے لمبوترے چہرے پر میرے لیے ایک بار پھر طیش کی لہر سی دکھائی دینے لگی۔ بہرحال اگلے چار پانچ منٹ میں سب ٹھیک ہوگیا۔ مہرو نے جعفر اور نور بخش کو تفصیل سے بتایا کہ میں نے اس سے کیا سلوک کیا ہے اور اس کے لیے کس کس طرح خود کو مصیبت میں ڈالا ہے۔

دونوں بزرگ میرے بے حد شکرگزار نظر آنے لگے تھے۔ جعفر کی نظریں بھی کچھ جھکی جھکی تھیں۔ نور بخش نے مجھے بتایا کہ انہیں زاہدان میں ہی معلوم ہوگیا تھا کہ لڑکوں کے

حملے کے بعد میں اور مہرو اکٹھے ہی بھاگے تھے۔ وہ تین چار دن زاہدان میں ہر ممکنہ جگہ پر مجھے اور مہرو کو تلاش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اس مسافر سرائے میں بھی پہنچے جہاں میں نے اور مہرو نے دو دن قیام کیا تھا لیکن جعفر اور نور بخش کے پہنچنے تک ہم سرائے سے ہوٹل شفٹ ہو چکے تھے۔ بہرحال جعفر وغیرہ کو یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ ہم زاہدان سے تہران روانہ ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں۔ وہ ہم سے ایک دن پہلے ہی یہاں تہران پہنچے تھے۔

میں نے ان لوگوں کو چائے وغیرہ پلائی۔ میں انہیں کھانا بھی کھلانا چاہتا تھا لیکن انہیں جلدی تھی۔ وہ تہران کے مضافات میں ٹھہرے ہوئے تھے اور آخری بس روانہ ہونے سے پہلے بس اسٹینڈ پہنچنا چاہتے تھے۔ قریباً ایک گھنٹے بعد وہ لوگ مہرو سمیت مجھ سے رخصت ہو رہے تھے۔ دونوں بزرگوں نے مجھے بار بار گلے سے لگایا اور شکریہ ادا کیا۔ یہاں تک کہ جعفر کو بھی میرے ساتھ ہاتھ ملانا پڑا اور شکریے کا لفظ کہنا پڑا۔ وہ بہت کم مسکراتا تھا یا شاید مسکراتا ہی نہیں تھا۔ ایک طرح سے یہ دوسرا احسان تھا جو میں نے اس پر کیا تھا۔ پہلا احسان وہ تھا جب میں نے تفتان بارڈر پر، ریت میں دبے ہوئے شکنجے سے اس کی جان چھڑائی تھی، ورنہ عین ممکن تھا کہ اس کی پنڈلی کی ہڈی ہی ٹوٹ جاتی۔ اس کا یہ زخم اب کافی حد تک بہتر تھا۔ دوسرے احسان کو میں احسان تو نہیں کہہ سکتا، یہ ایک اخلاقی فرض تھا جو میں نے پورا کیا اور مہرو کو بخیر و عافیت اس تک پہنچایا۔ اس میں اللہ نے بھی بہت مدد کی...... خانۂ خدا میں نماز ادا کرتے ہوئے ہمارا یہ مسئلہ حل ہو گیا۔

وقتِ رخصت مہرو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ بابو سائیں۔“ اس نے کہا اور نگاہیں جھکا لیں۔ اس کی نگاہیں میرے پاؤں کو چھو رہی تھیں۔ وہ جیسے ایک خاموش ادا کے ساتھ خود بھی میرے پاؤں چھو رہی تھی۔ ایک عجیب عقیدت ایک انوکھا سا احترام تھا اس کے انداز میں۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں کرتی تھی؟ میں گناہ گار سا بندہ اتنے احترام کے قابل تو نہیں تھا اور پھر وہ چلی گئی۔ زندگی کے سفر میں لوگ ایسے ہی ملتے اور بچھڑ جاتے ہیں۔ شب و روز کی مسافت کو اگر ریل گاڑی سے تشبیہ دی جاتی ہے تو کچھ غلط نہیں دی جاتی۔

سامنے میز پر چنے ہوئے چاول پڑے تھے۔ کٹا ہوا پیاز اور لہسن وغیرہ پڑا تھا۔ میں نے یہ ساری چیزیں سمیٹ کر ایک شاپر میں ڈالیں اور ہوٹل کے ایک ملازم کو دے دیں۔

اگلے روز کچھ اداسی سی رہی۔ ویک اینڈ گزرنے کے بعد ہوٹل میں بھی بہت کم مہمان رہ گئے تھے۔ ہاں وہ امریکی وہیں تھا جو کل رات ہمیں سڑک پر ملا تھا اور ہم اس کی مدد سے اپنے ہوٹل کو پہچان سکے تھے۔ ناشتے کے بعد میں وقت گزاری کے لیے اس کے پاس جا بیٹھا۔ میں نے اینڈرسن نامی اس امریکن کو بتایا کہ میں آج کل شدید الجھن اور پریشانی کا شکار ہوں اور سکون حاصل کرنے کے لیے بغداد کے ایک بہت بڑے ولی اللہ کے روضے پر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اینڈرسن نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ قریباً اٹھارہ سال سے انڈیا میں رہ رہا ہے۔ وہ اردو بڑی روانی سے بولتا تھا۔ ہم تا دیر لابی میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے رہے۔ میں نے اینڈرسن سے کہا۔ ”آپ نے قریباً ساری دنیا گھومی ہے۔ آپ کو سب سے اچھے لوگ کہاں کے لگے؟“

وہ بولا۔ ”ایک قوم کی حیثیت سے، میری رائے کے مطابق سب سے سخت مزاج لوگ ایرانی اور مصری ہیں۔ یہ اپنے خیالات کے حوالے سے بے حد کرخت اور کٹر محسوس ہوتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ”پاکستانیوں کے بارے میں آپ جناب کا کیا خیال ہے؟“

وہ بولا۔ ”میری رائے میں یہ اچھی اور سادہ قوم ہے۔ خوش اخلاق بھی ہے...... لیکن کچھ پاکستانی مجھے شریر بھی محسوس ہوتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اینڈرسن صاحب! اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔“

اینڈرسن کے ساتھ اچھی گپ شپ رہی۔ دوپہر کو میں کھانا کھانے کے لیے ایک ہوٹل میں گیا۔ وہاں بھی سری پائے بڑے ذوق و شوق سے کھائے جا رہے تھے...... اور بغیر روٹی کے کھائے جا رہے تھے۔ یہاں پلیٹوں پر مختلف بزرگوں کی تصویریں بنی ہوئی نظر آئیں۔ کچھ لوگ ان تصویروں والی پلیٹوں میں ہی کھانا کھا رہے تھے۔ میں باہر نکل آیا اور ایک خوانچے والے سے دال روٹی کھا کر پیٹ پوجا کر لی۔ تہران باغات اور پھولوں کا شہر تھا۔ گلی کوچے جنت کا نمونہ پیش کرتے تھے۔ اطراف کے برف پوش پہاڑوں سے آنے والا شفاف پانی، آبی گزرگاہوں سے گزرتا تھا اور تہران کی دلکشی میں اضافہ کرتا تھا۔ باشندے...... شہر سے بھی زیادہ خوب صورت نظر آتے تھے۔ چاق و چوبند پولیس والے جدید بی ایم ڈبلیو موٹر سائیکلز پر دندناتے پھرتے تھے اور کسی کو قانون شکنی کی

جرأت نہیں تھی۔ مجھے مہرو کا خیال آیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اپنے وارثوں کے پاس پہنچ گئی ہے۔ راستے میں ایک نہایت خوب صورت مسجد میں عصر کی نماز پڑھ کر میں ہوٹل پہنچا تو امریکن اینڈرسن گھومنے پھرنے کے لیے باہر جا رہا تھا۔ ہم نے دور ہی سے علیک سلیک کی۔

کچھ دیر ادھر ادھر گھومنے اور ٹی وی دیکھنے کے بعد میں سو گیا۔ دوبارہ میری آنکھ ایک شور سے کھلی۔ گھڑی دیکھی، رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ کھڑکی کھول کر دیکھا۔ معمول کے مطابق ہوٹل کا مین دروازہ بند ہو چکا تھا۔ امریکن اینڈرسن باہر تھا اور شور مچا رہا تھا کہ دروازہ کھولا جائے۔ ایرانی گارڈ بضد تھا کہ ٹائم اوپر ہو چکا ہے اب وہ کسی صورت دروازہ نہیں کھولے گا۔ امریکن تقریباً آدھ گھنٹے تک شور مچاتا رہا اور انگریزی میں چلاتا رہا لیکن ایرانی گارڈ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ آخر گارڈ اپنے کیبن میں واپس چلا گیا اور امریکن بکتا جھکتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

صبح سات بجے کے لگ بھگ جب ہوٹل کا دروازہ کھلا تو امریکن کو اندر آنا نصیب ہوا۔ وہ ساری رات نہ جانے کہاں خجل خوار ہوتا رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں ایرانی گارڈ کی ثابت قدمی پر خوش ہوا۔ اس نے امریکی بہادر کی سنگین دھمکیاں سننے کے باوجود اپنے اصول سے انحراف نہیں کیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”مسٹر اینڈرسن! تم ٹھیک ہی کہتے ہو، ایرانی قوم دنیا کی ”سخت ترین مزاج“ والی قوموں میں سے ایک ہے۔“

☆☆☆

ٹھیک تین روز بعد میں بھرے پرے تہران کو اور اس کی رونقوں کو خیر آباد کہہ کر عراق کا رخ کر رہا تھا۔ اپنے چند ہم سفروں کے ساتھ میں ایک آرام دہ بس میں سوار تھا۔ دو روز پہلے ہی ہمارے پاسپورٹس پر عراق کے ویزے... بہ آسانی لگ گئے تھے۔ ویزے لگنے کے بعد اور ٹکٹ خریدنے کے بعد اب ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اب ایک نیا سفر تھا، نئی سرزمین تھی، نئے لوگ، نیا جہاں۔ تاریخ اس خطے کے تذکروں سے بھری پڑی تھی۔ امیر معاویہ سے لے کر صلاح الدین ایوبی تک اور سلاطین عباسیہ سے لے کر سلاطین عثمانیہ تک نہ جانے کتنے فرماں روا یہاں آئے اور گئے۔ کتنی سلطنتیں آباد اور برباد ہوئیں......

ہماری بس بڑی تیز رفتاری سے پہلے بلند و بالا پہاڑوں پر چڑھی اور ہمیں شدید سردی کا مزہ چکھایا...... پھر بتدریج نیچے اتری...... اور اترتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ریگستانی علاقہ شروع ہو گیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ اب ہم عراق میں داخل ہونے والے ہیں۔ بلندی سے نشیب کا یہ سفر قریباً آٹھ دس گھنٹے پر مشتمل تھا۔ آخر بالکل خشک میدانی علاقہ آ گیا...... آب و ہوا یکسر بدل گئی۔ تھوڑے مزید سفر کے بعد ہم ایران عراق بارڈر پر پہنچے۔ بارڈر پر ایک طرف شاہ ایران کا بلند و بالا مجسمہ تھا اور دوسری طرف صدر صدام حسین کا۔ وہ جیسے آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے...... ایک کہہ رہا تھا، میرے پاس زیادہ ”تیل“ ہے، دوسرا کہہ رہا تھا میرے پاس زیادہ ”ترقی“ ہے۔

گاڑی یہاں رک گئی۔ ہمارے کاغذات وغیرہ چیک ہوئے۔ تب ہم ایک عراقی بس میں سوار ہوئے اور عراق میں داخل ہو گئے۔ عراقی بس میں بیٹھ کر پاکستان کی کھٹارا بسوں کی یاد تازہ ہو گئی اور صرف بس ہی نہیں ارد گرد کے سارے مناظر بھی تبدیل ہو گئے تھے۔ علاقہ خشک اور بنجر۔ بغیر فٹ پاتھ کے خستہ حال سڑکیں، بوسیدہ مکانات، کچھ یہی حال لوگوں کا بھی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ عراقیوں کی اکثریت نے لنڈے کے کپڑے زیبِ تن کر رکھے ہیں۔ ہماری بس چند گھنٹوں تک خشک میدانی علاقوں میں دھول اڑاتی رہی اور آخر بغداد پہنچ گئی۔ بغداد کہانیوں اور داستانوں کا شہر جو لاتعداد مرتبہ اجڑا اور پھر آباد ہوا۔ بغداد سے میرا پہلا تعارف بچپن میں سنی ہوئی کہانیوں مثلاً بغداد کا چور اور الٰہ دین وغیرہ سے ہوا تھا۔ اب وہی تصوراتی شہر میرے سامنے تھا اور میں اسے اپنی آنکھوں سے جیتی جاگتی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ یہ عصر کا وقت تھا۔ بغداد کی مساجد سے شام کی اذان بلند ہو رہی تھی۔

ہماری بس شہر کے ایک مضافاتی اسٹینڈ پر رکی تھی۔ میں نے راہ گیروں سے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے روضے کا پتا پوچھا اور پیدل ہی چل دیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ سفر اتنا لمبا ثابت ہو گا۔ میں گنجان علاقے میں داخل ہوا تو اصل راستے سے ہٹ گیا۔ پرانے شہر کی طرف نکل گیا۔ پرانے بازار، محرابی دروازے، قدیم بالکونیاں اور تنگ راستوں پر چلتے پھرتے لوگ۔ سب کچھ کہانیوں کے مناظر جیسا لگا۔

بہت زیادہ چلنے اور تھک کر چور ہونے کے بعد میں رات کوئی ساڑھے گیارہ بجے غوث پاک عبدالقادر جیلانیؒ کے روضے پر پہنچا۔ ایک عجیب طرح کے روحانی احساس نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میں یہ بتانے میں کوئی عار نہیں سمجھتا کہ میں زیادہ مذہبی نہیں تھا۔ نماز پڑھنے میں بھی باقاعدگی نہیں تھی اور اللہ والوں کے پاس یا ان کے مزارات

پر جانے کا تو کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا...... لیکن پچھلے دنوں میں جن سنگین حالات سے گزرا تھا اور میرے اندر جو ٹوٹ پھوٹ مچی تھی اس نے مجھے، اپنے پیدا کرنے والے کی طرف متوجہ کیا تھا اور مجھے روحانی سہاروں کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے مرقد مبارک کو دیکھ کر میرے دکھ یلغار کر کے میری آنکھوں میں جمع ہو گئے۔ جیسے کوئی دکھوں کا مارا بچہ اپنے کسی شفیق بزرگ کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے، میں بھی رو دیا۔ ہچکیوں اور آہوں سے میرا سینہ دہلنے لگا۔ نہ جانے میں کتنی دیر اسی طرح اپنی آنکھوں کا پانی نچوڑتا رہا۔ آخر دل کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہوا۔

جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، مزار کا دروازہ رات گیارہ بجے بند ہو جاتا تھا۔ بند دروازے کو دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ میرے اندر کا وجدانی جوش مجھے اندر جانے کے لیے اکسا رہا تھا۔ میں نے آہنی دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ کافی دیر بعد ایک خادم نظر آیا۔ اس نے ایک لمبا چغہ پہن رکھا تھا۔ بال منتشر تھے، اس نے عربی میں کچھ کہا۔ غالباً یہی پوچھا تھا کہ میں کون ہوں؟

میں نے اشاروں کی زبان اور انگلش کو ملا جلا کر اسے بتایا۔ ''میں ایک مسافر ہوں۔ یہاں رات گزارنا چاہتا ہوں۔''

وہ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی اٹھائی گیرا ہوں یا پھر چوری کی نیت رکھتا ہوں۔ اس نے کرخت لہجے میں عربی بولی اور مجھے بتایا کہ وہ اس وقت میرے لیے دروازہ نہیں کھول سکتا۔ اس نے مجھے ہاتھ سے چلے جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی واپس چلا گیا۔

میری دلی کیفیت کچھ عجیب ہو رہی تھی۔ آنسو مسلسل آنکھوں سے رستے چلے جا رہے تھے۔ میں کسی دھتکارے ہوئے بھک منگے کی طرح باہر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ بدن تھکن سے چور تھا۔ رات تو کسی طرح گزارنا ہی تھی۔ اردگرد تاریکی اور مایوسی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اسی دوران میں مجھے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے آبائی قبرستان کا چھوٹا سا دروازہ نظر آیا۔ اگر فٹ پاتھ پر ہی بیٹھا رہتا تو گشتی پولیس والے مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر سکتے تھے۔ میں اٹھا اور غنودگی کی سی حالت میں چلتا ہوا قبرستان میں داخل ہو گیا۔ رات کے اس پہر یہ شہر خموشاں کچھ اور بھی خاموش و سنسان نظر آ رہا تھا۔ قبروں کی طویل قطاریں تھیں۔ تاروں کی مدھم روشنی میں وہ قبریں نمایاں نظر آتی تھیں جن پر سنگِ مرمر لگا ہوا تھا۔ یہ ڈرانے والے مناظر تھے لیکن موت سے بڑا ڈر کس چیز کا ہوتا ہے...... اور میں تو جیسے زندگی اور موت کے احساس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ شاید میں اسی وقت مر گیا تھا جب اپنے گھر کی چھت پر میرے اندر کی ساری روشنیاں اچانک بجھی تھیں اور میں اپنی منتظر دلہن کو چھوڑ کر نکل آیا تھا۔

میری ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں۔ میں ایک پختہ قبر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر شیخ عبدالقادرؒ کے مزار کی کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ اس کھڑکی میں روشنی تھی۔ میں نے کھڑے ہو کر دیکھا تو کھڑکی میں سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی قبر مبارک بھی نظر آئی۔ ایک بار پھر میں ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ میں نے دل ہی دل میں پکار کر کہا۔ ''حضرت! دیکھیں آپ کا یہ فقیر کہاں کہاں سے دھکے کھاتا ہوا آپ تک پہنچا ہے۔ اس کا جسم تھکن سے چور ہے اور روح اس سے بڑھ کر زخمی ہے لیکن آپ کے محافظوں نے اسے دھتکار دیا ہے۔ اسے آپ تک پہنچنے ہی نہیں دے رہے اور پتا نہیں کہ آئندہ بھی پہنچنے دیں گے یا نہیں......''

میں روتا رہا اور پھر نڈھال سا ہو گیا۔ مجھے لگا کہ نیند آ رہی ہے۔ میں کہیں بھی لیٹ کر سو جانا چاہتا تھا۔ سامنے ہی سنگِ مرمر کی دو قبریں ساتھ ساتھ نظر آ رہی تھیں۔ درمیان میں ڈیڑھ دو فٹ کا فاصلہ ہوگا۔ یہ قبریں اوپر سے اس طرح جڑی ہوئی تھیں کہ سائبان سا بن گیا تھا۔ اب قبرستان میں تھوڑی سردی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں ان دونوں قبروں کے درمیان خلا میں گھس کر لیٹ گیا۔ اپنے بوٹ اتار کر میں نے تکیے کے طور پر اپنے سر کے نیچے رکھ لیے تھے۔ یہ عجیب رات تھی اور یہ سونا بھی عجیب سونا تھا۔ غنودگی کی حالت میں مجھے محسوس ہوا کہ دائیں طرف والی قبر سے کسی ادھیڑ عمر شخص کا ہاتھ نکلا ہے اور اس نے مجھے اپنی قبر کے اندر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد بائیں طرف والی قبر میں پراسرار حرکت محسوس ہوئی اور میری سماعت سے کسی عورت کی مدھم ہنسی کی آواز ٹکرائی۔ مجھے پتا تھا یہ سب میرے واہمے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد میں سو گیا لیکن میری یہ نیند زیادہ طویل نہیں تھی۔ شاید آدھ پون گھنٹا ہی گزرا ہوگا، اچانک میں جاگ گیا۔ مجھے پھر محسوس ہوا کہ کوئی مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس مرتبہ مجھے پہلو کی طرف سے نہیں بلکہ پاؤں کی طرف سے کھینچا جا رہا تھا...... اور یہ یقیناً وہم نہیں تھا۔ کوئی تھا وہاں...... جو مجھے کھینچ رہا تھا۔ غنودگی کی حالت میں مجھے یہی لگا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے۔

(جاری ہے)

رات کا مسافر

طاہر جاوید مغل

بے پروائی اور بے وقعتی کے سبب عہدِ حاضر کا انسان نہ تو اپنے قول کی پاسداری کرتا ہے اور نہ ہی اپنے فعل کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی کھیل اس کی زندگی کے ساتھ بھی کھیلا جا رہا تھا جس کے قول و فعل میں اگرچہ کوئی تضاد تو نہ تھا مگر اس کی زندگی ایک خاموش وعدے کے عوض گروی رکھ دی گئی تھی جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی ورنہ... بے وفائی کی صورت میں ویرانے اس کے منتظر تھے لیکن جس لمحے کا انتظار اس نے برسوں کیا... جب اس کی برسات میں بھیگنے کا وقت آیا تو تپتی دھوپ میں اس کے قدم صحرا کی جانب اٹھ گئے۔ جانے یہ اسی بھولے بسرے عہد سے منحرف ہونے کا نتیجہ تھا یا مقدر کی ستم ظریفی کہ کسی کے ہاتھوں کی مہندی اور سہرے کے پھولوں کی مہک بھی اس کے قدموں کو روک نہ سکی... اس نے منہ کیا پھیرا کہ خوابوں نے بھی آنکھوں سے رختِ سفر باندھ لیا... بے سمت بھٹکتے ہوئے اس لمبی مسافت میں اب اسے اجنبی چہروں کے سوا اور کیا ملنا تھا۔ تاریک رستوں پر اس کا ہم سفر بس ایک سایہ تھا جو آسیب کی مانند اسے ایک پل کے لیے بھی خود سے جدا نہ کرتا تھا، خدا جانے یہ محبتوں کی انتہا تھی یا نفرتوں کا انتقام... جو بھی تھا اسے زندگی سے دور جانا تھا، چاہے آگ کا دریا عبور کرتے ہوئے یا گرم صحرا پار کرتے ہوئے... ہر حال میں اس عہد کی پاسداری لازم تھی کہ جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی۔

منظورِ نظر کی نظروں میں رہنے کے لیے ایک اندھے راستے کا

زندہ ماجرا

دوسرا حصہ

میں نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اور پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے ایک صحت مند شخص کھڑا تھا۔ اسی نے مجھے گھسیٹ کر دونوں قبروں کے درمیانی خلا میں سے نکالا تھا۔ اب وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”کون ہو آپ؟“ میں نے اردو میں اس سے پوچھا۔

اس نے عربی میں جواب دیا۔ الفاظ تو میری سمجھ میں نہیں آئے۔ تاہم اندازہ ہوا کہ وہ بے حد حیران ہے کہ میں یہاں رات کے دو بجے دو قبروں کے درمیان گھر کر لیٹا ہوا ہوں۔

میں نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں کہا۔ ”میں پردیسی ہوں، مزار کے خادم نے مجھے اندر نہیں گھسنے دیا تھا۔ اس لیے قبرستان کی طرف چلا آیا۔“ میرے لہجے میں لرزش تھی۔

معلوم نہیں کہ میری کوئی بات اس باریش شخص کی سمجھ میں آئی یا نہیں۔ تاہم اس نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے جوتے پہنے اور اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس کی عمر ساٹھ پینسٹھ سے کم نہیں تھی۔ اس نے لمبا چغہ پہن رکھا تھا اور چہرہ پُروقار تھا۔ وہ مجھے سیدھا غوث پاک عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار پر لے گیا۔ مزار کا بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا تو وہی خادم باہر نکلا جس نے مجھے ڈانٹ پلائی تھی اور دروازہ نہیں کھولا تھا۔ میں نے چغے والے کو اشاروں کنایوں میں بتایا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے مجھے قبروں میں لیٹنے پر مجبور کیا۔

چغے والا شخص سمجھ گیا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس نے خادم سے بڑے بارعب انداز میں بات کی بلکہ یوں لگا کہ وہ اسے ڈانٹ رہا ہے۔ خادم سر جھکائے کھڑا تھا۔ چغے والا

باریش شخص مجھے اندر مزار کے احاطے میں لے آیا اور پھر ہم ایک برآمدے میں سے گزر کر ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ اسی خادم خاص کا کمرا ہے جس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف لکڑی کی بڑی سی الماری تھی جس میں کتابیں اور قرآن پاک کے نسخے رکھے تھے۔ بائیں جانب ایک پلنگ پر آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا۔ شیشے کی تپائی پر واٹر کولر پڑا تھا۔ دائیں طرف دیوار پر موٹے دانوں والی ایک بڑی تسبیح جھول رہی تھی۔

مجھے شدید حیرت ہوئی جب چغے والے شخص نے مجھے اپنے جوتے اتارنے اور خادم خاص کے بستر پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ میں پہلے تو جھجکتا رہا پھر اس ہدایت پر عمل کیا۔ خادم خاص شرمسار سا کھڑا تھا۔ مجھ پر حیرت کا دوسرا شدید حملہ اس وقت ہوا جب پینتالیس پچاس سالہ خادم خاص نے اردو میں مجھ سے پوچھا۔ ''کیا تم اردو جانتے ہو؟''

میں نے فوراً ''ہاں'' میں جواب دیا۔

وہ بولا۔ ''حضرت کا حکم ہے کہ تم یہاں آرام سے لیٹو۔ تم ہمارے مہمان ہو۔'' حضرت سے اس کی مراد وہی خاکی چغے والے بزرگ تھے۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، بزرگ نے شفقت سے میرا شانہ تھپکا۔ عربی میں تسلی تشفی کے بول بولے اور چل دیے لیکن باہر نکلنے کے فوراً بعد ہی دوبارہ اندر آگئے۔ انہوں نے خادم خاص سے کچھ کہا۔ خادم خاص نے ترجمان کے فرائض انجام دیتے ہوئے اردو میں مجھ سے پوچھا۔ ''کیا تم نے کھانا وغیرہ کھایا ہے؟''

میں نے سچ بولتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

چغے والے بزرگ فوراً باہر چلے گئے۔ دس پندرہ منٹ بعد لوٹے تو ان کے ہاتھوں میں ایک گول ٹرے تھی اور اس میں میرے لیے کھانا تھا۔ چار مٹن تکے کی سیخیں، ایک خمیری روٹی اور کوئی پاؤ بھر کھجوریں۔ انہوں نے بڑی شفقت سے مجھے کھانا کھلایا۔ اسی دوران میں ایک خادم بغدادی قہوہ لے آیا۔ مجھے کھلا پلا کر وہ بزرگ رخصت ہوگئے۔ میں حیران پریشان بستر پر بیٹھا رہ گیا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ کہاں یہ کہ مجھے گیٹ سے اندر گھسنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی اور کہاں یہ کہ میں خادم خاص کے کمرے میں اسی کے بستر پر براجمان تھا۔

میں نے خادم خاص سے پوچھا۔ ''آپ اردو کس طرح جانتے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''یہاں اکثر انڈیا اور پاکستان وغیرہ سے زائرین آتے ہیں۔ ان سے رابطے کے لیے ضروری تھا کہ ہم میں سے کسی ایک کو اردو کی سمجھ بوجھ ہو۔ میں نے ڈھائی تین سال میں کافی محنت سے تھوڑی بہت سیکھی ہے۔'' اس کے لہجے میں عربی کی جھلک تھی اور اکثر الفاظ کی ادائیگی بھی درست نہیں تھی۔

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''چلو اب تم سو جاؤ۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں، مجھے یہ مناسب نہیں لگ رہا۔ آپ میرے لیے نیچے کوئی کپڑا بچھا دیں۔ میں وہاں لیٹ جاؤں گا۔'' میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

خادم خاص نے مجھے زبردستی روکا اور مجبور کر دیا کہ میں بستر پر ہی لیٹوں...... میرے بہت منع کرنے کے باوجود اس نے خود قالین پر ایک گدا بچھا لیا۔

میں اس کایا کلپ پر ششدر تھا۔ رات کے دو بجے اس نامعلوم شخص نے مجھے کھینچ کر دونوں قبروں کے درمیان میں سے نکالا تھا اور پھر کھلا پلا کر اس شاندار بستر پر سلا دیا تھا۔ کون تھا وہ؟ اور کیسے مجھ تک پہنچا تھا؟ شاید یہ اس خاموش گریہ وزاری کا نتیجہ تھا جو میں نے ایک قبر کے کنارے بیٹھ کر مزار کی کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کی تھی......

میں نے خادم خاص سے پوچھا۔ ''یہ بزرگ کون تھے؟''

وہ ہولے سے مسکرایا اور بولا۔ ''صبح سب کچھ بتاؤں گا۔ اب سو جاؤ۔'' میں بے حد تھکا ہوا تھا۔ عجیب حالات کے باوجود جلد ہی سو گیا۔

میں اذانِ فجر کی دلکش آواز سے جاگا تھا۔ یہ اذان مزار سے ملحقہ مسجد سے بلند ہو رہی تھی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ مجھے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے بے حرکت لیٹے لیٹے غور کیا اور اندازہ ہوا کہ وہی خادم خاص جائے نماز پر بیٹھا رو رہا ہے۔ میں نے اس کے خشوع خضوع میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھا اور لیٹا رہا۔

کچھ دیر بعد ہم نے مزار کی وسیع و عریض مسجد میں نماز ادا کی اور دوبارہ کمرے میں آگئے۔ یہ کمرا ایک طرح سے اس خادم خاص کا حجرہ تھا۔ خادم خاص کا نام مجھے ابوسیاف معلوم ہوا۔ وہ عرصہ بیس سال سے خادم خاص کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کا تعلق بصرہ سے تھا۔ نماز کے بعد ابوسیاف نے باقاعدہ مجھ سے معافی مانگی اور کہا کہ اسے

اپنے رات والے سلوک پر افسوس ہے۔

میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ میں ایک ناچیز بندہ ہوں۔ آپ کو اللہ نے اتنا معتبر منصب دے رکھا ہے۔ آپ ایسی بات نہ کریں۔''

ابوسیاف نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔ ''دکھوں کے مارے معلوم ہوتے ہو۔ لگتا ہے بہت مصیبتیں اٹھا کر یہاں تک پہنچے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گا لیکن آپ بھی مجھے بتائیے کہ رات والے بزرگ کون تھے؟ وہ مجھے نماز میں تو نظر نہیں آئے۔''

ابوسیاف نے کہا۔ ''وہ کبھی کبھار ہی یہاں آتے ہیں۔ یہاں کے سب سے بڑے تین چار بزرگان میں سے ایک ہیں۔ انہیں حضرت عالی مقام کہا جاتا ہے۔''

اس سے پہلے کہ ہماری گفتگو کچھ مزید آگے بڑھتی، طالب علموں کا ایک گروہ اجازت لے کر اندر آگیا اور خادم خاص ابوسیاف ان سے گفتگو میں مصروف ہوگیا۔

میں نے وہ سارا دن مزار اور ملحقہ مسجد میں گھومتے پھرتے گزارا۔ ایک عجیب سا سکون اور روحانیت کا احساس تھا جو میرے رگ و پے میں بسا ہوا تھا۔ یہاں میں نے دیکھا کہ پردے اور ستر پوشی کا تصور کچھ اور طرح کا تھا۔ دن دس بجے کے قریب بہت سی عراقی خواتین مزار کے احاطے میں دکھائی دیں۔ اس وسیع احاطے میں اینٹوں کا فرش تھا۔ میں نے دو وقت کا کھانا خادم خاص ابوسیاف کے ساتھ ہی کھایا۔ بہرحال میں نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ آج میں اس کے بستر پر نہیں سوؤں گا۔ اگر مجھے زیادہ مجبور کیا گیا تو یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے یہ کسی طور گوارا نہیں تھا کہ مجھ سے بڑی عمر کا ایک شخص میرے قریب زمین پر سوئے اور میں اس کے بستر پر قبضہ جما کر لیٹوں۔ میں نے کھلی ہوا کا بہانہ بھی کیا اور عشا کے بعد مزار کے اینٹوں والے احاطے میں ایک دری بچھا لی اور تکیہ رکھ لیا۔ کئی اور افراد بھی وہاں شب بسری کے لیے موجود تھے۔

تاروں بھرے آسمان کے نیچے وہ رات سکون سے تو گزری لیکن یادیں بھی مسلسل حملہ آور ہوتی رہیں۔ ستاروں کو دیکھ کر میں نے سوچا یہی ستارے میرے گھر کے آسمان پر بھی چمک رہے ہوں گے اور دیکھ رہے ہوں گے کہ وہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ آج مجھے گھر سے نکلے کم و بیش پندرہ روز

باتوں سے خوشبو آئے

☆ زیادہ مت ہنسو کیونکہ جس دل کا رشتہ اور تعلق اللہ سے بندھ جاتا ہے وہ ہمیشہ پُرسکون اور باوقار رہتا ہے۔

☆ سننے والے کی ضرورت سے زیادہ بلند آواز میں گفتگو مت کرو کیونکہ یہ رعونت کا اظہار ہے۔

☆ دوست کا امتحان مصیبت میں، بیوی کا غربت میں اور مومن کا امتحان غصے میں ہوتا ہے۔

☆ آنکھ کا امتحان بازار میں، زبان کا محفل میں اور دل کا امتحان عشق میں ہوتا ہے۔

☆ ہاتھ کا امتحان کھانا کھانے میں اور انسان کا امتحان قبر میں ہوتا ہے۔

مرسلہ۔ عرفان جی سیال اینڈ قیصر اعوان، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

ہو چکے تھے لیکن لگتا تھا کہ یہ پندرہ سال کا وقت ہے۔ ان پندرہ دنوں یا پندرہ سالوں میں کون کون سے لوگ مجھ سے ملے اور بچھڑے تھے...... ان میں مہرو بھی تھی۔ وہ بھی اسی شہر بغداد میں کہیں رہنے کے لیے آئی تھی۔ میں نے ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ صحیح سلامت اپنے وارثوں کے پاس پہنچ گئی تھی۔

اگلے روز میں مزار اور مسجد کے گرد و نواح میں گھومتا رہا اور لوگوں کے رہن سہن کو دیکھتا رہا۔ میں نماز بڑی باقاعدگی سے ادا کر رہا تھا اور اس میں مجھے بہت سکون مل رہا تھا۔ میں نے ابوسیاف کو اپنے حالات سے تھوڑا بہت آگاہ تو کیا تھا لیکن تفصیل نہیں بتائی تھی۔

رات کو میں جب پھر دری اور چادر وغیرہ لے کر احاطے کی طرف جانے لگا تو ابوسیاف نے مجھے روکا اور کہا کہ آج بادل ہیں۔ رات کو بارش کا امکان ہے، میں کمرے میں ہی سو جاؤں لیکن مجھے باہر سونا ہی مناسب اور اچھا لگا۔ بہرحال رات کو وہی کچھ ہوا جس کا خطرہ ابوسیاف نے ظاہر کیا تھا۔ گیارہ بارہ بجے کا وقت ہوگا جب یکایک تیز بارش

ہونے لگی۔ صحن میں سونے والے ہم سب لوگ ہڑبڑا کر اٹھے اور برآمدوں کی طرف بھاگے۔ برآمدے تک پہنچتے پہنچتے میں بری طرح بھیگ گیا اور بستر بھی گیلا ہوگیا۔ وہیں برآمدے کے ایک کونے میں اپنا گیلا بستر بچھایا اور گیلے کپڑوں کے ساتھ لیٹ گیا۔ اپنی حالتِ زار پر خود ہی ترس آیا اور ساتھ ہی ان لمحوں میں اپنی ماں بھی بے طرح یاد آئی۔ انہوں نے بھی، چند منٹ بھی ہمیں گیلے کپڑوں کے ساتھ رہنے نہیں دیا تھا۔ دل بوجھل ہوگیا۔ یہ غریب الوطنی تھی اور اس غریب الوطنی نے ابھی پتا نہیں کیا کچھ دکھانا تھا۔

ہوا تیز تھی۔ بارش کی کوئی کوئی بوچھاڑ برآمدوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ میں ٹھٹھرتا رہا اور اونگھتا رہا۔ اچانک کسی نے میرا کندھا ہلایا اور اٹھنے کو کہا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہی پہلے روز والے بزرگ میرے قریب بیٹھے تھے۔ انہوں نے میری کمر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور مجھے اٹھا کر خادمِ خاص کے حجرے میں لے آئے۔

خادمِ خاص ابوسیاف ایک بار پھر شرمندہ شرمندہ نظر آنے لگا تھا۔ بہرحال میں نے اسی کے ذریعے حضرت عالی مقام تک یہ بات پہنچائی کہ ابوسیاف نے بہت اصرار کیا تھا لیکن میں نے اس کی بات نہیں مانی اور اپنی مرضی سے صحن میں سو گیا۔

وہ بڑی طوفانی شب تھی۔ حجرے سے باہر مزار کا صحن بھی نظر آتا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی اور بادل گرج رہے تھے۔ موسلا دھار بارش جاری تھی۔ ابوسیاف نے مجھے اپنے کپڑے پہنا دیے تھے اور میں نے اپنے کپڑے حجرے میں ہی ایک طرف پھیلا دیے تھے۔ بادوباراں کی اس شب میں حجرے کی تنہائی کے اندر میرے اور حضرت عالی مقام کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس میں ابوسیاف نے ترجمان کے فرائض انجام دیے۔

یہ گفتگو کچھ اس طرح تھی۔ جناب عالی مقام نے مجھ سے سوال کیا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں اور اس دربدری کی حالت میں کیوں پھر رہا ہوں؟

ان کے شفقت بھرے لہجے نے میری آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔ میں نے کہا۔ ''یا حضرت! آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''پوچھو بیٹا۔'' انہوں نے میری کمر پر ہاتھ پھیرا۔

میں نے کہا۔ ''یا حضرت! کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ بندہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھے اور جاگتی آنکھوں کا وہ خواب اتنا واضح ہو کہ حقیقت اور تصور میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے؟''

انہوں نے گہری سانس لی۔ ''ایسا ناممکن نہیں ہے۔ انسان کا ذہن قدرت کے عظیم معجزوں میں سے ہے۔ ذہن کا پیدا کیا ہوا تخیل کبھی کبھی ٹھوس حقیقتوں سے بھی بڑھ کر حقیقی ہو جاتا ہے۔ یہ تخیل ہمیں ماضی یا مستقبل میں بہت دور تک لے کر چلا جاتا ہے لیکن تم تفصیل بتاؤ گے تو پھر بات کھلے گی۔''

میں نے آنسو پونچھتے ہوئے، کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بجلی کی چمک میں بارش کی موسلا دھار بوچھاڑیں ایک سیکنڈ کو جھلک دکھا کر پھر تاریکی میں اوجھل ہو جاتی تھیں اور بغداد کے آسمان پر بادل دہاڑنے لگتے تھے۔

میں نے کہا۔ ''یا حضرت...... میری شادی ہو رہی تھی۔ وہ میری مہندی کی رات تھی۔ میں گھر میں اکیلا تھا...... اچانک میں نے اپنے کمرے میں کسی کو دیکھا...... جی حضرت! میں نے اسے جاگتی آنکھوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ بالکل سفید کپڑوں میں مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ مجھے لگا کہ میں اٹھ کر ہاتھ بڑھاؤں تو اسے چھو سکتا ہوں۔ میں پھر کہوں گا حضرت کہ میں غنودگی کی حالت میں ضرور تھا لیکن جاگ رہا تھا۔ وہ بولا تو اس کے الفاظ ایسے ہی میری سماعت سے ٹکرائے جس طرح میرے الفاظ اب آپ کی سماعت مبارک سے ٹکرا رہے ہیں۔ اس نے میرا نام لیا اور کہا۔ ''کم از کم ایک بھوکے کو کھانا کھلانا تھا اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی...... یہ کہہ کر وہ چلا گیا لیکن اس کے یہ الفاظ جیسے میرے سینے میں پیوست ہو کر رہ گئے یا حضرت...... میرے دل کے اندر کہیں کھلبلی سی مچ گئی...... اور مجھے یوں لگا جیسے کچھ ہونے والا ہے، کچھ بہت برا، اور پھر میری شادی کی رات یہ ''بہت برا'' میرے سامنے آ گیا یا حضرت!''

میری آواز بھرا گئی اور میں چند لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

حضرت عالی مقام نے پھر میری پشت پر تسلی آمیز انداز میں ہاتھ پھیرا اور مجھے بات جاری رکھنے کی ہدایت کی...... میں نے آبدیدہ لہجے میں انہیں شادی کی رات کا وہ واقعہ بتایا جب میں نے شامیانے کے پاس سے گزرتے ہوئے محلے کی دو عورتوں کو اپنے بارے میں باتیں کرتے سنا اور پتا نہیں کیوں میرے اندر کی ساری روشنیاں ایک گھٹاٹوپ اندھیرے میں بدل گئی تھیں۔ میں بے حد کوشش کے باوجود اپنے لیے یا اپنی دلہن کے لیے اس اندھیرے میں سے روشنی کی ایک کرن بھی نہیں ڈھونڈ سکا تھا اور سب

کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے جگمگاتے گھر میں سے نکل آیا تھا۔

میری پوری روداد سننے کے بعد حضرت عالی مقام خاموش ہو گئے۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ان کا سر جھکا ہوا تھا اور لمبی ڈاڑھی سینے کو چھو رہی تھی...... کافی دیر چپ رہنے کے بعد انہوں نے ابوسیاف کی وساطت سے مجھ سے کہا۔ ''بیٹا...... مجھے یہ صدقہ، خیرات اور خداترسی میں کمی کا کوئی معاملہ لگتا ہے۔ کہیں کوئی کوتاہی ہوئی ہے...... ہاں...... کہیں ہوئی ہے...... جس کی وجہ سے تم پر یہ مشکل آئی ہے۔''

وہ چند سیکنڈ خاموش رہے، پھر دوبارہ عربی میں بولے جس کا ترجمہ کرتے ہوئے ابوسیاف نے مجھ سے کہا۔ ''حضرت کہتے ہیں کہ کیا وہاں پاکستان میں تمہاری مالی حالت اچھی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''جی ہاں...... اللہ کا شکر ہے، آسانی سے گزر بسر ہوتی ہے۔''

حضرت عالی مقام نے کہا۔ ''کہیں تم صدقہ خیرات وغیرہ کی طرف سے غافل تو نہیں ہو؟''

میں نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''نہیں حضرت! ہمارا گھرانا الحمدللہ مذہبی ہے۔ ہم اپنی استطاعت کے مطابق ہمیشہ کچھ نہ کچھ خیر خیرات نکالتے ہیں۔ میرے پڑدادا تو اس سلسلے میں خاصی شہرت رکھتے تھے۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ ہمارے پڑدادا کے گھر میں ہمیشہ لنگر کا اہتمام ہوتا تھا۔ مستحق افراد اس لنگر سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ میرے دادا کا بھی ایسا ہی وتیرہ تھا۔ جب ہم بہت چھوٹے تھے اور ایک دوسرے علاقے میں رہتے تھے، دادا جی اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے، جب تک قریبی مسجد کے نابینا حافظ جی کو کھانا نہیں بھیج دیتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا۔ پھر حافظ جی وفات پا گئے تو دادا جی نے ایک قریبی مدرسے میں کھانا بھجوانا شروع کر دیا۔ وہ تینوں وقت باقاعدگی سے وہاں کھانا بھیجتے تھے۔ دادا جی کے انتقال کے بعد والد صاحب نے یہ نیک سلسلہ جاری رکھا۔ ہر روز صبح دوپہر اور شام مدرسے میں کھانا بھجوایا جاتا تھا۔ بعد میں جب ہم نے رہائش تبدیل کر لی تو والد صاحب نے یہ کام میرے ذمے لگایا کہ میں ہر روز شام کو پکا ہوا کھانا مدرسے میں پہنچایا کروں۔''

''تم نے یہ کام جاری رکھا؟'' حضرت عالی مقام نے پوچھا۔

''جی حضرت! دو تین سال میں مسلسل ہر روز مدرسے جاتا رہا لیکن فاصلہ زیادہ تھا، اس لیے میں نے والد صاحب کے مشورے سے مدرسے میں ماہانہ پیسے دینے شروع کر دیے۔''

''اب یہ پیسے دے رہے ہو؟'' حضرت عالی مقام نے پوچھا۔

''جی حضرت! اگر کسی ماہ کوتاہی ہو بھی جاتی ہے، تو اگلے ماہ یہ کمی پوری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں یا والد صاحب، خود جا کر پیسے دے آتے ہیں...... یا کسی بااعتماد ملازم کو بھیج دیتے ہیں۔''

حضرت عالی مقام ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ وہ جیسے کسی گہرے مراقبے میں چلے گئے تھے۔ تسبیح بڑے ہموار طریقے سے ان کی انگلیوں میں گردش کر رہی تھی۔ مزار کے صحن میں بارش کبھی دھیمی اور کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ کئی منٹ کے بعد حضرت عالی مقام بولے۔ ''اچھا، اب تم دونوں سو جاؤ۔ فجر میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔''

میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن ہمت نہیں ہوئی۔ وہ اٹھے اور بہت آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔ میں اور ابوسیاف ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میرے ذہن میں عجیب کھدبدی شروع ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگنے لگا تھا کہ کم از کم ایک بھوکے کو کھانا کھلانے والی بات اور میرے باپ دادا کے خیرات کرنے میں کوئی خاص تعلق ہے۔

اگلے روز عشا کے بعد میں، ابوسیاف اور حضرت عالی مقام پھر حجرے میں موجود تھے۔ آج بادل نہیں تھے لیکن موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ہمارے سامنے خوشبودار بغدادی قہوے کی پیالیاں پڑی تھیں۔ حضرت عالی مقام بول رہے تھے اور ابوسیاف اردو میں ان کی باتوں کا ترجمہ کر رہا تھا۔ عالی مقام کہہ رہے تھے۔ ''تم نے بتایا ہے کہ جب تمہارا گھر مدرسے کے پاس تھا...... تم مدرسے کے بچوں کو تینوں وقت کھانا دینے کے لیے جاتے تھے؟''

''جی حضرت! ایسا ہی تھا۔''

''کیا کبھی تمہارے والد نے نہیں بتایا کہ وہ اتنی باقاعدگی کے ساتھ کھانا کیوں بھجواتے ہیں؟''

''وہ بس یہی کہتے تھے حضرت...... کہ دادا ایسا کرتے تھے، اس لیے وہ بھی کرتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ یہ روٹین خراب ہو۔ ویسے بھی دادا کی طرح والد بھی نیکی کے کاموں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔''

''لیکن بیٹا! جب یہ کام تمہارے سپرد ہوا تو پھر اس کی وہ اہمیت تو نہ رہی۔''

''مم...... میں سمجھا نہیں حضرت۔''

''تم نے خود ہی بتایا ہے کہ پہلے تم نے مدرسے میں ایک وقت کا کھانا پہنچانا شروع کیا...... پھر فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے تم ماہانہ خرچہ بھجوانے لگے۔ پھر یہ ہوا کہ کبھی کبھی ماہانہ خرچہ بھی نہ دیا گیا...... ایسا ہوا ہے نا؟''

میرے جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ایسا ہوا ہے بلکہ اس سے زیادہ ہوا ہے جتنا میں نے حضرت عالی مقام کو بتایا ہے۔

عالی مقام ایک دم موضوع بدل کر بولے۔ ''کیا تمہارے پڑدادا اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے بیٹے تھے؟''

میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جی حضرت! میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہے۔''

''اور تمہارے دادا؟''

''جی حضرت! میری معلومات کے مطابق وہ بھی سب سے چھوٹے ہی تھے۔''

''اور والد؟''

میرے اندر حیرت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی حضرت! والد بھی دو بھائیوں میں چھوٹے ہیں...... اور...... اور میں بھی۔''

وہ ایک بار پھر جیسے کسی گہرے مراقبے میں چلے گئے تھے۔ ماتھے پر نور سا چمک رہا تھا۔ وہ ایک ایسے شخص کا ماتھا لگتا تھا جو دور، بہت دور تک دیکھ سکتا ہے۔ وہ بولے۔ ''غیب کا علم تو صرف خدائے ذوالجلال کو ہے لیکن اگر ہم ناچیز لوگ غور و فکر کریں تو وہ رب اپنی عظیم صفات میں سے ایک حقیر سا حصہ ہمیں بھی دے دیتا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے...... بلکہ یہ میرے دل کی گواہی ہے کہ تمہارے بزرگوں میں سے کسی نے ایک بہت اہم مقام پر کسی خاص کیفیت میں کوئی عہد کیا تھا...... اور اسے زندگی بھر...... بلکہ نسل در نسل نبھانے کا ارادہ بھی کیا تھا۔ عین ممکن ہے...... عین ممکن ہے کہ تمہارے پڑدادا ہی وہ شخص ہوں، انہوں نے زندگی بھر وہ عہد نبھایا اور پھر وہ عہد اپنے سب سے چھوٹے بیٹے یعنی تمہارے دادا کو منتقل کر دیا۔ تمہارے دادا نے یہ عہد تمہارے والد تک منتقل کیا...... اور پھر یہ تم تک آیا لیکن تم تک پہنچتے پہنچتے اس عہد کی شکل و صورت بدل گئی اور اس پر عمل کرنے والے کا ارادہ اور جذبہ بھی وہ نہ رہا۔ اگر دوسرے لفظوں میں کہا جائے کہ اس عہد کی خلاف ورزی ہو گئی تو غلط نہ ہوگا۔''

میں صم بکم یہ باتیں سن رہا تھا۔ عالی مقام خاموش ہوئے تو میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''یا حضرت...... یہ کس قسم کا عہد ہو سکتا ہے؟''

''میں ایک بار پھر کہوں گا کہ میں سو فیصد یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن یہ میرے دل کی گواہی ہے کہ گئے وقتوں میں کسی وقت شاید تمہارے پڑدادا نے کسی وجہ سے کسی متبرک مقام پر یہ منت مانی ہوگی کہ وہ زندگی بھر جب تک کسی ایک بھوکے کو کھانا نہیں کھلائیں گے خود کھانا نہیں کھائیں گے...... شاید تمہیں یہ بات اور یہ عہد معمولی لگے لیکن نہیں...... ایسے عہد معمولی نہیں ہوتے بیٹا! انسانی زندگی پر ان کے اثرات بہت گہرے اور طویل ہوتے ہیں۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کیے گئے ایسے عہدوں کو توڑا جائے تو ان کا وبال آتا ہے۔''

یقیناً ہماری یہ گفتگو مزید جاری رہتی لیکن اسی دوران میں کوئٹہ سے کچھ مہمان آ گئے جو عالی مقام سے ملنا چاہتے تھے۔ ان کی آمد کے بعد مجھے اور ابوسیاف کو حجرہ چھوڑنا پڑا۔ اس رات کو زیادہ تر حصہ میں نے بس جاگتے ہوئے گزارا۔ آنکھوں میں بار بار آنسو جمع ہوتے رہے۔ حضرت عالی مقام کی کچھ باتیں تو میری سمجھ میں آئی تھیں اور کچھ نہیں آئی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اعلیٰ حضرت نے مجھے میرا مسئلہ تو بتا دیا ہے لیکن اس کا حل نہیں بتایا۔ اگر وہ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا عالی مقام نے فرمایا تھا تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟ کیا کوئی کفارہ تھا جس کو ادا کرنے کے بعد میرے اندر کی ٹوٹ پھوٹ ختم ہو سکتی تھی؟

میں بڑی شدت سے اگلے دن کا انتظار کرتا رہا اور دل میں یہ امید پالتا رہا کہ کل پھر عالی مقام سے بات ہوگی اور وہ مجھے میری بے چینیوں کا کوئی حل بتائیں گے۔ کوئی ایسا راستہ جسے اختیار کرنے کے بعد میرے اندر پھیلی ہوئی گھٹاٹوپ تاریکی میں روشنی اور زندگی کی رمق نمودار ہو سکے۔

پتا نہیں کیوں میرا دھیان بار بار اپنی روزمرہ زندگی اور مذہبی معاملات کی طرف بھی جاتا تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ہمارے دادا، پڑدادا کے زمانے میں، ہمارے خاندان میں جتنی دین داری موجود تھی، وہ اب دکھائی نہیں دیتی تھی۔ خاص طور پر ہماری نئی نسل تو کافی حد تک اپنے بزرگوں کے راستے سے ہٹی ہوئی تھی۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں بھی ان میں شامل تھا۔ نماز کبھی پڑھ لی، کبھی نہ

پڑھی...... روزے آسان لگے تو رکھ لیے ورنہ چھوڑ دیے۔ کبھی والدہ نے سختی سے کہا تو قرآن پاک پڑھنا شروع کیا لیکن کچھ دنوں بعد پھر چھوڑ دیا۔ پتا نہیں یہی غفلت تھی جس کی وجہ سے مجھ سے وہ غفلت بھی ہوئی جس کا ذکر کل رات عالی مقام نے فرمایا تھا۔ میں ایک عہد شکنی کا سبب بن گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ کل عالی مقام نے جو کچھ کہا، وہ بچانوے فیصد سے زیادہ درست ہے۔ اب مجھے بھی تھوڑا تھوڑا یاد آرہا تھا کہ گھر میں ایک دوبار کوئی اس قسم کی بات ہوئی تھی۔ شاید والد صاحب نے والدہ کو کسی مستحق کے لیے کھانا پہنچانے کے حوالے سے تاکید کی تھی اور کہا تھا کہ ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے بڑوں کی روحوں کو تکلیف ہو......

میں نے رات تک عالی مقام کا انتظار کیا لیکن وہ نہیں آئے...... اگلا دن بھی ایسے ہی گزرا اور پھر اس سے اگلا دن بھی۔ رات کے وقت میں ابوسیاف کے سامنے بلک پڑا۔ میں نے کہا۔ ”عالی مقام کیوں نہیں آرہے؟ کہاں چلے گئے ہیں وہ؟“

ابوسیاف نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا ہارون کہ ان کا یہاں آنا جانا ان کی مرضی پر ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کل ہی آجائیں، ہوسکتا ہے کہ اگلے پندرہ بیس روز یا مہینے دو مہینے تک نظر نہ آئیں۔ اگر تم مجھ سے ان کے ٹھکانے کا پوچھنا چاہو گے تو بھی تمہیں مایوسی ہوگی۔ مجھے اس کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں۔“

میں نے ابوسیاف کو چچا سیاف کہنا شروع کردیا تھا لیکن میں یہ لفظ عربی میں ادا کرتا تھا۔ یعنی عم سیاف...... یا پھر ”یاعم“۔

میں نے کہا ”یاعم! آپ کا کیا خیال ہے۔ مجھ سے ایک خاص گناہ سمیت جو گناہ ہوئے ہیں، ان کے ازالے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

ابوسیاف نے نرم لہجے میں کہا۔ ”دیکھو ایک بہت بڑے معالج نے تم کو تمہارا مرض بتایا ہے لیکن اس مرض کا علاج تم اس معالج کے بجائے مجھ جیسے معمولی شاگرد پیشہ طبیب سے پوچھ رہے ہو۔ تمہیں کچھ دیر انتظار کرنا چاہیے۔“

میں انتظار کرتا رہا۔ عالی مقام تو پھر روضے یا مسجد میں تشریف نہیں لائے تاہم دوسرے یا تیسرے روز ابوسیاف نے مجھے ایک چھوٹی سی سفید پرچی دی۔ اس پر سبز روشنائی سے عربی کے چند الفاظ لکھے تھے۔ ابوسیاف نے مجھے بتایا۔ ”تمہارے لیے حضرت نے یہ پیغام بھیجا ہے۔“

میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ ابوسیاف نے ان الفاظ کا ترجمہ کرتے ہوئے پڑھا۔ ”مصیبت اپنے وقت پر ٹلتی ہے۔ تمہاری مصیبت بھی انشاء اللہ ضرور ختم ہوگی۔ صبر کا دامن تھامے رکھو۔ معافی مانگو اور نیکی کے راستے سے دور نہ جاؤ۔“

یہ حوصلہ افزا تحریر تھی لیکن اس میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو فوری طور پر میرے سکون کا باعث بنتی۔ اس تحریر میں حضرت نے ملاقات کی بھی کوئی نوید نہیں سنائی تھی۔ میں نے ابوسیاف سے یہ پرچی لے لی اور بڑے احترام سے اپنے کوٹ کی اوپری جیب میں رکھ لی۔ یاد رہے کہ چوبیس پچیس روز گزر جانے کے باوجود میرے جسم پر وہی میری شادی کی رات والا پینٹ کوٹ تھا۔ اب اس کی حالت ابتر ہوچکی تھی۔

☆☆☆

اگلے کئی روز میں نے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار اور مسجد کے اندر گزار دیے۔ میرے چہرے اور سر کے بال بڑھ چکے تھے۔ کوٹ پتلون مضحکہ خیز شکل اختیار کرچکے تھے۔ میں نے بوٹ اتار پھینکے تھے اور بازار سے ایک چپل خرید لی تھی۔ میں صبح سے ظہر کی اذان تک مزار کے گردونواح میں گھومتا رہتا۔ کبھی بازار سے روکھی سوکھی لے کر کھالیتا۔ کبھی مزار میں تقسیم کیے جانے والے کھانے سے پیٹ بھر لیتا۔ میرا حال فقیروں جیسا ہوتا جارہا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آرہی تھی کہ اگر واقعی مجھ پر کسی عہد شکنی کا وبال آیا ہے تو اس کا توڑ کیا ہوسکتا ہے۔ یہ وبال تو بدستور موجود تھا۔ میرے اندر بھی اندھیرا تھا۔ میں اب بھی واپسی کا نہیں آگے جانے کا سوچ رہا تھا۔

میرے پاس جو رقم موجود تھی، وہ دن بدن کم ہوتی جارہی تھی۔ مجھے فکر لاحق ہوئی۔ میں نے سوچا مجھے کہیں کوئی کام ڈھونڈنا چاہیے۔ کام کی تلاش میں، میں دن بھر مزار کے اردگرد کے بازاروں میں گھومتا رہتا۔ یہیں پر ایک حیدرآبادی شخص کی دکان تھی۔ اس کا نام عطاء اللہ تھا۔ عطا کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ عرصہ پچیس سال سے یہیں بغداد میں مقیم تھا...... اور اسلحہ مرمت کرنے کا کام کرتا تھا۔ بہت سی پرانی رائفلیں، توڑے دار بندوقیں، طمنچے اور جدید ریوالور پسٹل وغیرہ اس کی دکان کی دیواروں پر آویزاں تھے۔ وہ رائفلوں کے بیرل بنالیتا تھا اور لکڑی کے دستے وغیرہ بھی۔ میں چونکہ خود بھی ٹیکنیکل تھا، مجھے اس کے کام میں دلچسپی محسوس ہوتی تھی اور میں اس کی دکان کے پاس کھڑا اس

کا کام دیکھتا رہتا تھا۔ پھر کبھی کبھی میں اس کی اجازت سے اس کے پاس بھی بیٹھنے لگا۔ اس نے دو چار بار میرے لیے کھانا منگوایا اور قہوہ بھی پلایا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اسے مجھ سے ہمدردی محسوس ہونے لگی ہے۔ میں نے یہ بات بڑی اچھی طرح نوٹ کی تھی کہ اجنبی لوگ بہت جلد مجھ سے ہمدردی محسوس کرنے لگتے تھے اور ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ میرے لیے کچھ کریں۔ ایک دن میں نے کہا۔ ”عطا صاحب! آپ مجھے کوئی کام دے دیں۔ میں ہر طرح کا کام کرلوں گا۔“

انہوں نے کہا۔ ”تم دیکھ ہی رہے ہو ہارون! ورکشاپ میں میرے ملازم پورے ہیں۔“

دو روز بعد عجیب اتفاق ہوا۔ میں عطا صاحب کے پاس بیٹھا انہیں کام کرتے دیکھ رہا تھا کہ اندر سے چلّانے کی آوازیں آئیں، ہم بھاگم بھاگ اندر پہنچے۔ ایک ملازم کی قمیص کو آگ لگی ہوئی تھی۔ دھات کو گرم کرنے والا ایک اسٹوو پھٹ گیا تھا۔ ہم نے بہ مشکل آگ بجھائی، کاریگر لڑکے کی دونوں کلائیاں بری طرح زخمی ہوئی تھیں۔ لوگ اسے طبی امداد کے لیے فوراً اسپتال لے گئے۔

شام کو عطا صاحب کچھ دیر تک گم صم سے میری طرف دیکھتے رہے، پھر ہولے سے بولے۔ ”اگر تم کام کرنا چاہتے ہو تو کل سے آجانا۔“

میں نے آبدیدہ ہوکر کہا۔ ”عطا صاحب! میں کام تو چاہتا تھا لیکن اس طرح سے نہیں۔ مجھے اس حادثے کا بڑا افسوس ہے۔“

”بس یہ اللہ کے کام ہوتے ہیں، وہی ان کی حکمت جانتا ہے۔“ عطا صاحب نے کہا اور مجھے اگلے روز آنے کی تاکید کی۔

اگلے روز میں غوث پاک کے مزار سے قریباً چار میل پیدل چلنے کے بعد عطا صاحب کی ورکشاپ پر پہنچا۔ عطا صاحب نے مجھے پہلے دن جو کام سونپا، وہ آری سے لوہا کاٹنے کا تھا۔ میں نے آری کے دندانے درست کیے اور دوپہر تک اتنی تیزی سے لوہا کاٹا کہ وہ حیران رہ گئے۔ نہ صرف وہ خود حیران ہوئے بلکہ انہوں نے اپنے تین چار پڑوسی دکانداروں کو بھی بلا کر میرا کام دکھایا۔

شام کو میں خوشگوار موڈ میں واپس مزار پر پہنچا۔ وہاں پر موجود خادم خاص ابوسیاف تو میرا خیرخواہ تھا ہی، مزار کے کئی خدمت گار ملنگ بھی دوستوں کی طرح ہوگئے تھے۔ میں نے انہیں جب خبر سنائی کہ مجھے کام مل گیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ میں اپنے پہلے دن کی ”کمائی“ سے کچھ مٹھائی لے آیا تھا۔ انہوں نے چائے بنائی اور ابوسیاف سمیت ہم سب نے برآمدے میں بیٹھ کر چائے پی۔

عطاء اللہ میرے کام سے بہت خوش تھا۔ ایک دن وہ مجھے اپنی بیوی سے ملانے اپنے گھر لے گیا۔ سورج ڈوبتے ہی ورکشاپ بند ہوجاتی تھی۔ عطاء اللہ نے مجھے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھایا اور لے کر چل دیا۔ ہم مختلف سڑکوں سے گزرنے کے بعد دریائے دجلہ کے کنارے پہنچے۔ شام نے رنگ بکھیر رکھے تھے اور دجلہ میں تفریحی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ ہم کنارے کی ایک گنجان بستی میں پہنچے۔ یہ پرانا شہر تھا۔ تنگ گلیاں، اینٹوں اور مٹی کے گھر، کھجوروں کے جھنڈ۔ مجھے لگا کہ میں نسیم حجازی کے ناول آخری چٹان کے دور میں پہنچ گیا ہوں۔ خدا خدا کرکے عطاء اللہ کا گھر آیا۔ یہ پانچ چھ مرلے کا گھر ڈبل اسٹوری تھا اور اردگرد کے مکانوں سے کافی اچھا تھا۔ یہ علاقہ بھی کچھ بہتر تھا۔

ہم اندر داخل ہوئے۔ صحن میں پہنچے تو میں دم بخود کھڑا رہ گیا۔ اگر میرے سر پر ایک وزنی بم پھٹ جاتا تو شاید تب بھی مجھے اتنا شاک نہ لگتا، جتنا اپنے سامنے بیٹھے جعفر کو دیکھ کر لگا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھا تھا، اس نے اپنی زخمی ٹانگ اٹھا کر ایک دوسری کرسی پر رکھی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل چاہا کہ واپس مڑ جاؤں لیکن اب یہ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی دوران میں سیڑھیوں پر سے ایک کھنکتی ہوئی سی آواز آئی۔ یہ مہرو تھی، جو ایک چھوٹی ٹرے میں چائے لیے نیچے اتر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اور پہچان کر وہ بھی بری طرح ٹھٹک گئی۔ غالباً ٹرے اس کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی تھی۔

”آپ ایک دوسرے کو پہچانتے ہو؟“ عطا صاحب نے پوچھا۔ ان کا اشارہ میرے اور جعفر کی طرف تھا۔

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اثبات میں سر ہلایا۔ مہرو جلدی سے واپس جاچکی تھی۔ جعفر نے خود کو حیرت کے شدید حملے سے سنبھال لیا تھا۔ اس نے عطا صاحب سے مخاطب ہوکر عربی میں کچھ پوچھا۔ غالباً میرے بارے میں ہی پوچھا تھا کہ میں یہاں کیسے ہوں؟ عطا صاحب نے جواب میں تفصیل سے آگاہ کردیا۔

پانچ دس منٹ بعد ساری صورتِ حال واضح ہوچکی تھی۔ جعفر جان چکا تھا کہ میں یہاں کیسے پہنچا ہوں اور میں بھی جان چکا تھا کہ یہ دراصل جعفر ہی کا گھر ہے۔ پچیس چھبیس برس پہلے عطا جب بالکل نوجوان تھے، وہ یہاں جعفر

اور مہرو کے والد کے شاگرد کے طور پر کام کرتے تھے۔ بعد میں جعفر اور مہرو کے والد تو مہرو سمیت پاکستان واپس چلے گئے لیکن عطا صاحب یہیں پر رہے۔ وہ مہرو کی والدہ حبیبہ بیگم کو اپنی ماں اور جعفر کو چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتے تھے۔ اب عطا صاحب شادی شدہ تھے اور ان کی اپنی ماشاء اللہ تین بیٹیاں بھی تھیں۔ وہ تینوں نوجوان تھیں اور اسی گھر میں اپنی مقامی والدہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ بالائی کمروں سے ان کے چہکارنے کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ یہ ایک زبردست اتفاق تھا کہ میں کام ڈھونڈتے ڈھونڈتے عطا صاحب کی ورکشاپ تک پہنچا...... اور پھر وہاں سے جعفر اور مہرو کے گھر آگیا۔ شاید ہماری زندگی ایسے ہی خوشگوار اور ناخوشگوار اتفاقات کا مجموعہ ہے۔

جعفر کے چہرے پر حسب معمول گہری سنجیدگی تھی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھے بتایا۔ ”میری پنڈلی کی ہڈی میں ایک باریک فریکچر ہے۔ اس کے علاوہ زخم بھی ہے۔ دونوں چیزوں کا علاج ہو رہا ہے۔ مجھے کل پھر سٹی سینٹر کے اسپتال میں چیک اپ کے لیے جانا ہے۔“ میں نے اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار بھی کیا۔ اسی دوران میں عطا صاحب کی عراقی بیوی اور ان کی تینوں بچیاں بھی آگئیں۔ لگتا تھا کہ وہ آزادی کے ماحول میں پلی بڑھی ہیں۔ ٹوٹی پھوٹی اردو بھی بول لیتی تھیں کیونکہ باپ اردو بولتا تھا۔ وہ بے تکلفی سے باتیں کرتی رہیں۔ ان کی والدہ بھی مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ عطا صاحب نے کہا۔ ”یہ ایک تو تمہارے قیمتی سوٹ کی خستہ حالی سے حیران ہے۔ دوسرے اس بات پر بھی حیران ہے کہ تم نے جتنا لوہا کاٹنے میں تین گھنٹے لگائے ہمارے کاریگر اتنا لوہا کاٹنے میں نو دس گھنٹے لگاتے ہیں۔“

پروگرام کے مطابق مجھے رات وہیں ٹھہرنا تھا۔ میرے لیے گھر کا بیٹھک نما کمرا کھلوا دیا گیا۔ اس ہوادار کمرے سے دریائے دجلہ کی جھلک نظر آتی تھی۔ مجھے اچھا کھانا کھلایا گیا اور پوری مہمان نوازی کی گئی لیکن مہرو مجھے نظر نہیں آئی۔ شاید وہ اپنے بھائی جعفر سے ڈرتی تھی......

میرا یہ اندازہ درست نکلا۔ اگلے روز جعفر صبح سویرے اپنے کسی دوست کے ساتھ اسپتال جانے کے لیے نکل گیا۔ اسے اب شام کو ہی واپس آنا تھا۔ ورکشاپ سے چونکہ آج چھٹی تھی اس لیے مجھے اور عطا صاحب کو گھر میں ہی رہنا تھا۔ میرا ناشتا مہرو ہی لے کر آئی۔ اس نے مجھے بڑے ادب سے سلام کیا اور ناشتا میز پر رکھ کر کسی خادمہ کی طرح ایک طرف کھڑی ہوگئی۔

میں نے اسے ڈانٹا۔ ”یہ کیا حرکت ہے مہرو۔ مجھے اتنی عزت مت دو کہ مجھے مذاق لگنے لگے۔ پلیز بیٹھ جاؤ۔“

وہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی اور اپنے معصوم انداز میں باتیں کرنے لگی۔ ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ اس نے پوچھا کہ میں نے بریانی پکائی تھی یا نہیں؟

میں نے کہا۔ ”پکا بھی لیتا تو تمہارے بغیر کیسے کھاتا؟“

وہ ہنس دی۔ ہنستے ہوئے اس کی ناک کی وزنی نتھلی بھی ہنستی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بولی۔ ”بابو سائیں! یہ آپ نے اپنا کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ کیا آپ مزار کے ملنگ بننا چاہ رہے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”حالات تو ایسے ہی ہیں کہ مجھے ملنگ بن جانا چاہیے۔“

”اللہ سائیں نہ کرے کہ ایسا ہو۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”آپ اتاریں یہ کپڑے۔ میں آپ کو دوسرے کپڑے دیتی ہوں۔ ان کو مشین سے دھو دیتی ہوں۔ ایک دم ٹھیک ہو جائیں گے۔“

میرے بہت منع کرنے کے باوجود وہ نہیں مانی۔ اندر سے شاید عطا صاحب کا کوئی جوڑا لے آئی اور میرا پتلون کوٹ دھلوانے کے لیے لے گئی۔

عطا صاحب لمبی تان کر سو رہے تھے۔ ان کی تینوں تیز طرار بیٹیاں میرے اردگرد جمع تھیں۔ میں ان کے لیے جیسے کوئی تماشے کی چیز تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔ ”باجی مہرو...... آپ کی بہت تعریفیں کرتی ہے۔ کہتی ہے کہ آپ ایک لڑکے بھی ہیں اور بزرگ بھی ہیں یعنی لڑکے بزرگ۔ وہ ایسا کیوں کہتی ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”یہ تو وہی بتا سکتی ہے۔“

ایک نے بے باکی سے کہا۔ ”ویسے اگر آپ کا کبھی دوسری شادی کا پروگرام بن جائے تو مہرو کو ضرور بتایئے گا۔ وہ فوراً تیار ہو جائے گی......“

”جعفر ماموں روڑا اٹکا دیں تو اور بات ہے۔“ سب سے بڑی نے کہا۔ تینوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

شام تک مہرو نے میرا کوٹ پتلون بڑی اچھی حالت میں مجھے لوٹا دیا۔ اس نے خود استری کی تھی اور میری چپل تک پالش کر ڈالی تھی۔

شام کو جعفر واپس آگیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح گہرے سنجیدہ موڈ میں تھا۔ میں نے ابھی تک اسے مسکراتے نہیں

دیکھا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں گیا اور مجھے بھی وہاں بلا لیا۔ میز پر قہوے کی دو پیالیاں رکھی تھیں۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا اور پہلی بار میرا نام لے کر مجھے مخاطب کیا۔ کہنے لگا۔ ”ہارون! میں نے زندگی میں کبھی کسی کا احسان خود پر نہیں رکھا...... اور میں سمجھتا ہوں کہ تم نے مجھ پر دو بڑے احسان کر رکھے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں جعفر صاحب؟“

وہ عربی آمیز شکستہ اردو میں بولا۔ ”نفتان بارڈر پر تم نے بڑی سمجھداری سے شکنجے میں سے میرا پاؤں نکالا...... اور میں سمجھتا ہوں کہ تم ایسا نہ کرتے تو میں اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ زیادہ خون بہنے سے کوئی مزید نقصان ہو جاتا۔“

میں نے کچھ بولنا چاہا لیکن اس نے مجھے بولنے کا موقع نہیں دیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے میری بہن کی حفاظت کی اور کئی دن تک بڑی نیک نیتی سے اسے اپنی پناہ میں رکھا۔ میں اس کے لیے بھی تمہارا احسان مند ہوں۔ مجھے بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”آپ نے میرے ساتھ محبت سے بات کی، میرے لیے یہی بڑی بات ہے۔ باقی میں نے جو کچھ کیا، وہ میرے اخلاقی فرائض کے......“

”یہ گھسی پٹی باتیں چھوڑو۔“ اس نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ”میں صاف سیدھی بات کرنے کا عادی ہوں ہارون! اور میں نے تمہیں بتایا ہے کہ مجھے احسان اپنے سر پر رکھنا اچھا نہیں لگتا۔ مجھے بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

وہ بڑا ٹیڑھا بندہ تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ کچھ دیر توقف کر کے میں نے کہا۔ ”جعفر صاحب! فی الحال تو میری کوئی حاجت اور ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو آپ کے اصرار کی وجہ سے میں آپ سے ضرور شیئر کروں گا۔“

”اور میں بھی وعدہ کرتا ہوں کہ میری پوری کوشش ہوگی کہ تمہارے کام آسکوں...... لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے ایک اور بات بھی کہنا ہے۔“

”جی فرمائیں۔“ میں نے کہا۔

وہ اپنے گھنگرالے بالوں میں انگلیاں پھیر کر بولا۔ ”میں زیادہ میل جول پسند نہیں کرتا۔ میرا مطلب ہے کہ مجھے اپنی فیملی کے ساتھ تنہا رہنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ بے شک تم ایک قابلِ اعتبار شخص ہو لیکن میں اپنے مخصوص مزاج کی بات کر رہا ہوں۔ میں چاہوں گا کہ آئندہ اگر ہماری کوئی ملاقات ہو تو وہ ورکشاپ پر ہو یا پھر کہیں بھی گھر سے باہر ہو۔“

”جعفر صاحب! یقین کریں، مجھے یہاں خود بھی ”آک ورڈ“ سا لگ رہا ہے۔ میں آپ کی بات سے پوری طرح متفق ہوں بلکہ اگر آپ اجازت دیں تو میں صبح کے بجائے ابھی واپس جانا پسند کروں گا۔ ویسے بھی مزار پر ابوسیاف وغیرہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

جعفر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”جیسے تمہاری مرضی۔“

میں نے سونے کے بجائے روانگی کا ارادہ کیا تو مہرو اور دیگر لڑکیاں حیران نظر آنے لگیں۔ بہرحال جعفر کی موجودگی میں کسی کی یہ ہمت نہیں ہوئی کہ مجھ سے کچھ پوچھتیں۔ مہرو واضح طور پر پریشان نظر آئی۔ اس نے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن بول نہیں سکی۔ وہ آئینے کی طرح شفاف لڑکی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کو مجھ سے جو لگاؤ ہے، اس میں ایک ذرا سی بھی آلائش نہیں ہے۔

رات کے دس بجے تھے۔ بغداد کے گلی کوچوں میں تاحال رونق تھی۔ کسی کسی چائے خانے سے عربی موسیقی بلند ہو رہی تھی۔ میں روشن روشن دکانوں کے درمیان پیدل ہی چل پڑا۔ میرا رخ دریا کی طرف تھا۔ اچانک مجھے لگا جیسے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ یہ ایک درمیانے قد کا شخص تھا۔ اس نے مقامی انداز کا چغہ پہن رکھا تھا۔ سر پر عربی انداز کا سرخ ڈبی دار رومال تھا۔ اپنے شک کی حقیقت جانچنے کے لیے میں ایک دکان پر رکا۔ وہ شخص بھی مجھ سے چند قدم آگے جا کر ایک جنرل اسٹور پر رک گیا...... اور یونہی اشیا کا جائزہ لینے لگا۔ وہ جواں سال ہی لگتا تھا۔ میں ابھی ٹھیک سے اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا تاہم مجھے محسوس ہوا تھا کہ شاید وہ عربی نہیں ہے۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ وہ شخص میرے ساتھ ساتھ آ رہا ہے۔ ذہن میں کئی اندیشے سر اٹھانے لگے۔ کوئی جرائم پیشہ؟ خفیہ پولیس کا کوئی بندہ جو ایک اجنبی کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا؟ یا پھر کوئی ایسا شخص جسے جعفر نے میرے پیچھے لگا دیا تھا؟

میں مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا اب دریائے دجلہ کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ دریا کے کنارے اب اِکّا دُکّا افراد ہی نظر آتے تھے۔ میں بے خوف آگے بڑھتا رہا اور نسبتاً الگ تھلگ کنارے پر چلا گیا۔

یہاں پانی میں چند کشتیاں اور موٹر بوٹس کنارے سے بندھی ہوئی تھیں اور ڈول رہی تھیں۔ کئی بوٹس کے اگلے حصے پانی سے باہر ریت پر چڑھے ہوئے تھے۔ اردگرد کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا۔ وہ شخص کچھ فاصلہ رکھ کر مسلسل میرے پیچھے آرہا تھا۔ میں ایک بڑی بوٹ کی اوٹ میں کھڑا ہوگیا۔ ڈیڑھ دو منٹ بعد مدھم چاندنی میں اس شخص کا ہیولا نظر آیا۔ وہ پریشانی سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی شکل دیکھی...... وہ سندھی یا بلوچی نوجوان تھا۔

''میں یہاں ہوں۔'' میں نے اسے آواز دی۔

وہ جیسے اچھل پڑا۔ میں سائے سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ چند سیکنڈ تک ہم ایک ٹک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ عین ممکن تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ بھی ہو لیکن میں ہر خطرے سے بے نیاز تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھ سے کیا چاہیے تمہیں؟ کیوں پیچھے آرہے ہو میرے؟''

وہ اب سنبھل چکا تھا۔ حسب توقع اردو میں بولا۔ ''میں نے تم سے بات کرنی ہے۔''

''کرو بات۔''

اس نے اردگرد دیکھا۔ قریب ہی خشکی پر ایک پرانی موٹر بوٹ تھی۔ یہ نہ جانے کب سے دجلہ کی ریتیلی مٹی میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس ٹوٹی پھوٹی کشتی کے اندر نیم تاریکی تھی۔ وہ بھاری آواز میں بولا۔ ''یہاں کھڑے ہونا ٹھیک نہیں۔ چلو آؤ اس کے اندر بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے لگتا تھا جنہیں اپنی قوتِ بازو اور ہمت پر بھروسا ہوتا ہے۔ ویسے بھی وہ مضبوط اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے نشہ کیا ہوا ہے۔ بہرحال میں بھی ڈرنے والا نہیں تھا۔ میں اس کے ساتھ کشتی کے اندر آگیا۔ یہاں جالے لگے ہوئے تھے اور مردہ مچھلیوں کی ہلکی سی بو بھی تھی۔ ہم کاٹھ کباڑ کے قریب لکڑی کے ایک تختے پر بیٹھ گئے۔ میرے پاس ایک چھوٹی سی ٹارچ تھی، میں نے ٹارچ کی روشنی میں نووارد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی عمر تیئس چوبیس سال رہی ہوگی۔ رنگ گہرا گندمی تھا۔ چہرے کے نقوش موٹے تھے لیکن مجموعی طور پر وہ ٹھیک ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس کے لب ولہجے سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ سندھی ہے۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ یہ نشے میں ہونے کی علامتیں تھیں۔ بہرحال بعد میں پتا چلا کہ وہ نشے میں نہیں بلکہ تیز بخار میں تھا۔

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''کیا بے وقوفی کرتے ہو۔ ٹارچ بجھا دو۔ نہیں تو ابھی کوئی چوکیدار پہنچ جائے گا یہاں۔''

میں نے ٹارچ بجھا دی۔ وہ ترت بولا۔ ''جعفر سائیں اور مہرو سے کیا تعلق ہے تمہارا؟''

''تم یہ پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟'' میں نے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا۔

''صرف میری بات کا جواب دو۔ ورنہ میں یہاں تمہاری گردن بھی کاٹ سکتا ہوں۔'' وہ پھنکارا۔

میں نے کہا۔ ''تو پھر پہلے تم گردن ہی کاٹ لو۔ سوال جواب بعد میں کرلیں گے۔''

مجھے بے حد حیرت ہوئی جب اس نے اپنے لبادے کے نیچے سے واقعی ایک تیز دھار چاقو نکال لیا۔ بھنچے ہوئے لہجے میں دانت پیس کر بولا۔ ''میں جو کہتا ہوں وہ کر بھی دیتا ہوں۔ میرے سوال کا جواب دو۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں۔ اس کی یہ نیم دیوانگی میرے یا اس کے اپنے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے اپنے اندرونی طیش کو دباتے ہوئے کہا۔ ''میں جعفر صاحب کی ورکشاپ میں کام کرتا ہوں۔''

اس کے جسم پر لرزہ سا طاری ہوگیا۔ وہ بھنچی آواز میں بولا۔ ''اچھا تو...... میرا اندازہ درست ہے...... مہرو کے رشتے کی بات تم سے ہی ہو رہی ہے۔''

میں ٹپٹا گیا۔ ''پتا نہیں کیا کہہ رہے ہو تم؟ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔''

''لیکن میری سمجھ میں سب کچھ آرہا ہے۔'' وہ پھنکارا۔ ''وہ تم ہی ہو جو میری مہرو پر ڈاکا ڈالنے والے ہو۔ لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ کان کھول کر سن لو تم! وہ میری ہے۔ اسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔'' دیوانگی کے عالم میں اس نے چاقو کی تیز نوک میری گردن سے لگا دی۔

''لگتا ہے کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے......''

ابھی میرا فقرہ منہ میں ہی تھا کہ اس نے مشتعل ہو کر الٹے ہاتھ کی ضرب میرے چہرے پر لگانی چاہی۔ وہ مجھے ''انڈر اسٹیمیٹ'' کر رہا تھا اور اپنی طاقت کا بھی شاید غلط اندازہ لگا رہا تھا۔ میں نے نیچے جھک کر خود کو اس کے تھپڑ سے بچایا اور پھر ٹانگ کی ضرب سے اسے ایک دیوار کے ساتھ پٹخ دیا۔ چوبی دیوار سے ٹکرانے کے بعد وہ پھر میری

طرف لڑھکا۔ تیز دھار لمبے پھل والا چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور یہی چیز زیادہ خطرناک تھی۔ میں نے سب سے پہلے اس کی کلائی تھامی اور چاقو اس کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اسی کوشش میں ہم کشتی کے فرش پر گر پڑے۔ وہ کافی زور آور تھا۔ شاید بخار کی مدہوشی نے اس کی طاقت اور جرأت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اگلے ڈیڑھ دو منٹ تک میرے اور اس کے درمیان زبردست جدوجہد ہوئی۔ اس کے گھونسوں سے میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل گیا اور میری ضربات نے اس کا جبڑا اہلا دیا۔ میرے جسم پر تو کوٹ تھا لیکن اس کا چغہ تار تار ہو گیا تھا۔ آخر مجھے ایک موقع مل ہی گیا۔ چہرے پر میرے سر کی زوردار ٹکر کھا کر وہ ذرا ڈھیلا پڑا تو میں نے اس کا چاقو والا ہاتھ موڑ کر اس کی پشت سے لگا دیا۔ چاقو لکڑی کے فرش پر گرا اور واضح آواز آئی۔ چاقو گرنے کے بعد میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ قریباً ایک منٹ بعد وہ چاروں شانے چت میرے سامنے پڑا تھا۔ میرے گھونسوں سے بچنے کے لیے اس نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا رکھا تھا۔ میں نے اس کا چاقو اٹھا لیا اور اسے سر کے بالوں سے کھینچ کر لکڑی کے تختے پر بٹھا دیا۔ اس نے گردن ڈال رکھی تھی اور مسلسل خون تھوک رہا تھا۔

اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے میں نے ٹارچ روشن کی۔ اس کے سانولے چہرے پر دو تین جگہ گہری چوٹیں تھیں اور خون رس رہا تھا۔ نیچے والا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔

''کچھ اور ہاتھ پاؤں چلانے کی حسرت ہے تو نکال لو۔'' میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔

وہ بس ہانپتا رہا۔ اس کا چغہ اس کے بالائی جسم سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ ٹارچ کی روشنی اس کی توانا چھاتی پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ چھاتی کے علاوہ اس کے پورے جسم پر چھوٹے چھوٹے نشان نظر آرہے تھے۔ جیسے کسی گرم مہر سے جسم کو داغا گیا ہو۔ میں نے غور سے دیکھا اور میری حیرت انتہا کو پہنچ گئی۔ یہ ایک لفظ تھا جسے شاید گرم مہر سے جسم پر نقش کیا گیا تھا...... اور یہ لفظ تھا ''مہرو''۔ یہ صاف پڑھا جا رہا تھا۔

☆☆☆

قریباً دو گھنٹے بعد میں اس سندھی نوجوان کے ساتھ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار کے احاطے میں موجود تھا۔ خوشگوار ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ یہ رات کے ایک بجے کا عمل تھا، پہلی راتوں کا چاند مغرب کی طرف جھکا ہوا تھا۔

اس نوجوان نے اپنا نام ابراہیم بتایا تھا۔ دجلہ کے کنارے سے ہم ایک چھوٹی ٹیکسی میں بیٹھ کر مزار پر پہنچے تھے۔ راستے میں، میں نے ایک میڈیکل اسٹور سے ''پایوڈین'' لے کر ابراہیم کے چہرے کی چوٹوں پر لگائی تھی۔ ٹیکسی میں سفر کرنے کے لیے ابراہیم کے پھٹے ہوئے لبادے کو گرہیں دے کر باندھنا پڑا تھا۔

''اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' میں نے ابراہیم سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے بجھے بجھے لہجے میں جواب دیا۔

میری نگاہوں میں ابھی تک وہ بے شمار چھوٹے چھوٹے داغ گھوم رہے تھے جو ابراہیم کے برہنہ جسم پر نظر آئے تھے...... بہرحال ابھی میں یہ موضوع چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''جو کچھ ہوا اس میں تمہاری ہی غلطی زیادہ تھی لیکن اب تم مجھے اپنا دشمن نہیں دوست سمجھو اور جو معاملہ بھی تمہارے ساتھ ہے وہ مجھے صاف صاف بتاؤ۔ میں تمہاری مدد نہ بھی کرسکوں تو تمہیں کوئی ایسا مشورہ ضرور دے سکتا ہوں جو تمہیں فائدہ دے۔''

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''پہلے تم مجھے بتاؤ کہ اگر تم ورکشاپ کے وہ کاریگر نہیں ہو جس کے ساتھ جعفر اپنی بہن کی شادی کرنا چاہتا ہے...... تو پھر وہ کون ہے؟''

''میں ایک بار پھر خدا کو حاضر وناظر جان کر کہتا ہوں کہ مجھے اس کی کچھ خبر نہیں...... تمہاری طرح مجھے بھی یہاں بغداد میں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے اور ورکشاپ میں کام کرتے ہوئے تو صرف دو تین دن ہوئے ہیں۔''

''وہ ورکشاپ میں ''فورمین'' کرتا ہے۔''

میں نے ذہن پر زور دے کر کہا۔ ''فورمین تو ایک عراقی ہے۔ چوبیس پچیس سال عمر ہوگی۔ زبیر نام ہے شاید اس کا۔''

ایک دم میری نگاہوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ ابراہیم نے طیش میں ہاتھ چلایا۔ سامنے رکھے ہوئے قہوے کے برتن دور تک لڑھک گئے۔ میں ہکا بکا اس کی طرف دیکھنے لگا۔

☆☆☆

اس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے اور سر اپنے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں پر گھسا لیا۔ چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔ مزار کے احاطے میں موجود اِکا دُکا افراد نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔

''کیا ہوا ابراہیم؟'' میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

’’مجھے کچھ نہ بتاؤ، خدا کے لیے مجھے کچھ نہ بتاؤ اس کے بارے میں۔‘‘

’’کس کے بارے میں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’جس سے مہرو کی شادی کی بات ہو رہی ہے۔ میں اس کا نام نہیں سننا چاہتا، اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں جاننا چاہتا۔ یہ میرے بس میں ہی نہیں ہے......‘‘ اس نے اپنے بال مٹھی میں جکڑے اور فرطِ کرب سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

وہ جذباتی کیفیت میں تھا۔ میں نے کچھ دیر خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اس کی آنکھوں میں شاید آنسو اُمڈ آئے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ کراہتی ہوئی آواز میں بولا۔ ’’میں اس سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔ اتنی محبت جو تمہارے خیال میں نہیں آسکتی۔ کسی کے خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ میں اس کے لیے مر سکتا ہوں اور مار بھی سکتا ہوں۔ میرے لیے یہی دکھ کچھ کم نہیں تھا کہ وہ میرے گاؤں سے جا رہی تھی پھر جب مجھے یہ پتا چلا کہ اس کا بھائی اس کی شادی کرانے کے لیے لے کر جا رہا ہے، تو مجھے لگا میں جیتے جی مر گیا ہوں۔ میں مسلمان ہوں، اللہ کو مانتا ہوں۔ اپنی جان لینے کو جرم سمجھتا ہوں...... نہیں تو شاید پہلے مہینے ہی نواب شاہ کے اسٹیشن پر جا کر اپنا سر ریل کی پٹری پر رکھ دیتا۔‘‘ وہ سسکنے لگا۔

میں نے کہا۔ ’’ابراہیم! اس طرح سے کچھ بھی میری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ تم جو بتانا چاہتے ہو شروع سے بتاؤ اور ترتیب سے......‘‘

جواب میں ابراہیم نے رک رک کر جو کچھ بتایا اور جو کچھ میں نے اپنے سوالوں کے ذریعے اس سے پوچھا، وہ کچھ اس طرح تھا۔

ابراہیم، مہرو کا چچازاد تھا، اس کے والد کا نام پیر بخش تھا۔ وہ تین بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان سے بڑے بھائی کا نام غلام نبی تھا اور مہرو ان کی بیٹی تھی۔ سب سے بڑے بھائی فضل الٰہی تھے۔ وہ ابھی حیات تھے۔ باقی دونوں بھائی وفات پا چکے تھے، کوئی تیرہ چودہ سال پہلے جب مہرو اپنے والد غلام نبی کے ساتھ عراق سے پاکستان آئی اور نواب شاہ پہنچی تو اس کی عمر فقط چار پانچ سال تھی۔ ابراہیم اس وقت آٹھ نو سال کا ہوگا۔ اس نے اپنی ننھی منی تایازاد کو دیکھا اور وہ پیاری چنچل لڑکی اس کے دل میں کھب کر رہ گئی لیکن یہ بچپن کی پسندیدگی تھی۔ بالکل بھائی بہنوں اور قریبی کزنوں جیسی۔ دونوں کے گھر بالکل ساتھ ساتھ تھے۔ بس ایک دیوار درمیان میں تھی۔ وہ اکٹھے کھیلتے کودتے رہے۔ اکٹھے ہی اسکول جاتے رہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ابراہیم لڑکپن سے ہی مہرو کے عشق میں گرفتار ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن وہ عام شکل و صورت کا تھا اور بہت کم گو بھی تھا۔ اس کے علاوہ اس کی مالی حیثیت بھی چھوٹے تایا کی فیملی سے کم تھی۔ چھوٹے تایا عراق سے لوٹے تھے اور ان کے پاس کافی پیسے تھے۔ انہوں نے نواب شاہ میں ہی جستی پیٹیاں وغیرہ بنانے کا کام کر لیا تھا۔ ابراہیم ہمیشہ مہرو کے سامنے دبا ہوا رہا۔ اس سے لگاوٹ ظاہر کرنا تو دور کی بات ہے، وہ اس سے کھل کر بات کرتے ہوئے بھی شرماتا تھا۔ میٹرک کرنے سے پہلے ہی ابراہیم اپنے بیمار باپ کا ہاتھ بٹانے کے لیے ایک گودام پر ملازمت کرنے لگا جبکہ مہرو اسکول جاتی رہی۔ اسکول چھوڑنے کی وجہ سے مہرو کے ساتھ اس کی دوری کچھ اور بڑھ گئی۔ ویسے بھی اس نے چھوٹے تایا کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اپنے گھر میں ابراہیم کا زیادہ آنا جانا پسند نہیں کرتے۔

مہرو سے دوری نے ابراہیم کے دل میں مہرو کی چاہت کچھ اور بڑھا دی۔ وہ ہر وقت اس کے خیالوں میں گم رہنے لگا۔ گھر کی چھت پر چلا جاتا اور اس کوشش میں رہتا کہ صحن میں گھومتی پھرتی مہرو کی جھلک نظر آجائے۔ تنہائی میں وہ مہرو کے بارے میں سوچتا اور دل میں پختہ ارادہ کرتا کہ وہ جب اکیلے میں اس سے ملے گا تو اس سے کہے گا کہ وہ اس سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ ساری باتیں کرے گا جو اس کے دل میں چھپی ہوئی ہیں لیکن جب کبھی ایسا موقع ملتا، اس کو بالکل چپ لگ جاتی۔

خاموشی اس کے اندر ایک ابال پیدا کر رہی تھی۔ یہ ابال اس کی رگ رگ میں پھیل رہا تھا۔ اس کے جسم کے روئیں روئیں میں طلب اور عشق کی آگ بھڑکا رہا تھا۔ اس کے دن اور رات اب صرف اور صرف مہرو کی سوچوں کے گرد گھومنے لگے تھے۔ وہ ہتھیلی پر اس کا نام لکھ لکھ کر مٹاتا۔ اکیلے میں آنکھیں بند کر لیتا اور بغیر اپنے ہونٹ ہلائے ’’مہرو...... مہرو‘‘ پکارتا رہتا۔ ایک روز مہرو کے گھر میں سے مہرو کی ایک قمیص اڑ کر ان کے صحن میں آن گری۔ یہ قمیص شاید سوکھنے کے لیے دھوپ میں پھیلائی گئی تھی۔ ابراہیم نے یہ قمیص کسی کو بتائے بغیر اپنے پاس محفوظ کر لی۔ یہ قمیص ابراہیم کو مہرو کی قربت کا احساس دلاتی تھی۔ وہ بند کمرے میں پہروں اس قمیص کو اپنے سینے پر پھیلائے لیٹا رہتا اور اس میں سے مہرو کی خوشبو سونگھنے کی کوشش کرتا۔ پھر ایک مرتبہ مہرو کی ایک پرانی چپل اس کے ہاتھ لگ گئی۔ وہ اس

چپل کو بھی لے آیا اور محفوظ کر لیا۔ اس چپل پر ہاتھ پھیرنا اور اسے سہلانا اسے اچھا لگنے لگا۔ ایک بار مہرو تھوڑی دیر کے لیے گھر آئی تو اس نے اپنے بالوں میں کنگھی کی۔ اس کے چند بال برش میں اٹکے رہ گئے۔ ابراہیم نے وہ چند بال کسی قیمتی چیز کی طرح برش میں سے نکال لیے اور انہیں اپنی اشیا کے ’’خزینے‘‘ میں شامل کر لیا۔ اس کے پاس ایسی کئی چھوٹی چھوٹی اشیا جمع تھیں۔ مہرو کی قمیص کا ایک سرخ بٹن، اس کی ٹوٹی ہوئی دو چوڑیاں، اس کی پانچویں کلاس کی ایک کاپی جس میں اس کی ہینڈ رائٹنگ تھی...... اس کے لکھے ہوئے بچکانا شعر تھے۔ یہ سب اشیا اس کے لیے ایک خزینے کی طرح تھیں۔ وہ ان چیزوں میں اپنے محبوب کی قربت ڈھونڈتا اور اکثر کامیاب رہتا تھا۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا جا رہا تھا۔ مہرو اب سولہ سترہ سال کی تھی۔ ابراہیم کی عمر بیس اکیس برس تھی۔ وہ سرتاپا اس کے عشق میں ڈوب چکا تھا لیکن وہ اپنے عشق کا اظہار نہیں کر پاتا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ یہ عشق اب تک یک طرفہ تھا، کم از کم ابراہیم کو تو یک طرفہ ہی نظر آتا تھا۔ مہرو کی طرف سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس کے سبب ابراہیم کو یہ پتا چلتا کہ وہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔ ہاں وہ اس سے بے تکلف ضرور تھی۔ کبھی موقع ملتا تو اسے لطیفے سناتی تھی۔ چنچل باتیں کرتی تھی اور کبھی کوئی چھوٹی موٹی شرارت بھی۔

ایک کزن کی حیثیت سے اس کے دل میں یقیناً ابراہیم کے لیے ہمدردی اور انسیت کا جذبہ بھی تھا۔ جب ابراہیم کے والد بہت زیادہ بیمار ہوئے تو اس کی مالی حالت بہت پتلی ہو گئی۔ ان کے گھر میں فاقے رہنے لگے۔ انہی دنوں ابراہیم کی والدہ کو اس کی ایک پرانی سہیلی نے پانچ ہزار روپے ادھار دیے۔ ان روپوں سے ابراہیم کے والد کا علاج بھی شروع ہوا اور گھر میں چولہا بھی جلنے لگا۔ بعدازاں ابراہیم کے والد جانبر نہ ہو سکے تھے۔ بہرحال اس کے گھر کا خرچہ ان تین چار ہزار روپوں سے کئی ماہ تک چلتا رہا۔ جب ابراہیم کی مالی حالت تھوڑی سی بہتر ہوگئی تو ابراہیم نے ماں سے کہا کہ وہ اپنی سہیلی کو روپے واپس کر دے۔ تب اس کی والدہ نے بتایا کہ وہ روپے کسی اور نے نہیں مہرو نے دیے تھے اور وہ واپس کبھی نہیں لے گی (یہ روپے مہرو نے اپنی پرانی بالیاں بیچ کر دیے تھے اور بعدازاں گھر والوں کو یہ بتایا تھا کہ بالیاں کہیں گم ہو گئی ہیں) پھر جب پکے فرش پر پھسل جانے سے ابراہیم کی والدہ کی ٹانگ فریکچر ہو گئی تھی تو ابراہیم کو گھر میں خود روٹیاں پکانا پڑیں۔ مہرو کو پتا چلا تو وہ چپکے سے اس کے اور ماں کے لیے کھانا بھجوانے لگی۔ موقع ملنے پر وہ ماں کی تیمارداری کے لیے بھی آجاتی تھی۔ ایک ایسے ہی موقع پر جب ماں سوئی ہوئی تھی، ابراہیم نے بہت ہمت کی۔ وہ دونوں برآمدے میں پاس پاس بیٹھے تھے۔ ابراہیم نے کہا۔ ’’مہرو! میں بہت غریب ہوں۔ اگر غریب نہ ہوتا تو تایا سے ضرور تمہیں مانگ لیتا۔‘‘

’’مانگ لیتا؟ کیا مطلب؟‘‘

’’تمہیں اپنے گھر لے آتا۔‘‘

’’وہ تو میں اب بھی آسکتی ہوں۔ چاچی کی خدمت کر سکتی ہوں۔ تم دونوں کے لیے روٹی بھی پکا سکتی ہوں۔ میرے خیال میں اگر چاچی خود کہے تو شاید ابا جی اجازت بھی دے دیں۔‘‘

’’میں اس طرح آنے کی بات نہیں کر رہا مہرو! میں اور طرح آنے کی بات کر رہا ہوں۔‘‘

’’کس طرح؟‘‘ وہ معصومیت سے بولی۔

’’میں...... تم سے...... شادی...... کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

وہ ہنسنے لگی۔ ’’شادی......؟ شادی تو میں نے کرنی ہی نہیں۔‘‘ وہ سادگی سے بولی۔

’’وہ کیوں مہرو؟‘‘

’’بس مجھے اچھی نہیں لگتی یہ شادی۔ میں اکیلی سوتی ہوں اور شادی کے بعد تو کمرے کے اندر اپنے بندے کے ساتھ سونا پڑتا ہے نا......‘‘ اس نے کہا اور پھر خود ہی ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی۔ شاید اسے کوئی بات یاد آگئی تھی۔

اس کی ایسی ہی معصوم ادائیں ابراہیم کو بھاتی تھیں اور اس کے اندر دور تک کھب جاتی تھیں۔

دن بہ دن اس کی حالت عجیب ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ایک سائیں پیر سے ملا اور ان سے اپنے دل کا حال بیان کیا۔ سائیں جی کوئی شعبدہ باز فقیر نہیں تھے، صحیح معنوں میں اللہ والے تھے۔ انہوں نے ابراہیم کو بتایا کہ اسے عشق ہو چکا ہے اور یہ عشق بہت قربانی مانگتا ہے۔ اس میں پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنا پڑتا ہے اور بہت دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ وہ ان سب تکلیفوں کے لیے تیار ہو جائے...... اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو پھر اس لڑکی کا خیال دل سے نکال کر کہیں بھی فوراً شادی کر لے۔

اگلے چند مہینوں میں ابراہیم نے بہت کوشش کی۔ پیر سائیں کے بتائے ہوئے وظیفے بھی پڑھے مگر وہی بات تھی کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

مہرو بہت شوخ تھی مگر کبھی کبھی وہ اداس بھی ہو جاتی

تھی۔ وہ اپنی ماں کو دیکھنا چاہتی تھی جو عراق میں رہ گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو تو نہ دیکھ سکی لیکن ایک دن اپنے باپ کو بھی دیکھنے سے محروم ہوگئی۔ اس کے والد یعنی ابراہیم کے چھوٹے تایا اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان کی وفات کے بعد مہرو اپنی دادی اور بڑے تایا فضل الٰہی کے پاس رہنے لگی۔

چھوٹے تایا کی وفات کے بعد ابراہیم کو تھوڑی سی امید پیدا ہوئی تھی کہ شاید اب مہرو سے اس کے رشتے کی بات آگے بڑھ سکے اور دادی جو ابراہیم سے بھی یکساں پیار کرتی تھی، اس کے اور مہرو کے رشتے پر آمادہ ہوجائے لیکن یہ خیال بھی خام ہی نکلا۔ بڑے تایا کا ایک اپنا بیٹا بھی شادی کے قابل تھا اور تایا نے اس کے لیے مہرو پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ دادی اس بارے میں غیر جانبدار ہی تھی۔ بڑے تایا کے گھر جانے کے بعد مہرو پر پابندیاں اور بڑھ گئیں۔ اب ابراہیم اس کی صورت دیکھنے کو بھی ترس گیا۔ کسی وقت اسے لگتا تھا کہ مہرو سے اس کی یہ دوری آہستہ آہستہ اس کو گوارا ہونا شروع ہوجائے گی۔ وہ اس سے دور رہنے کا عادی ہوجائے گا۔ وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے اندر مہرو کی طلب کی آگ ہر وقت بھڑکتی رہے۔ یہی دن تھے جب اپنے جنون میں اس نے پہلی بار اپنے جسم کو لوہے کی مہر سے داغا۔ یہ مہر اس نے خود ہی بنائی تھی اور اس پر اردو میں ''مہرو'' کندہ تھا۔ پہلی بار یہ مہر ابراہیم نے اپنے سینے پر عین دل کے مقام پر لگائی تھی۔ تکلیف تو ضرور ہوئی لیکن اس تکلیف میں بھی لذت تھی۔ جب اس نے ایک بار یہ لذت حاصل کی تو پھر بار بار حاصل کرنے کو دل چاہا۔ وہ ہر دو تین ہفتے بعد اس مہر سے اپنا سینہ داغنے لگا۔ جب بھی اسے لگتا کہ مہرو کو یاد کرنے میں اس سے کوتاہی ہورہی ہے، وہ جیسے سزا کے طور پر اپنے جسم کو داغ لیتا۔ یہ عجیب لذت تھی...... عجیب سرور تھا۔ مہرو تایا کے بیٹے کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی، اس لیے کبھی کبھی ابراہیم کے دل میں یہ امید پیدا ہوتی تھی کہ شاید دادی کا فیصلہ اس کے حق میں ہوجائے اور وہ مہرو کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔

لیکن پھر وہ کچھ ہوا جس کی توقع ابراہیم کو ہرگز نہیں تھی۔ ایک روز اسے پتا چلا کہ تایا کے گھر میں ایک مہمان آیا ہے۔ اس نے اس دراز قد مہمان کو دیکھا، وہ مقامی نہیں لگتا تھا بلکہ پاکستانی بھی نہیں لگتا تھا۔ بعد میں ابراہیم کو پتا چلا کہ وہ عراق سے آیا ہے۔ اس کا نام جعفر ہے اور وہ مہرو کا سگا بھائی ہے۔ مہرو کبھی کبھی اپنی والدہ کے علاوہ اپنے بھائی کا ذکر بھی کیا کرتی تھی۔ اب وہ بھائی اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ کچھ دن بعد ابراہیم پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ مہرو کا بھائی جعفر اسے اپنے ساتھ بغداد لے جانا چاہتا ہے اور اس کا پاسپورٹ وغیرہ بنوا رہا ہے۔

ابراہیم دم بخود رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر مہرو یہاں سے چلی گئی تو وہ کس طرح جی پائے گا۔ اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ وہ مہرو سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن بات کرنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا۔ ایک دن اس نے بہت کوشش کرکے تایا کے گھر کی چھت پر مہرو سے تھوڑی سی بات کی۔ وہ بہت لمبی چوڑی باتیں سوچ کر آیا تھا مگر جب مہرو سامنے آئی تو وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ''مہرو! تم چھوڑ کر نہ جاؤ...... میں کیا کروں گا؟''

''کیوں؟ کیا تم اداس ہوجاؤ گے؟'' وہ سادگی سے بولی تھی۔

''ہاں...... بہت زیادہ۔''

''تو تم مجھ کو خط لکھا کرنا۔ یہاں سے سب کی تصویریں بھیجا کرنا اور میں بھی آیا کروں گی۔ زیادہ نہیں تو سال دو سال بعد تو چکر لگا کرے گا۔''

''تم بالکل نہیں سمجھ پا رہی ہو مہرو...... میں تم سے...... میں تم سے......'' اس کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ وہ کھانسنے لگا۔

''پانی لاؤں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

یہی وقت تھا جب تایا اوپر آگئے۔ انہوں نے ابراہیم کو شعلہ بار نظروں سے گھورا اور مہرو کو ڈانٹ کر بولے۔

''یہاں کیا کررہی ہو، چلو نیچے جاؤ۔''

مہرو چلی گئی اور ابراہیم بھی کنی کترا کر سیڑھیوں کی طرف آگیا۔

اس دن کے بعد تایا نے اپنے گھر میں ابراہیم کا داخلہ بالکل بند کردیا۔

چار پانچ دن بعد اپنی والدہ ہی کی زبانی ابراہیم کو پتا چلا کہ مہرو کا پاسپورٹ بن گیا ہے اور وہ اپنے بھائی کے ساتھ جارہی ہے۔ والدہ نے یہ بھی بتایا کہ اس کے بھائی جعفر نے بغداد میں کہیں مہرو کا رشتہ بھی ڈھونڈ رکھا ہے۔ وہ وہاں اس کی شادی کرائے گا۔

یہ خبریں ایسی تھیں جنہوں نے ابراہیم کو ہوش وحواس سے بیگانہ کردیا۔ وہ دو تین دن بخار میں بے ہوش پڑا رہا۔ اسی دوران میں اسے پتا چلا کہ مہرو اپنے بھائی اور اپنے ایک خالو نور بخش کے ساتھ نواب شاہ سے کوئٹہ کے لیے روانہ ہوگئی ہے۔ وہاں سے انہوں نے بس کے ذریعے ایران اور پھر بغداد شریف چلے جانا تھا۔

مہرو کے چلے جانے کے بعد قرب وجوار ابراہیم کے لیے سنسان ہوگئے۔ اسے لگا کہ اس کے اردگرد ایک ویرانے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ یہاں زرد دھوپ میں خاک اڑتی ہے اور اداسیوں کے گدھ منڈلاتے ہیں۔ وہ ان خالی جگہوں کو دیکھتا جہاں جہاں اسے مہرو نظر آیا کرتی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگتا۔ ایک دن وہ چپکے سے پاسپورٹ کے دفتر پہنچ گیا۔ اس نے اپنی محنت مزدوری کی کمائی میں سے تھوڑا تھوڑا اپنی شادی کے لیے بچایا ہوا تھا۔ یہ کوئی چھ ہزار روپے تھے۔ اس نے ارجنٹ پاسپورٹ کے لیے درخواست جمع کرادی اور چپکے چپکے سفر کی تیاری میں مصروف ہوگیا...... وہ مہرو کے پیچھے جانا چاہتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گا اور پھر جب مرنا ہی تھا تو وہ کیوں نہ اپنی مہرو کے سامنے مرتا۔

جونہی اس کا پاسپورٹ بنا، وہ اپنی جمع پونجی لے کر اور اپنی ماں کو کراچی جانے کا بتا کر بغداد کے لیے روانہ ہوگیا۔

اب اسے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوچکا تھا۔ اس کے پاس جعفر کا پتا موجود تھا۔ پھر بھی اسے جعفر کے ٹھکانے تک پہنچنے میں کافی کوشش کرنا پڑی۔ ایک مرتبہ تو وہ پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ہوتے بچا۔ اب وہ جعفر کے گھر کے اردگرد منڈلا رہا تھا۔ اس کے دل ودماغ میں بس ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی۔ مہرو کو حاصل کرنا یا پھر اس کی شادی سے پہلے پہلے اس کے سامنے اپنی جان دے دینا...... اور یہ ثابت کردینا کہ وہ اس سے سچا عشق کرتا تھا۔

میں ابراہیم کی باتیں سن رہا تھا اور حیران ہورہا تھا۔ وہ مجھے جیتے جاگتے انسان کے بجائے کہانیوں کا کوئی کردار لگ رہا تھا۔ اپنے عشق میں ڈوبا ہوا اور اپنے محبوب کو پانے کے لیے ہر مشکل سے ٹکرانے کو تیار۔ اس کا دل ہی نہیں اس کا جسم بھی مہرو کی محبت میں داغ داغ تھا۔ یہ کیسا جذبہ تھا؟ یہ کیسی طلب تھی؟

اس کی گفتگو ختم ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم میرے پیچھے کس طرح لگ گئے ابراہیم؟''

وہ بولا۔ ''سائیں! میں نے پرسوں آپ کو مہرو کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ آپ ایک بندے کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اندر گئے تھے۔ مجھے لگا کہ شاید آپ ہی ورکشاپ کے وہ ملازم ہو جس کے ساتھ جعفر اپنی بہن کی شادی کرنا چاہ رہا ہے۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر وہ آپ کو اپنے گھر کیوں لایا اور کیوں رات کو وہاں رکھا۔ تو سائیں جب آج رات میں نے آپ کو مہرو کے گھر سے نکلتے دیکھا تو آپ کے پیچھے لگ گیا۔''

''تم نے بتایا ہے کہ جعفر اپنی بہن کی شادی کسی عراقی ملازم سے کررہا ہے۔ کیا میں تم کو عراقی لگ رہا تھا؟''

''نہیں سائیں! اسی لیے مجھے کچھ شک بھی ہوا تھا کہ شاید میں آپ کے بارے میں غلط اندازہ لگا رہا ہوں۔''

رات کا آخری پہر شروع ہونے والا تھا۔ دجلہ کی طرف سے بڑی خوشگوار ہوا کی آمد ہونے لگی تھی۔ احاطے میں لوگ یہاں وہاں سوئے ہوئے تھے۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے ابراہیم سے کہا۔ ''ابراہیم! محبت یک طرفہ تو نہیں ہوتی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مہرو بھی تم سے محبت کرتی ہے؟''

وہ عجیب انداز میں بولا۔ ''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں سائیں! میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور اتنی...... جتنی کوئی کسی سے کرسکتا ہے۔ لیکن...... یہ بات بھی نہیں کہ وہ مجھے ناپسند کرتی ہے۔ اگر تایا اس کے ساتھ میری شادی کردیتے تو مجھے یقین ہے وہ بہت خوش ہوتی۔''

''کیا تم یہاں آنے کے بعد مہرو یا جعفر سے ملے ہو؟''

''نہیں سائیں! ابھی تک تو نہیں ملا لیکن آج نہیں تو کل...... کل نہیں تو پرسوں یہ ملاقات ہونی ہی ہے۔''

''تمہارے ذہن میں کیا پروگرام ہے؟''

''کوئی پروگرام نہیں سائیں! پروگرام تو ان کے ہوتے ہیں، جن کی عقل سمجھ کام کررہی ہوتی ہے۔ میرا دماغ تو جیسے بند ہوچکا ہے سائیں۔ میں سچ کہتا ہوں سائیں! مجھے مہرو کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور نہ سنائی دیتا ہے۔ میں تو...... جعفر سے یہ کہوں گا کہ میں اپنی ساری زندگی اور اپنے خون کا ایک ایک قطرہ اس کے نام لکھ دیتا ہوں۔ وہ زندگی بھر کے لیے مجھے اپنا غلام بنا کر رکھ لے...... اور اگر اسے یہ غلامی قبول نہیں تو پھر مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دے۔''

میں نے دل میں سوچا کہ جس طرح کا وہ بندہ ہے، وہ تمہیں گولی مار بھی سکتا ہے...... ابراہیم مجھے اپنی جیب سے کوئی کاغذ نکال کر دکھانا چاہ رہا تھا...... شاید کوئی خط تھا...... لیکن اسی دوران مجھے ابوسیاف اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ہم دونوں خاموش ہوگئے۔ ابوسیاف نے آتے ہی کہا۔ ''ہارون! تمہیں پتا ہے، پاکستان سے تمہارے کچھ مہمان آئے ہیں۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ پتا نہیں، وہ کس کی بات کررہا تھا۔

''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

ابوسیاف نے مجھے اور ابراہیم کو ساتھ لیا اور روضے

کے پہلو میں واقع ایک چھوٹے احاطے میں آگیا۔ میں مہمانوں کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہ پاکستان کی معروف گلوکارہ ریشماں اور اس کے ساتھی تھے۔ ان دنوں ریشماں جواں سال اور صحت مند تھی...... اور تیزی سے مقبول ہو رہی تھی۔ میں آگے بڑھ کر اس سے ملا اور بتایا کہ میں لاہور کا رہنے والا ہوں۔ وہ اور اس کے ساتھی گرمجوشی سے ملے۔ یہ پورا گروپ تھا جس میں سازندے وغیرہ بھی شامل تھے۔ ریشماں نے سیدھے سادے دیہاتی لہجے میں بتایا۔ ”باؤ جی! دیکھو ہم ہزاروں میل کا سفر کر کے یہاں آئے ہیں، غوث پاک کے مزار پر حاضری دینے کے لیے۔ لمبا سفر تھا پر یہاں پہنچ کر ساری تھکاوٹ منٹوں میں دور ہوگئی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”یہاں آپ کیا کریں گی؟“

وہ بولی۔ ”اپنی آواز کا نذرانہ دیں گے، کچھ پڑھیں گے یہاں۔“

”لیکن یہاں سختی بہت ہے۔ یہ نہ ہو کہ آپ گانا بجانا کریں اور یہ لوگ آپ کو پکڑ لیں۔“

”نہیں، ہم یہاں سے دور ہٹ کر بیٹھیں گے۔“ ریشماں نے کہا۔

ابوسیاف اور ایک پاکستانی منتظم نے گروپ کی خاطر مدارات کی۔ میں نے بھی ابوسیاف کا ہاتھ بٹایا۔ یہ لوگ بہت تھکے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے لیے سو گئے۔ صبح دس بجے کے قریب پھر ان سے ملاقات ہوئی۔ ریشماں اور اس کے ساتھی احاطے سے باہر ایک گوشے میں بیٹھے تھے۔ ریشماں کے چہرے پر عقیدت اور نیازمندی کے تاثرات تھے۔ وہ دھیمی آواز میں کچھ گنگنا رہی تھی۔ جیسے ریہرسل کر رہی ہو۔ یہ شاید کسی کافی کے بول تھے۔

دوپہر کو میں نے ابوسیاف سے اجازت لے لی کہ میں ابراہیم کو یہاں اپنے ساتھ مزار میں لے آؤں۔ ابراہیم دریائے دجلہ کے بڑے پل کے پاس ایک مسافر سرائے میں رہ رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ مسافر سرائے کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جس سے کچھ افراد کے گھناؤنے کردار پر روشنی پڑی۔ سچ کہتے ہیں کہ حقیقتیں تلخ ہوتی ہیں۔ بازار سے گزرتے ہوئے ہمیں ایک انڈین ملا۔ اس کا نام سلیمان تھا اور میں نے اسے اکثر مزار کے خدمت گاروں میں دیکھا تھا (مزار کے اکثر خادم پاکستانی یا انڈین تھے) سلیمان کے ہاتھ میں کینوس کا ایک بڑا سا بیگ تھا۔

سلیمان سے میری علیک سلیک ہوئی اور میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے کہا۔ ”عبدالغفور صاحب کے لیے کھانے پینے کا سامان لے کر جا رہا ہوں۔“

”کون عبدالغفور؟“ میں نے پوچھا۔

”یار! وہی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والے۔ وہ مزار کی انتظامیہ کے افسر ہیں۔“

”لیکن ان کے کھانے پینے کا سامان تم مزار میں لے کر کیوں نہیں جا رہے؟“

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ”یہ سامان مزار میں نہیں جا سکتا نا...... غفور صاحب کی اپنی رہائش گاہ بھی ہے یہاں۔ چھوٹے پل کے پاس۔“

جلد ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ بیگ میں خمیر شدہ مشروب ہے...... یعنی شراب ہے...... بوتلوں پر ”روح صبح“ اور ”روح قدس“ جیسے الفاظ لکھے نظر آئے۔ سلیمان کی باتوں سے پتا چلا کہ نئی دہلی کا رہنے والا یہ شخص اکثر نشے میں غرق رہتا ہے۔ اس نے نوجوان لڑکیوں کو نکاح میں لانے اور پھر طلاق دینے کا مذموم مشغلہ بھی شروع کر رکھا ہے۔ سلیمان نے یہ بھی بتایا کہ مزار کے نیک نام متولی ”عالی مقام“ اس سے بہت نالاں ہیں۔

عالی مقام کا ذکر آیا تو میرے سینے میں پھر بے چینی کی لہریں اٹھنے لگیں۔ عالی مقام کا اصل نام تو شیخ ابوالحسن تھا۔ ”عالی مقام“ کی حیثیت لقب کی تھی۔ ابھی تک دوبارہ ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس بارے میں سلیمان سے بھی سن گن لینے کی کوشش کی۔ اس نے بتایا کہ اس کی معلومات کے مطابق حضرت آج کل بغداد سے باہر ہیں۔

سلیمان کے انکشافات پر چلتے کڑھتے ہم مسافر سرائے پہنچے تو تیز آندھی آگئی۔ یہ ریتیلی ہوا تھی جو ہر چیز کو ڈھانپ رہی تھی اور دہلا رہی تھی۔ آندھی کے بعد بارش شروع ہوگئی۔ ابراہیم نے مشورہ دیا کہ اس وقت مزار واپس جانے کے بجائے رات یہیں گزار لی جائے۔ مجھے یہ تجویز مناسب لگی۔ سرائے میں ہم رات کو دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے اپنے بارے میں بھی ابراہیم کو تھوڑا بہت بتایا۔ بہرحال اسے اس بات سے آگاہ نہیں کیا کہ میں اپنی نئی نویلی دلہن کو سہاگ رات میں چھوڑ کر ہزاروں میل دور چلا آیا ہوں۔

ابراہیم سے باتیں کرتے ہوئے میرے زخم جیسے پھر سے ہرے ہوگئے تھے۔ عارفہ کی صورت میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ اس کی نگاہیں مجھ سے پوچھنے لگیں...... مجھے بتاؤ

میرا کیا قصور ہے؟ وہ سارے حالات میرے ذہن میں تازہ ہوگئے جنہوں نے میری شادی کی رات مجھے گھیرا تھا اور گھر چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ سب کچھ بہت انوکھا تھا۔ اس انوکھے پن کا تھوڑا بہت جواب تو مجھے محترم عالی مقام نے دیا تھا لیکن ابھی مکمل جواب سے میں محروم تھا اور نہ ہی مجھے یہ پتا تھا کہ میں اس خوفناک صورتِ حال سے خود کو کیسے نکال سکتا ہوں۔ پتا نہیں کیوں وہاں سرائے میں بیٹھے بیٹھے اور ابراہیم سے باتیں کرتے کرتے عارفہ اور اپنی ماں کی یاد نے بڑی شدت سے میرے دل و دماغ کو جھنجوڑا...... اور میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں کم از کم ان لوگوں کو اپنی خیریت سے تو آگاہ کر دوں۔ کچھ اور نہیں تو ایک خط ہی اپنی بدنصیب دلہن کے نام لکھ دوں۔

ہم اگلے روز دس بجے کے قریب واپس غوث پاک کے روضے پر پہنچ گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ریشماں اور ان کا طائفہ یہاں سے جا چکا ہے۔ ریشماں نے کل یہاں عارفانہ کلام پڑھا تھا اور پاکستانیوں اور انڈینز سے داد پائی تھی۔ اب وہ کسی اور جگہ کا رخ کر چکے تھے۔

فرصت ملتے ہی میں نے ایک کاغذ قلم لیا اور خط لکھنا شروع کیا۔ یہ خط والدہ اور عارفہ کے نام تھا۔ اس طویل خط میں، میں نے دل کے کئی پھپھولے پھوڑے اور انہیں بتایا کہ نامعلوم وجوہ سے میں ذہنی طور پر بے حد پریشان ہوں۔ سکون حاصل کرنے کے لیے ایک اللہ والے کے در پر موجود ہوں اور دن رات دعا کر رہا ہوں کہ آپ کے پاس واپس آنے کے قابل ہو سکوں۔ اب یہ خواہش پوری ہوتی ہے یا نہیں اس بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں۔ بس میرے لیے بہت زیادہ دعا کریں۔

اس خط میں، میں نے اپنے پتے ٹھکانے کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔ بغداد میں اللہ والوں کے بہت سے مزارات ہیں۔ شام کے وقت میں خط پوسٹ کرنے کے لیے پوسٹ آفس کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں یہ خط مرکزی پوسٹ آفس سے پوسٹ کرنا چاہتا تھا اس لیے مجھے کافی فاصلہ طے کرنا پڑا۔ جس وقت میں پوسٹ آفس کے قریب بس سے اترا، اندھیرا اپھیل چکا تھا۔ میری آنکھوں میں نمی تھی اور دل دھڑک رہا تھا۔ ابھی میں پوسٹ آفس سے بیس تیس قدم دور تھا کہ یکایک مجھے رکنا پڑا...... مجھے لگا جیسے میں سر سے پاؤں تک پتھرا گیا ہوں۔ ایک منظر جسے میں بہت دنوں سے بھولا ہوا تھا، ایک دم پھر میرے سامنے آگیا تھا۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ میں ہمیشہ توہمات اور بے معنی خیالات سے دور رہا ہوں۔ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں لیکن اس وقت مجھے جو کچھ وہاں نظر آیا...... یا میری نظر نے جو کچھ دکھایا، وہ سمجھ اور فہم سے بالاتر تھا۔ میں نے پوسٹ آفس کے مین دروازے کے عین سامنے وہی سفید ہیولا دیکھا۔ سر سے پاؤں تک لبادے میں لپٹا ہوا۔ بس کالی اور سفید ڈاڑھی کی ہلکی سی جھلک...... ہاں یہ وہی تھا۔ بالکل خاموش اور ساکت کھڑا تھا۔ مجھے لگا کہ میری دھڑکن تھم گئی ہے اور میں کسی بھی وقت چکرا کر گر جاؤں گا۔

چند سیکنڈ اسی خوفناک کیفیت میں گزرے پھر پوسٹ آفس کی ایک لوڈر نما گاڑی میرے اور ہیولے کے درمیان آگئی۔ وہ ریورس ہو رہی تھی۔ وہ ریورس ہو کر آگے گئی تو میں نے پھر مین گیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ ایک موٹی عراقی عورت اپنے بچے کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی...... سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ یہ ایک بارونق جگہ تھی۔ مرد و زن آ جا رہے تھے۔ چھوٹی بڑی گاڑیاں بھی حرکت کر رہی تھیں۔

وہ کہیں نہیں تھا لیکن میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ یہیں کہیں ہے۔ مجھے دیکھ رہا ہے...... گھور رہا ہے، میں جونہی آگے بڑھوں گا وہ کسی تاریک کونے کھدرے سے نکلے گا اور میرے سامنے آ جائے گا۔ میرا دل یہ گواہی بھی دے رہا تھا کہ وہ مجھے بہت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میں اس کی وجہ سے اپنی زندگی کھو سکتا ہوں۔ قبر کی تاریکی میں اتر سکتا ہوں۔ وہی سفید کفن اور کافور کی بو۔ دل نے پکار کر کہا۔ ”مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“

میں پلٹ گیا...... بیس پچیس قدم چلنے کے بعد میں رکا۔ ایک بار پھر دل میں خیال آیا کہ کہیں یہ سب میرا وہم تو نہیں...... میرے تصور کی کارستانی تو نہیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دور پوسٹ آفس کے دروازے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ ایک بار پھر وہیں موجود تھا۔ اس کے کپڑوں کی سفیدی ٹیوب لائٹ میں چمک رہی تھی۔ وہ بالکل بے حرکت تھا۔ اب مجھ میں اتنی تاب نہیں تھی کہ میں اسے مزید دیکھتا، اس کی طرف قدم بڑھاتا اور یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ وہ کیا ہے...... بلکہ اتنی تاب بھی نہیں تھی کہ میں وہاں رک سکتا۔ پورے جسم پر ایک لرزہ طاری ہو چکا تھا۔ میں مڑا اور بغداد کی ایک تنگ گلی میں تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔ یہ ایک پرانا بازار تھا۔ روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ عطر کی دکانوں سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ قہوہ خانوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ برقع پوش

عورتیں اور کھلے لبادوں والے مرد، زمانہ قدیم کے کرداروں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ خلیفہ ہارون رشید کے دور کے واقعات پڑھیں تو ایسے ہی مناظر نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔ میں اس بازار میں تیز رفتاری سے چلتا چلا جارہا تھا۔ میرے ماتھے پر پسینا تھا اور خط والا لفافہ میں نے بڑی مضبوطی سے مٹھی میں دبا رکھا تھا۔ مجھے لگا کہ آج کئی دنوں کے بعد وہی آواز پھر میرا تعاقب کرنے لگی ہے جس نے لاہور میں اور پھر ساہیوال کے ریلوے اسٹیشن پر میری سماعت میں ہلچل مچائی تھی...... مجھے تڑپایا دہلایا تھا۔ ہاں یہ وہی آواز تھی۔ میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ ہارون! کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا...... اور ایسا نہیں ہوا...... اب اس کی قیمت چکانا ہوگی۔

کہاں سے آرہی تھی یہ آواز؟ کیا وہ سفید پوش شخص میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا؟ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ بے حد اضطراب کے عالم میں، میں نے بے ساختہ پیچھے مڑ کر دیکھا، پیچھے کوئی نہیں تھا۔ دور تک اس سفید پوش کی جھلک دکھائی نہیں دی لیکن آواز...... آواز بدستور موجود تھی اور میرے کانوں میں سرگوشیوں کی صورت میں گونج رہی تھی۔ میں ایک ایک لفظ علیحدہ علیحدہ سن رہا تھا...... کم از کم ایک بھوکے کو...... کم از کم ایک بھوکے کو......

کیا بھوک اور بھوکے کا مطلب کچھ اور تھا؟ کیا مجھے کسی طرح کا کوئی اشارہ دیا جارہا تھا؟ میرا سر چکرانے لگا۔ مجھے نہیں پتا میں نے پوسٹ آفس سے روضے تک کا طویل فاصلہ کیسے طے کیا۔ کہاں کہاں ٹھوکر کھائی۔ کہاں کہاں کسی سے ٹکرایا اور کتنی بار گرتے گرتے بچا۔ میں بس بڑھتا ہی چلا گیا اور مسجد میں پہنچ کر دم لیا۔ وہ خط جو میں نے گھر والوں کے نام لکھا تھا، راستے میں ہی پھاڑ کر اور پرزے کر کے پھینک دیا تھا۔ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ بس اس وقت مجھے یہی لگا تھا کہ مجھے یہ خط پھاڑ کر پھینک دینا چاہیے کیونکہ میں اسے کبھی پوسٹ نہیں کرسکوں گا۔ میں جس وقت احاطے میں پہنچا عشا کی اذان ابھی ابھی ہوئی تھی۔ بس اِکّادُکّا افراد ہی نظر آرہے تھے۔ میرے سینے میں جیسے خوف آمیز دکھ کا دریا بہہ رہا تھا۔ میں ایک گوشے میں چلا گیا، پھر سجدے میں گرا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا...... اے میرے اللہ! میری مدد کر۔ میں بڑا کمزور ہوں مزید دکھ نہیں جھیل سکتا۔ یہ میرے ساتھ کیا ہورہا ہے میرے مالک! یقیناً میں گناہ گار ہوں لیکن مجھے اپنے گناہوں کا پتا تو چلے۔ یہ تو معلوم ہو کہ میں کس طرح توبہ کرسکتا ہوں۔ کیسے کفارہ ادا کرسکتا ہوں۔ جو تیری منشا ہے، میں وہ کرنے کو تیار ہوں۔ اگر یہ واقعی بھوکوں کو کھانا کھلانے والی بات ہے تو میں اپنی ساری زندگی اس کام کے لیے وقف کردوں گا۔ مالک! تو غفور الرحیم ہے۔ بخشنے والا ہے۔ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ دیکھ میں تیرے سامنے بلک بلک کر رو رہا ہوں۔ میری مدد کر میرے مولا! میرے حواس درست کام نہیں کر رہے۔ میں نامعلوم آوازیں سن رہا ہوں۔ مجھے انجانے خوف گھیرے ہوئے ہیں۔ میں بالکل بے دست و پا ہوگیا ہوں میرے مالک! میرا امتحان ختم کردے...... میری آزمائش مختصر کردے۔

میں سجدے میں گرا رہا اور روتا رہا۔

کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے بالکل قریب موجود ہے، مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے سجدے سے سر اٹھایا اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔ یہ ابوسیاف تھا۔ ابوسیاف مجھے کبھی ہارون اور کبھی پیار سے پپو کہہ کر بلاتا تھا۔ کہنے لگا۔ ”پپو! کیا بات ہے۔ خیریت سے تو ہو؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

ابوسیاف اپنی قبا سنبھالتا ہوا میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور ان پر اپنی پیشانی ٹکاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بتاؤ، میں کب تک انتظار کروں، کب تک ان کی راہ دیکھوں؟ وہ کب دوبارہ آئیں گے؟“

”تم حضرت عالی مقام کی بات کر رہے ہو؟“ ابوسیاف نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں، انہی کی بات کر رہا ہوں۔ میں ان کی راہ دیکھ دیکھ کر تھک گیا ہوں۔ انہوں نے مجھے راستے میں چھوڑ دیا ہے۔ ایسی کیا غلطی ہوئی ہے مجھ سے؟“

ابوسیاف مجھ سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جاننا چاہ رہا تھا کہ میرے ساتھ ایسی کیا تازہ بات ہوئی ہے جس نے مجھے اتنا غمزدہ کیا ہے۔ میں نے اس بارے میں ابوسیاف کو کچھ نہیں بتایا۔ اسی دوران میں ابراہیم بھی مجھے ڈھونڈتا ہوا آگیا۔ اس کے آنے کی وجہ سے ہماری گفتگو رک گئی۔ تاہم عشا کی نماز کے بعد جب میں نے ایک بار پھر ابوسیاف کے سامنے آہ وزاری کی تو اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ کرتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ حضرت امام کاظم کے روضے کے قریب ایک جامع مسجد ہے۔ کبھی کبھی عالی مقام ادھر بھی نماز پڑھتے ہیں۔ اس نے

کہا کہ اگر وہ بغداد واپس آگئے ہیں تو وہاں سے ان کا پتا چل سکتا ہے۔

میں نے کہا۔ ”آپ تکلیف نہ کریں۔ میں خود وہاں چلا جاتا ہوں۔“

ابوسیاف بولا۔ ”پہلے مجھے دیکھ لینے دو، پھر اگر ضرورت پڑی تو میں تمہیں بتادوں گا۔“

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ابھی ابوسیاف ہمارے پاس سے اٹھ کر گیا ہی تھا کہ احاطے میں بھگدڑ کی آوازیں آئیں۔ دیکھا تو کچھ پولیس والے تیزی سے مسجد کے احاطے کی طرف لپک رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر پاکستانی اور انڈین زائرین کی ایک ٹولی اپنی جگہ سے اٹھی اور اندھا دھند بیرونی دروازے کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ ان بھاگنے والوں میں سے ایک پاکستانی نے پکار کر ہم سے کہا۔ ”اوئے...... اوئے نس جاؤ (بھاگ جاؤ) نہیں تو مارے جاؤ گے۔“

ایک دم میں اور ابراہیم بھی خوف کے نرغے میں آگئے۔ ہم اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بھاگے۔ یقیناً ہم مسجد سے نکل کر بغداد کی گلیوں میں گم ہوجاتے لیکن اس دروازے کے باہر بھی پولیس کے دس پندرہ اہلکار موجود تھے۔ ہمارے عقب سے پولیس والوں کی سیٹیوں کی آوازیں آئیں اور پھر یہ تازہ دم پولیس والے بھی ہم پر جھپٹے۔ ہم اندھا دھند تنگ گلیوں میں گھس گئے۔ کچھ خبر نہیں تھی، کدھر جارہے ہیں۔ بس یہی خیال تھا کہ یہاں کی ظالم پولیس کے ہتھے نہیں چڑھنا۔ ہمیں سامنے ہی سڑک پر چند سیڑھیاں نظر آئیں۔ میں اور ابراہیم بغیر سوچے سیڑھیاں چڑھ کر ایک کشادہ چھت پر آگئے۔ یہ ایک ہوٹل کی دوسری منزل تھی۔ اردگرد اونچی عمارتیں بھی تھیں، چھت کی منڈیر ڈیڑھ دو فٹ سے اونچی نہیں تھی۔ ہمارا چھت پر چڑھنا ہمارے لیے سودمند ثابت ہوا۔ ہم نے بلندی سے گلی کا منظر دیکھا جو خوفزدہ کردینے والا تھا۔ پولیس والوں نے پانچ پاکستانی اور انڈینز کو گھیر لیا تھا اور ان کی خوب ٹھکائی کر کے انہیں سڑک پر ہی اوندھا لٹا دیا تھا۔ ایک شخص نے کچھ زیادہ مزاحمت کی تو اسے دبوچ کر کوئی نشہ آور انجکشن لگا دیا تھا۔ ہم پولیس کی نگاہوں سے بچنے کے لیے چھت کی ایک چوکور چمنی کے پیچھے چھپ گئے اور اسی اوٹ سے گلی کا منظر بھی دیکھتے رہے۔ اردگرد کی بلند چھتوں پر بھی چند افراد موجود تھے اور ہمیں دیکھ رہے تھے، شکر کا مقام تھا کہ انہوں نے پولیس کو ہماری موجودگی سے آگاہ نہیں کیا۔

تاہم بکرے کی ماں نے زیادہ دیر تک خیر نہیں منائی۔ نیچے سے آنے والی آوازوں سے اندازہ ہوا کہ پولیس والے اوپر آنا چاہ رہے ہیں۔ ”اب کیا کریں؟“ ابراہیم نے ہراساں لہجے میں پوچھا۔

ہم اٹھے اور پاس ہی ایک بند دروازے پر زور آزمائی کی۔ یہ اندر سے لاک تھا۔ پولیس والے اب سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ اچانک ایک قریبی دروازہ کھلا اور کوئی شخص ٹھیٹ پنجابی لہجے میں بولا۔ ”اندر آجاؤ۔“

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ہم تیزی سے اندر گھس گئے۔ دروازہ فوراً اندر سے لاک ہوگیا۔ میں نے مڑ کر اپنے مددگار کو دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ یہ کوئی اور نہیں وہی رحیم یار خان کا رہائشی اور ایرانی بس کا مسافر امین تھا۔ اس کے حلیے پر غور کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک تنومند عراقی بھی تھا۔ شرٹ اور پتلون والا یہ عراقی ہمارے آگے آگے چلتا ہوا زینے اترنے لگا۔ اس کے پیچھے امین اور امین کے پیچھے ہم دونوں تھے۔ امین سے کوئی سوال جواب کرنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ ہم تیزی سے آگے پیچھے چلتے زینے اترے اور ہوٹل کی لابی میں پہنچے۔ اِکّادُکّا افراد نے ہمیں دھیان سے دیکھا لیکن چونکہ ایک عراقی ہمارے ساتھ تھا اس لیے کسی نے ہمیں روکنے یا کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم ہوٹل کے عقبی دروازے سے نکلے اور ایک تنگ سڑک پر تیس چالیس قدم چلنے کے بعد ایک اور ہوٹل کے دروازے میں داخل ہوگئے۔ یہ جدید، آرام دہ ہوٹل لگتا تھا۔ لفٹ کے ذریعے ہم تیسری منزل پر پہنچے اور پھر چار پانچ کمروں پر مشتمل ایک شاندار سوئٹ میں داخل ہوگئے۔ اس لگژری اپارٹمنٹ میں الکحل کے علاوہ نسوانی خوشبو بھی رچی بسی ہوئی تھی۔ میں نے پہلی بار ذرا دھیان سے امین کو دیکھا۔ ان پندرہ بیس روز میں اس کا حلیہ مزید تبدیل ہوچکا تھا۔ چھوٹی چھوٹی فرنچ کٹ ڈاڑھی اور اچھے لباس نے اسے کافی مختلف روپ دے دیا تھا۔

اپارٹمنٹ میں پہنچ کر اس نے دو تین گہری سانسیں لیں اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”یہاں کیسے پھنس گئے ہارون بھائی!“

میں نے کہا۔ ”بس کچھ نہ پوچھو۔ پتا ہی نہیں چلا۔ مسجد کے اندر سے پاکستانی اور انڈینز بھاگے تو افراتفری میں ہم بھی بھاگ پڑے...... لیکن...... تم یہاں کیسے...... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم سے ایسے ملاقات ہوگی۔“

وہ بولا۔ ”ہم اس ہوٹل کی چھت پر سے سب کچھ دیکھ

رہے تھے۔ جب آپ دونوں چمنی کے پیچھے چھپے ہوئے تھے، میں نے آپ کو پہچان لیا اور پھر کمال صاحب کے ساتھ آپ کی مدد کو پہنچ گیا۔'' کمال یقیناً اس گھنگرالے بالوں والے تنومند عراقی کا نام تھا۔ وہ شکل سے سخت گیر نظر آتا تھا۔

امین نے مزید بتاتے ہوئے کہا کہ کمال رشید اس کا نیا دوست ہے اور وہ اس سے ملنے یہاں ہوٹل میں آیا ہوا تھا۔

میں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ پاکستان سے نکلنے کے بعد... امین کتنی شدت سے اور کتنی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ عراقی کمال باہر چلا گیا۔ شاید یہ دیکھنے گیا تھا کہ پولیس کی کارروائی کیسی جا رہی ہے۔ جاتے جاتے اس نے عربی میں تسلی دی کہ ہم یہاں بالکل محفوظ ہیں، ڈرنے والی کوئی بات نہیں۔ ایک لڑکی جس نے نہایت مختصر لباس پہن رکھا تھا، ہمارے لیے کولڈ ڈرنک لے آئی اور پھر وہ بھدی سی ہپی لڑکی بھی دکھائی دی جو زاہدان میں دو تین مرتبہ امین کے ساتھ نظر آئی تھی۔ وہ آ کر بے تکلفی سے امین کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ وہ بھی مختصر لباس میں تھی۔ کسی پاس کے کمرے سے کسی لڑکی کے بلند لہجے میں بولنے کی آواز آئی۔ وہ شاید کسی مرد سے جھگڑ رہی تھی۔ مرد نے بھی گرج کر کچھ کہا۔ لڑکی ہولے سے چلائی پھر ایک دروازہ جھٹکے سے کھلا اور لڑکی تیز قدموں سے چلتی ہوئی مخالف سمت میں گئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس نے اپنے جسم کے گرد ایک سفید چادر لپیٹ رکھی تھی۔ جواں سال مرد اس کے پیچھے گیا اور اسے روکنے کی کوشش کی۔ لڑکی طیش سے اس کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ جب وہ راہداری کے آخری سرے پر پہنچی تو اسے رکنا پڑا۔ سامنے سے کمال رشید سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ رہا تھا۔

''واٹ از گوئنگ آن؟'' کمال رشید نے ڈانٹ کر لڑکی سے پوچھا۔ لڑکی نے پتا نہیں کیا جواب دیا۔ اسی دوران میں لڑکی کے ساتھ کمرے سے نکلنے والا شخص بھی کمال رشید کے پاس پہنچ گیا۔ اس شخص نے صرف پتلون پہن رکھی تھی۔ ان تینوں کے درمیان وہیں کھڑے کھڑے کچھ بحث ہوئی۔ الفاظ ہمارے کانوں تک نہیں پہنچے لیکن بات تقریباً سمجھ میں آ رہی تھی۔ اچانک بجلی سی چمکی۔ کمال رشید نے زناٹے کا تھپڑ لڑکی کے منہ پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگی۔ اس کے بال چہرے پر بکھر گئے تھے۔ کمال رشید نے اپنی انگلی اٹھائی اور بڑے تحکم سے کچھ کہا۔ یقیناً وہ لڑکی کو واپس کمرے میں جانے کا حکم دے رہا تھا۔

لڑکی سر جھکائے واپس کمرے میں چلی گئی۔ جواں سال عراقی بھی اس کے پیچھے ہی گیا، کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

یہ وہی گھناؤنا کھیل تھا جو ازل سے حوا کی بیٹی کے ساتھ کھیلا جاتا رہا ہے۔ مقام اور کردار بدلتے رہتے ہیں لیکن کہانی وہی رہتی ہے۔

میرا دم جیسے گھٹنے لگا۔ ابراہیم کے چہرے پر بھی ناپسندیدگی کے آثار نظر آئے۔ میں نے امین سے کہا۔ ''کیا ہم کہیں اور نہیں بیٹھ سکتے؟''

''کیوں نہیں ہارون بھائی۔'' امین نے مسکرا کر کہا اور ہمارے ساتھ ایک ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھا۔ بھدی سی ہپی لڑکی بھی اب ہمارے قریب نہیں تھی۔

میں نے کہا۔ ''امین! یہ سب کیا ہو رہا ہے، لگتا ہے تم کسی چکر میں پھنسے ہوئے ہو؟''

وہ پھر مسکرایا۔ ''یہ ساری دنیا ہی ایک چکر ہے ہارون بھائی! مگر پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں کس چکر میں چمنی کے پیچھے چھپنا پڑا؟''

میں نے اسے مختصر الفاظ میں اپنی روداد سنائی اور ابراہیم کا بھی تھوڑا سا تعارف کرایا۔ مسجد کے صحن سے ہم دونوں کے بھاگنے کا ذکر سن کر وہ ہنسنے لگا۔ ''ہارون بھائی! ویسے تو تم سیانے بیانے ہو لیکن لگتا ہے کہ پردیسی ہونے کی وجہ سے تم بہت گھبرائے ہوئے ہو۔ تمہیں بھاگنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ تمہارے پاس پاسپورٹ ہے ویزا ہے...... اور ابراہیم کے کاغذ بھی پورے ہیں۔ پولیس یہ چھاپے ان لوگوں کے لیے مارتی ہے جو غیر قانونی طور پر یہاں پڑے رہتے ہیں۔''

''بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''میں اب بہت سی ٹھیک باتیں کہنے لگا ہوں۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''اور بچی بات یہ ہے کہ میں تم کو بھی ایک دو ٹھیک باتیں بتانا چاہتا ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

اس سے پہلے کہ ہماری گفتگو آگے بڑھتی تنومند کمال رشید واپس آتا دکھائی دیا۔ وہ اب نارمل دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جو کچھ بتایا، اس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس نے مسجد اور مزار کے قریب سے تقریباً بیس ہندوستانی اور پاکستانیوں کو پکڑا ہے۔ اس کے علاوہ خاص خبر یہ ہے کہ مزار شریف میں سے سیکنڈ انچارج عبدالغفور کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس پر غیر اخلاقی سرگرمیوں کا الزام ہے۔ گرفتاری کے وقت مزاحمت کرنے پر پولیس نے اسے بے تحاشا مارا بھی ہے۔

میری نگاہوں میں وہ سارا منظر گھوم گیا جب میں نے پوسٹ آفس کی طرف جاتے ہوئے بازار میں انڈین سلیمان کو دیکھا تھا اور اس نے مجھے عبدالغفور کی کارستانیاں بتائی تھیں۔ کیا پتا عالی مقام کی ناراضی ہی اسے لے ڈوبی ہو۔

وہ رات ہم نے بڑے آرام و آسائش میں ایک لگژری بیڈ روم کے اندر گزاری۔ اکیلے میں امین نے مجھ سے کہا۔ ''ہارون بھائی! تم نے اس سندھی لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ مہرو کی بات کر رہا ہے۔ میں نے اسے آگاہ کیا کہ تہران کی ایک مسجد میں اس کے وارث مجھے مل گئے تھے اور اب وہ خیر خیریت سے ان کے پاس ہے۔ بہر حال میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ بغداد میں ہی ہے اور نہ ہی یہ بتایا کہ یہ جو ابراہیم میرے ساتھ ہے، وہ مہرو کے لیے ہی مارا مارا یہاں پھر رہا ہے۔

گفتگو کا رخ موڑنے کے لیے میں نے امین سے اس مقامی لڑکی کے بارے میں پوچھا جسے کمال رشید کا تھپڑ پڑا تھا اور وہ روتی ہوئی کمرے میں واپس چلی گئی تھی۔ امین ... بے پروائی سے بولا۔ ''کچھ نہیں ہارون بھائی! یہ کوئی ایسی شریف زادی نہیں ہے۔ پیسے کی خاطر سب کچھ کرتی ہے۔ بس نخرے دکھا رہی تھی۔ فرح نام ہے اس کا۔ کمال رشید نے ایسی ایک دو لڑکیاں رکھی ہوئی ہیں۔ مہمانوں کی آؤ بھگت کے لیے۔'' امین نے ایک آنکھ میچ کر کہا۔

''لیکن یار! کچھ بھی ہے۔ اس طرح سب کے سامنے کسی کی بے عزتی کرنا اچھی بات تو نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ کوئی عورت بھی بغیر مجبوری کے اس طرح کا پیشہ اختیار نہیں کرتی۔''

''ہارون بھائی! میں تمہیں کیا کیا بتاؤں، یہ عراق ہے یہاں سب کچھ چلتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تمہارا نیا دوست کمال رشید کرتا کیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''اسی ہوٹل کے گراؤنڈ فلور پر اس نے کچھ حصہ کرائے پر لیا ہوا ہے۔ وہاں ایک حمام کھولا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹا موٹا کام کرتا ہے۔''

''کیا چھوٹا موٹا کام؟''

''اچھا۔ صبح تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا۔ اب سو جاتے ہیں۔''

اسی دوران میں ابراہیم بھی کمرے میں واپس آ گیا۔ ہمیں بات چیت روکنا پڑی۔

اگلی صبح بڑی کراری دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ امین نے مجھ سے کہا۔ ''ہارون بھائی! فریش ہونا ہے تو نیچے کمال رشید کے حمام میں جا کر نہا لو۔''

میں اور ابراہیم لفٹ کے ذریعے نیچے پہنچے۔ حمام کے شاندار سلائڈنگ دروازے کے سامنے پہنچ کر ہمیں ٹھٹکنا پڑا۔ ایک طرف اسٹیل کی ایک چوڑی پلیٹ پر حمام کے بارے میں معلومات درج تھیں۔ پتا چلا کہ ان باتھ روم میں دو طرح کا غسل ہوتا ہے۔ ایک وہ جو بندہ خود کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو کوئی خوش اندام لڑکی اسے کراتی ہے۔ اس کے علاوہ بھاپ والا غسل بھی یہاں دستیاب تھا۔ سب کے علیحدہ علیحدہ ریٹ درج تھے۔ اسی دوران میں ہم نے دیکھا کہ سنجیدہ چہرے والی ''فرح'' بازو پر ایک بڑا تولیا لٹکائے حمام سے نکلی اور ایک دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ہم دونوں نے یہاں سے جانے میں ہی عافیت سمجھی اور اوپر اپارٹمنٹ میں جا کر غسل کیا۔

فنی ایبریویشن

Math
M:Mantle
A:Attack
T:To
H:Handsome
:StudentS
College
C:Come
O:On
L:Let
L:Love
E:Eachs
G:girl
E:Equally
LOVE
L:Loss of money
O:Out of mind
V:vaste of time
E:ends of life

مرسلہ: اقصیٰ احمد، ذوالفقار احمد، کرک

ایک پُرتکلف ناشتے کے بعد امین کے ساتھ میری طویل گفتگو ہوئی۔ یہ علیٰحدہ کمرے میں ون ٹو ون ملاقات تھی۔ امین نے بڑی رازداری کے لہجے میں مجھے بتایا کہ اس نے یہاں پہنچتے ہی کرسٹی اور اس کے دو عراقی دوستوں کے ساتھ مل کر ایک نہایت منافع بخش کاروبار شروع کر دیا ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ کویت پہنچنے میں لوگوں کی مدد کر رہے ہیں۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ ''کس طرح کی مدد؟''

''ہر طرح کی مدد۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

اس نے جو تفصیل بتائی، اس سے پتا چلا کہ کرسٹی اور اس کے دو تین ساتھی بذریعہ لانچ مسافروں کو کویت کے ساحل تک پہنچاتے ہیں اور ان سے معقول معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ کئی اور لوگ بھی ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور یہ پورا ایک نیٹ ورک ہے۔ اگر کبھی کبھار چھ مہینے میں ایک بار کوئی ناخوشگوار واقعہ ہو بھی جاتا ہے تو یہ لوگ ساحلی پولیس کو دے دلا کر معاملہ رفع دفع کرا لیتے ہیں۔ امین نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ اور اس کا ساتھی کمال کامیابی سے کویت کے دو پھیرے لگا بھی آئے ہیں۔ یہ کام اتنا آسان ہے کہ بندہ سوچ بھی نہیں سکتا۔

امین نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ مجھے پیشکش کی کہ اگر میں بھی چاہوں تو اس نہایت آسان، دلچسپ اور منافع بخش کام میں اس کے ساتھ شریک ہو سکتا ہوں اور یوں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر سکتا ہوں۔

میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''نہیں بھئی۔ مجھے تو تم معاف ہی کرو۔ مجھے دن دوگنی رات چوگنی ترقی نہیں کرنی۔ میں سیدھا سادہ بندہ ہوں۔ میری تو بس زیادہ سے زیادہ خواہش اتنی ہے کہ میں کسی طرح محنت مزدوری کر کے چار پیسے کما لوں اور عزت سے گھر واپس جا سکوں اور وہ بھی تب جب میرے دل کو سکون مل جائے۔ ابھی تو میں اس طرح کی ذہنی الجھنوں میں جکڑا ہوا ہوں کہ بس اپنے آپ میں ہی قید ہو کر رہ گیا ہوں...... ابھی تو......''

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے میری بات کاٹی۔ ''ہارون بھائی! میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پیسا روپیا ہر درد کی دوا ہے۔ جب پیسا ہوگا تو سارے معاملے خود بخود ہی سیدھے ہوتے چلے جائیں گے۔ تم دیکھ لینا۔''

''لیکن میں ایسا پیسا نہیں چاہتا جس میں ذرا سی بھی کوئی آلائش ہو۔''

''اس میں کوئی آلائش نہیں ہارون بھائی!'' امین زور دے کر بولا۔ ''تم ایک بار یہ کام کر کے تو دیکھو...... تمہاری آنکھوں کے سامنے چانن ہو جائے گا...... اور میں تمہیں کام بھی ایسا لے کر دوں گا جس میں کسی طرح کا کوئی رسک ہوگا ہی نہیں۔''

اس دن میرے اور امین کے درمیان طویل بحث ہوئی۔ اس نے مجھے بڑے خوب صورت منظر دکھائے لیکن اس کی کوئی بات بھی میرے دل کو چھو نہیں سکی۔ آخر میں، میں نے بس اتنا کہا۔ ''اگر تم میرے لیے کچھ کر سکتے ہو تو اتنا کرو کہ کسی طرح قانونی طریقے سے کویت پہنچنے میں میری مدد کر دو...... بلکہ...... ہو سکتا ہے کہ میرا ساتھی ابراہیم بھی میرے ساتھ جانا چاہے۔''

''قانونی طریقہ تو بہت لمبا ہے ہارون بھائی۔ سارا سال بھی لگے رہو گے تو کچھ نہیں بنے گا۔ بہرحال میں اس سلسلے میں کرسٹی سے بھی بات کرتا ہوں بلکہ آج ہی کرتا ہوں...... ویسے یہ ابراہیم تمہارا کچھ لگتا بھی ہے، میرا مطلب ہے کہ دور نزدیک سے کوئی رشتہ وغیرہ؟''

''نہیں...... میں نے تمہیں بتایا تو ہے یہ یہاں مجھے اتفاقاً ہی مل گیا ہے لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں...... بس تمہاری شکل کچھ کچھ ابراہیم سے ملتی ہے بلکہ شکل بھی نہیں بس تمہارا ماتھا اور آنکھیں وغیرہ اور شاید جب تم ہنستے ہو تو اس وقت بھی کچھ کچھ ابراہیم کی طرح لگنے لگتے ہو۔''

تھوڑی تھوڑی شکل ملنے والی بات اس سے پہلے ابوسیاف نے بھی کہی تھی۔ اس وقت میں نے زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی تو نہیں تھی لیکن میں جانتا تھا کہ میں قبول صورت ہوں۔ دوسری طرف ابراہیم بالکل عام شکل و صورت کا تھا اور اس کا رنگ بھی کچھ سانولا تھا۔ پھر بھی ہم دونوں کی صورتوں میں کوئی جھلک ایک دوسرے سے ملتی تھی۔ یہ محض ایک اتفاق ہی تھا اور ایسے اتفاق نظر آتے رہتے ہیں...... بالکل اجنبی اور غیر متعلق لوگوں میں تھوڑی بہت مشابہت دکھائی دے جاتی ہے۔

روضے پر واپس جاتے ہوئے ڈر تو لگ رہا تھا لیکن ذرا گہرائی میں جا کر سوچا تو اندازہ ہوا کہ ایسا کرنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہمارے سفری کاغذات پورے تھے اور ہم نے کسی طرح کا کوئی جرم بھی نہیں کیا تھا۔ اسی شام ہم روضے پر واپس آ گئے۔ امین کا ایڈریس میرے پاس موجود تھا۔ اب اس نے مجھے ایک فون نمبر بھی دے دیا تھا۔ وہ

چاہتا تھا کہ میں جلد از جلد اس سے رابطہ کروں۔

ابوسیاف اور روضے کے دیگر خدمت گار میرے لیے بہت پریشان تھے۔ مجھے صحیح سالم واپس دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ ابوسیاف نے بھی یہی کہا کہ ہمیں خوامخواہ بھاگنا نہیں چاہیے تھا۔ اگر پکڑے جاتے تو کسی نہ کسی شعبے میں جیل کی ہوا کھانا پڑتی۔ ابوسیاف نے بتایا کہ یہ بڑی سختی کا دور ہے۔ صدر صدام کی خفیہ پولیس لوگوں کو پکڑتی ہے اور پھر کبھی ان کا کھوج کھرا نہیں ملتا۔

ابوسیاف کو دیکھتے ہی عالی مقام سے ملنے کی تڑپ پھر میرے اندر بیدار ہوگئی۔ وہ سب کچھ پوری شدت سے یاد آ گیا جو مرکزی پوسٹ آفس کے قریب میرے ساتھ ہوا تھا۔ مجھے کسی روحانی سہارے کی شدید ترین ضرورت تھی اور یہ سہارا، میرے قریب آ کر مجھ سے دور چلا گیا تھا۔ میں نے ابوسیاف سے پوچھا۔ ''حضرت کا کچھ پتا چلا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لگتا ہے کہ وہ ابھی بغداد واپس ہی نہیں آئے لیکن جونہی وہ لوٹے ہمیں پتا چل جائے گا۔ میں نے ایک دو بندوں سے کہہ دیا ہے۔''

پتا نہیں کیوں، کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ حضرت مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتے۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ میں اپنے حالات کا مقابلہ خود ہی کروں۔ انہوں نے جو ایک چھوٹی سی چٹ میرے لیے لکھی تھی، وہ میں نے بڑی عقیدت سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ جب دل بہت پریشان ہوتا تو میں اس چھوٹے سے کاغذ کو نکال کر پڑھنے لگتا۔ اس پر عربی میں لکھے ہوئے الفاظ مجھے سہارا دیتے تھے۔

تیسرے روز ابراہیم کو روضے کے ساتھ والی مسجد میں چھوڑ کر میں پھر امین سے ملنے گیا۔ وہ ایک اچھے ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں اسی کرسٹی نامی لڑکی کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ لڑکی اس کے لیے منہ بولی بیوی کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ مجھے یہ سب کچھ ناپسند تھا اور میں نے کھل کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا لیکن لگتا تھا کہ امین نے میری باتوں سے کچھ خاص اثر نہیں لیا۔ بس مسکرا کر اتنا کہا۔ ''اوپر چڑھنے کے لیے سیڑھیوں کی ضرورت ہوتی ہے ہارون بھائی۔''

میں نے پوچھا۔ ''میرے کام کا کیا بنا؟''

''میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا ہارون بھائی! قانونی طریقے سے جانے والی بات تو دل سے نکال دو۔ ہاں باس سے بات ہوئی ہے اور میں نے تم دونوں کے لیے ان سے خاص رعایت بھی لے لی ہے۔ سمجھو کہ کرائے میں 75 فیصد ڈسکاؤنٹ ہوگا لیکن اس کے لیے تھوڑا بہت کام تمہیں بھی کرنا پڑے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''روضے میں اور آس پاس کے چھوٹے ہوٹلوں میں کئی ہندوستانی اور پاکستانی پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کویت جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں گے۔ تم کافی دنوں سے وہاں رہ رہے ہو۔ آسانی سے دو چار ایسے بندے ڈھونڈ سکتے ہو جو مناسب کرایہ دے کر کویت پہنچنے کا ارادہ رکھتے ہوں بلکہ کوشش کرو تو زیادہ بندے بھی مل سکتے ہیں۔''

''لیکن مجھے یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا۔'' میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

اس نے میرے انکار کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور مجھے قائل کرنے میں لگا رہا۔ وہ خاصا باتونی تھا اور بندے کو قائل کرنا بھی جانتا تھا۔ میری ذہنی کیفیت بھی کچھ عجیب تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ آدھ پون گھنٹے میں امین نے مجھے نیم رضامند کر لیا۔ اس نے مجھے باور کرا دیا کہ یہ بالکل محفوظ سفر ہے۔ روزانہ سیکڑوں لوگ اسی طرح سمندری راستے سے کویت میں آ جا رہے ہیں۔ گورنمنٹ بھی اس سلسلے میں زیادہ سختی نہیں کرتی۔

اس نے مجھے طریقہ کار بتایا کہ میں کس طرح کویت جانے کے خواہش مند افراد کا رابطہ کمال رشید سے کروا سکتا ہوں۔ یہ رابطہ کمال رشید سے نہیں دراصل اس کے ایک کارندے باقر احمد سے ہوتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''لیکن میں تمہیں ایک بات صاف بتا دوں۔ میں نے کسی کے لیے کسی طرح کی کوئی ذمے داری نہیں لینی ہے۔ اگر کوئی کویت جانے کا ارادہ رکھتا ہوگا تو میں اسے بتا دوں گا کہ وہ باقر احمد سے کس طرح مل سکتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتاؤں گا کہ اگر وہ جانے کا ارادہ کرے گا اور کرایہ وغیرہ دے گا تو اپنی ذمے داری پر دے گا۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔'' امین نے کہا۔

میں شام سے ذرا پہلے روضے والی مسجد میں پہنچا تو ابراہیم وہاں موجود نہیں تھا۔ پتا نہیں آج کل کہاں کہاں پھرتا رہتا تھا۔ ایک دو بار میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ بازار گیا ہوا تھا۔ ابراہیم اب میرے سفر کے حالات کے بارے میں کافی کچھ جان چکا تھا۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس سفر کے دوران میں چند روز ایسے بھی آئے تھے جب مہرالنساء یعنی مہرو میری ہمسفر رہی تھی۔ وہ یہ سب کچھ جان کر

بہت حیران ہوا تھا۔ اچانک مجھے ایک بات یاد آئی۔ جب پہلے دن ابراہیم میرے ساتھ یہاں آیا تھا اور اس نے مجھے اپنی روداد سنائی تھی تو باتوں کے دوران میں اس نے مجھے ایک کاغذ بھی اپنی جیب سے نکال کر دکھانا چاہا تھا لیکن اسی دوران میں ابوسیاف وہاں پہنچ گیا اور وہ بات وہیں کی وہیں رہ گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ آج ابراہیم سے اس کاغذ کے بارے میں پوچھتا ہوں۔

ابراہیم کی واپسی عشا کی نماز کے بعد ہوئی۔ وہ حسب معمول بہت گم صم نظر آرہا تھا۔ آنکھیں جیسے سوچی سوچی تھیں، وہ ایک بھیدوں بھرا شخص تھا۔ اس کے دل میں کیا تھا، کوئی نہیں جانتا تھا اور اس کے جسم پر کیا تھا، یہ بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کے سینے، پیٹ اور بازوؤں پر کئی جگہ ”مہرو“ کے نام کی مہر تھی لیکن ان مہروں کو اس کے لباس نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ایک قریبی ہوٹل سے خمیری روٹی اور ترکاری کا کھانا کھانے کے بعد ہم واپس احاطے میں آگئے اور ایک کونے میں بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ابراہیم...... مہرو کی باتیں کررہا تھا اور اس کی آنکھیں بار بار نم ہوجاتی تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”وہ کاغذ کیا تھا جو تم اس روز جیب سے نکال کر مجھے دکھانے لگے تھے؟“

وہ ذرا چونکا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ”ایک خط تھا...... میں نے مہرو کے لیے لکھا تھا۔“

”اب کہاں ہے وہ؟“

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہا۔ پھر ہمت کرکے بولا۔ ”وہ اس تک پہنچ گیا ہے ہارون بھائی۔“

”کیا مطلب...... کیا تم...... پھر جعفر کی طرف گئے تھے؟“ میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا...... اور جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ وہ مجھے بتائے بغیر جعفر کے گھر کے چکر لگاتا رہا ہے۔ جعفر کے گھر کی تیرہ چودہ سالہ ملازمہ لڑکی کے ذریعے اس نے اپنا لکھا ہوا خط مہرو تک پہنچایا ہے۔ نہ صرف خط پہنچایا ہے بلکہ اس کا جواب بھی حاصل کیا ہے۔

یہ سب کچھ حیران کردینے والا تھا۔ شاید وہ جعفر کے غصے کو ٹھیک سے جانتا نہیں تھا۔ وہ آگ سے کھیل رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا لکھا تھا تم نے اسے؟“

وہ اداسی بھرے لہجے میں بولا۔ ”وہی جو تیرہ چودہ برس تک اس سے نہیں کہہ سکا۔ میں نے لکھ دیا کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں اور اس سے زیادہ جتنا وہ سوچ سکتی ہے۔ اب میں اسے یہ بتانے کے لیے یہاں آگیا ہوں کہ واقعی اسے چاہتا ہوں اور واقعی اس کے لیے مرسکتا ہوں۔“

ابراہیم کی آنکھوں میں نمی تھی اور اس کے چہرے پر مضبوط ارادوں کی جھلک تھی۔ میں جیسے اندر سے لرز گیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اگر سدباب نہ کیا گیا تو یہاں کچھ بہت برا ہوسکتا ہے۔

میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”مہرو نے کیا لکھا ہے جواب میں؟“

وہ کچھ دیر ہچکچاتا رہا، جیسے سوچ رہا ہو کہ مجھے کہاں تک اپنا ہمراز بنائے۔ پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے اس نے اپنی قمیص کی بغلی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکال لیا۔ یہ کاپی سائز کے دو صفحے تھے۔ لکھائی باریک تھی اور ورق کی دونوں جانب لکھا گیا تھا۔ یہ ایک مڈل پاس لڑکی کی شکستہ لکھائی تھی مگر جو کچھ وہ بتانا چاہ رہی تھی، وہ واضح طور پر سمجھ میں آرہا تھا۔

یہ خط چونکانے والا تھا۔ ابراہیم کا یہ اندازہ بالکل درست تھا کہ مہرو اسے ناپسند نہیں کرتی...... بلکہ اس خط سے پتا چلتا تھا کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔ ایک موقع تھا جب اس کے معصوم دل میں یہ خواہش موجود تھی کہ اس کی شادی ابراہیم سے ہوجائے۔ شاید وہ بہت عرصے تک اس بات کی منتظر بھی رہی کہ ابراہیم اپنے دل کی بات اپنی زبان پر لائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پھر دھیرے دھیرے یہ ہوا کہ حالات بھی مخالف ہوتے چلے گئے۔ مہرو کو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی کہ اس کے اباجی اس کی شادی کہیں بھی کردیں مگر اسٹور کیپر ابراہیم سے ہرگز نہیں کریں گے۔ اباجی کی وفات کے بعد تو اس طرح کی امید بالکل ہی ختم ہوگئی۔ بڑے تایا کو ابراہیم کا نام سننا بھی گوارا نہیں تھا۔ دادی بھی بہت حد تک بڑے تایا کی ہمنوا ہوچکی تھیں۔ آہستہ آہستہ مہرو نے بھی خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا اور تہیہ کرلیا کہ وہ وہیں شادی کرے گی جہاں اس کے بڑے چاہیں گے۔

اب وہ بے حد پریشان تھی۔ اس کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ ابراہیم اس کے پیچھے ہزاروں میل دور یہاں بغداد آپہنچے گا اور اس سے اس طرح کا رابطہ کرے گا۔

خط میں ایک جگہ مہرو نے کچھ اس طرح کی بات لکھی تھی۔ ”میں بتا نہیں سکتی کہ میں کتنا ڈر رہی ہوں۔ تمہیں پا جعفر کا پتا نہیں۔ وہ میرا خون پی جائیں گے۔ اللہ کرے یہ خط صحیح سالم تم تک پہنچ جائے۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے کہ اس کو پڑھتے ہی پھاڑ کر پھینک دینا یا جلا دینا۔ اس کے بعد تم سے کبھی رابطہ نہیں کرسکوں گی۔ یہ بس آخری باتیں

ہیں جو میں تم سے کررہی ہوں۔ اب گزر جانے والے وقت کا ماتم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے ابراہیم۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ میں تیرہ سال تمہارے پاس رہی ہوں۔ تم اتنی دیر چپ رہے ہو تو اب کیوں بول پڑے ہو۔ کیا تمہاری محبت یہی ہے کہ میں ذلیل وخوار ہوجاؤں اور میرا بھائی منہ چھپاتا پھرے۔ اب میرا اور اپنا مان رکھ لو ابراہیم۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ جیسے آئے ہو ویسے ہی واپس چلے جاؤ۔ اب یہی ہمارے حق میں اچھا ہے۔ میں تمہارے لیے بہت دعا کروں گی۔ تمہیں بڑی اچھی بیوی ملے گی۔ وہ تمہارے ہر غم کی دوا بن جائے گی۔ تم بھی میرے لیے دعا کرنا۔“

خط میں کئی لفظ سندھی کے تھے اور کئی غلط بھی لکھے گئے تھے۔ بہرحال مضمون سمجھ میں آرہا تھا۔ میں نے سارا خط پڑھنے کے بعد کہا۔ ”اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟“

وہ عجیب جذباتی لہجے میں بولا۔ ”اب بات کھل ہی گئی ہے سائیں تو میں آپ کو بھی صاف صاف بتادوں۔ میرے سامنے اب دو ہی راستے ہیں، کسی طرح مہرو کو اپنا بنا لینا یا پھر یہیں اس شہر میں اپنی جان دے دینا۔ تیسرا کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔“

”یہ لوگ ماردیں گے تمہیں یا ساری عمر کے لیے جیل میں سڑا دیں گے۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے، یہاں کی پولیس کتنی سخت ہے۔ خاص طور سے غیر ملکیوں کے لیے۔“

”میں نے بتایا ہے نا۔ میرے پاس اب کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔“

”لیکن میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ تم...... مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

اس رات میں واقعی دیر تک سوچتا رہا۔ ہم چٹائیاں بچھائے احاطے میں ہی لیٹ رہے تھے۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر وہی ستارے تھے جو مجھے اپنوں کی یاد دلاتے تھے اور پاکستان کے گلی کوچوں میں پہنچا دیتے تھے۔ بہرحال اس وقت میں ابراہیم کی انوکھی پیار کہانی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ بات اب ثابت ہوچکی تھی کہ یہ محبت یک طرفہ نہیں۔ ہاں ابراہیم کی طرف سے اس محبت کی شدت کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس کے جسم پر ہی نہیں اس کی روح پر بھی مہرو کے نام کی بے شمار مہریں لگی ہوئی تھیں۔ مہرو نے تو خود کو کسی حد تک سنبھال لیا تھا لیکن وہ بہت آگے نکل گیا تھا۔ غالباً مہرو کے پاکستان سے چلے آنے کے بعد ابراہیم کو اپنے عشق کی اصل گہرائی اور شدت کا علم ہوا تھا۔

سوچتے سوچتے ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے چند ہفتے پہلے کی ایک بات یاد آگئی۔ میں اور مہرو زاہدان سے چھپتے چھپاتے تہران پہنچے تھے۔ وہاں ہوٹل میں مہرو نے باتوں باتوں میں مجھ سے کہا تھا۔ ”سائیں! جب آپ ہنستے ہو تو مجھے ایک اور بندہ یاد آجاتا ہے۔ وہ آپ کی طرح ہی ہنستا تھا۔“ میں نے پوچھا تھا۔ ”کون ہے؟“ اس نے معصومیت سے کہا تھا۔ ”میرا اپا ہے“ (بھائی ہے)

میں نے تنک کر کہا تھا۔ ”کیا میں تم کو اس لمبے چہرے والے جعفر کی طرح لگتا ہوں؟“

وہ بولی تھی۔ ”نہیں سائیں! میرا سگا اپا نہیں ہے۔ میرے چاچا کا پتر ہے۔“

آج پتا نہیں کیوں مجھے وہ بات یاد آگئی تھی۔ اس وقت مجھے پتا نہیں تھا کہ میری شکل صورت میں کسی زاویے سے تھوڑی بہت ابراہیم کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مہرو میرے لیے دل میں جو نرم گوشہ رکھتی تھی، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ مجھ میں ابراہیم کی شباہت موجود تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ عورت ایک تہ در تہ کہانی ہے۔ کہاں یہ کہ مہرو اسے مکمل طور پر ٹھکرا رہی تھی اور چاہ رہی تھی کہ وہ جلد از جلد بغداد سے چلا جائے...... اور کہاں یہ کہ وہ ایک ایسے شخص کو بھی انسیت اور عزت دیتی رہی تھی جو اس کے محبوب سے تھوڑا بہت ملتا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں ابراہیم اور مہرو کے لیے کیا کرسکتا ہوں۔ میں تو خود پریشانیوں میں گھرا ہوا ایک ایسا شخص تھا جس سے آگے جایا جارہا تھا، نہ پیچھے ہٹا جارہا تھا۔ میں مہرو سے مل کر اسے کوئی اچھا مشورہ دینے کی کوشش کرسکتا تھا لیکن مہرو سے ملنا ممکن نہیں تھا۔ آخری ملاقات کے بعد جعفر نے مجھ سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے گھر میں میرا آنا ہرگز پسند نہیں کرے گا۔

وہ رات میں نے تقریباً جاگتے ہوئے ہی گزاری، بس آخری پہر تھوڑی دیر کے لیے سوسکا۔ ابراہیم کی پریشانیوں کے علاوہ اپنی پریشانی بھی مجھے بدستور گھیرے ہوئے تھی۔ آنکھوں کے سامنے رہ رہ کر وہ منظر آجاتا تھا جب میں خط پوسٹ کرنے کے لیے پوسٹ آفس گیا اور میں نے جاگتی آنکھوں سے اور پورے ہوش وحواس کے ساتھ سفید ہیولے کو اپنے قرب وجوار میں پایا۔ یہ سائنس کا دور ہے۔ اٹل حقیقتوں کا زمانہ ہے لیکن جو کچھ میرے ساتھ ہورہا تھا، وہ سمجھ سے بالاتر تھا۔ یہ کوئی نفسیاتی کج روی تھی، بصری واہمہ تھا یا کچھ اور؟ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ حضرت عالی

مقام سے ملاقات کی ضرورت پھر بے حد شدت سے محسوس ہونے لگی۔

اگلے روز دوپہر کے قریب میں خود ہی حضرت امام کاظم کے روضے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابوسیاف نے مجھے بتا رکھا تھا کہ حضرت عالی مقام کبھی کبھی امام کاظم کے روضے کے پاس ایک جامع مسجد میں بھی نظر آتے ہیں۔ میرے لیے روضے پر جانے میں یوں بھی آسانی پیدا ہوئی کہ ہندوستانی زائرین کا ایک چھوٹا گروپ کیری ڈبے کے ذریعے امام کے روضے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے جانے پر تیار ہو گئے۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم روضے پر پہنچے۔ روح پرور مناظر دیکھے۔ میں ایک شخص سے قریبی جامع مسجد کا پتا پوچھ رہا تھا، جب میری نگاہ ایک تیرہ چودہ سالہ دبلی پتلی لڑکی پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ میں اس لڑکی کو جعفر کے گھر میں دیکھ چکا تھا۔ یہ ان کی ملازمہ تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ ایک جواں سال لڑکی بھی دکھائی دی۔ وہ کھلے لبادے میں تھی اور آنکھوں کے سوا تمام چہرہ سیاہ حجاب میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے ڈیل ڈول کو دیکھ کر مجھے شک گزرا کہ یہ کوئی اور نہیں مہرو ہے۔

اگلے ایک دو منٹ میں یہ شک درست ثابت ہوا۔ یہ مہرو ہی تھی۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا۔ چند سیکنڈ کے لیے تو یوں لگا کہ وہ مجھ سے کنی کترا کر نکل جانا چاہتی ہے لیکن میں اس کے بالکل سامنے پہنچ چکا تھا۔ وہ ایسا نہیں کر سکی۔ اس نے سر کے اشارے سے مجھے سلام کیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک کشادہ چھت پر موجود تھے۔ یہاں بس اِکادُکا نمازی ہی دکھائی دے رہے تھے۔ مہرو نے چھوٹی عمر کی لڑکی کو نیچے مزار کے احاطے میں ہی رہنے دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس لڑکی کی حیثیت مہرو کی ہمراز کی سی ہے اور وہ مہرو کی ہر بات مانتی ہے۔ چھت پر ایک جانب ایک پرانی سی کرسی پڑی تھی۔ میں نے مہرو سے کہا کہ وہ بیٹھ جائے۔ وہ لرز کر بولی۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے بابو سائیں۔ میں آپ سے اوپر کیسے بیٹھ سکتی ہوں۔“

”بے وقوفی کی باتیں نہ کرو...... بیٹھو۔“ میں نے ذرا غصے سے کہا۔

”نہیں بابو سائیں! مجھے گناہ گار نہ کریں۔“ اس نے کہا اور جلدی سے چھت کے فرش پر بیٹھ گئی۔ میں ٹپٹا کر رہ گیا۔ عجب نمونہ تھی۔ میں نے تماشا لگانا مناسب نہیں سمجھا اور خود بھی اس کے پاس گرد آلود فرش پر بیٹھ گیا۔

اس نے اپنا نقاب تھوڑا سا نیچے کھسکا دیا تھا۔ اس کی چاندی کی ننھی نتھ چمک دکھانے لگی تھی۔ میں نے دیکھا، اس کی خوب صورت آنکھیں سرخ اور ورم زدہ تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک خوب روتی رہی ہے۔ میں نے کہا۔ ”مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ تم سے یہاں اس طرح ملاقات ہو جائے گی۔“

وہ بولی۔ ”بابو سائیں! اس دن آپ کھانا کھائے بغیر ہی ہمارے گھر سے چلے گئے۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں نے آپ کے لیے بڑے شوق سے سندھی بریانی بنائی تھی۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہاری بنائی ہوئی بریانی میرے نصیب میں ہی نہیں ہے۔ چلو چھوڑو اس بات کو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا ابا جعفر تمہاری شادی کب کر رہا ہے؟“

شادی کے نام پر اس کے چہرے پر شرم اور دکھ کے سائے ایک ساتھ لہرا گئے۔ سنبھل کر بولی۔ ”ابھی تو شاید منگنی ہوگی۔ شادی کو سال کے قریب لگ جائے گا۔ پانے لڑکے سے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ رخصتی سے پہلے اپنا گھر بنا لے۔“

وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ اپنی امی حبیبہ مائی کے بارے میں بتانے لگی کہ وہ آج کل کچھ بیمار ہیں۔ چند دن پہلے جب میں مہرو کے گھر گیا تھا تو اس کی امی سے بھی مختصر بات ہوئی تھی۔ وہ پردہ کرتی تھیں اور الگ تھلگ رہنے کی عادی تھیں۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مہرو! مجھے لگتا ہے کہ تم تھوڑی دیر پہلے تک بہت روتی رہی ہو۔ تمہاری آنکھیں......“

وہ ذرا ٹھٹک کر بولی۔ ”ہاں جی...... جرا دعا مانگ رہی تھی۔“

”کس کے لیے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ گڑبڑا گئی۔ ”جج...... جی؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے پتا ہے مہرو تم کس کے لیے دعا مانگ رہی تھیں؟ تم ابراہیم کے لیے دعا مانگ رہی تھیں نا؟“

اس کا رنگ ایک دم ہلدی ہو گیا۔ چاندی کی نتھ لرز اٹھی۔ کچھ دیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”آ...... آپ...... اسے جانتے ہیں؟“

”جانتا ہوں تو نام لے رہا ہوں نا۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ یہاں بغداد میں موجود ہے...... اور...... اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔“ میں نے آخری الفاظ ذرا مسکراتے ہوئے کہے۔

وہ بہت نروس نظر آ رہی تھی لیکن میرا رویہ دیکھ کر اسے سنبھلنے میں مدد ملی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھپک کر کہا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ میں دوست ہوں دشمن نہیں۔“

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور معصومیت سے بولی۔ ”آپ...... اور...... کیا جانتے ہیں بابو سائیں؟“

”بہت کچھ۔“ میں نے پھر مسکرا کر کہا۔ ”مثلاً یہ کہ تم نے زاہدان میں یہ کیوں کہا تھا کہ جب میں ہنستا ہوں تو تمہیں کوئی اپنا یاد آ جاتا ہے۔“

”جج...... جی...... میں سمجھی نہیں بابو سائیں۔“

”بھئی تم نے کہا تھا نا کہ میں ہنستے ہوئے کسی کی طرح لگتا ہوں۔ اب مجھے پتا چل گیا ہے کہ میں کس کی طرح لگتا ہوں۔ تمہارے ابراہیم کو دیکھ لیا ہے میں نے۔“

”تمہارے ابراہیم“ کے الفاظ نے مہرو کے چہرے پر ایک بار پھر شرم آمیز دکھ کے سائے لہرا دیے۔ یہ گہرا دکھ تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے پلکیں جھکائیں اور بولی۔ ”اس کا نام نہ لیں بابو سائیں۔ وہ اب میری جندگی سے نکل چکا ہے۔ میں اپنے ابا سے بہت جیادہ پیار کرتی ہوں۔ ان کو کوئی دکھ نہیں دے سکتی۔ اگر...... اگر وہ آپ سے ملتا ہے تو اس سے کہہ دیں کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ نہیں تو اسے بہت جلیل ہونا پڑے گا۔ میں اسے بالکل بھول چکی ہوں بابو سائیں...... وہ بھی مجھ کو بھول جائے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ بات میری طرف دیکھ کر کہو کہ اسے بالکل بھول چکی ہو...... دیکھو...... دیکھو میری طرف۔“

وہ اسی طرح گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں۔ پھر اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ چہرہ گھٹنوں میں چھپا کر رونے لگی۔

میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ”مہرو! جھوٹی زندگی جینے سے بہتر ہے کہ دل بڑا کر کے سچ کا سامنا کر لیا جائے اور تمہیں بہت زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تمہاری کون سی ابھی شادی ہو رہی ہے۔ ایک سال سے زیادہ کا وقت ہے۔ اس ایک سال میں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تمہارا بھائی جعفر بس یہ چاہتا ہے کہ تمہاری شادی کسی برسرروزگار، کھاتے پیتے شخص سے ہو۔ کیا پتا کہ اس ایک ڈیڑھ سال میں ابراہیم ہی چار پیسے کما لے اور تمہارا ہاتھ مانگنے کے قابل ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری خاطر یہاں بغداد میں رہنے کے لیے بھی فوراً تیار ہو جائے گا۔“

مہرو نے اپنا سر بدستور گھٹنوں پر جھکایا ہوا تھا۔ اس نے سرگوشی میں حرکت دی اور اشک بار آواز میں بولی۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا بابو سائیں...... آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں...... مم...... میں آپ کو سچ بتاتی ہوں۔ میری شادی کہیں بھی ہو جائے...... مم...... میں خوش رہوں گی۔“

”تمہاری آواز، تمہارا ساتھ نہیں دے رہی مہرو...... یہ بات میری طرف دیکھ کر کہو۔“

وہ اسی طرح سر گھٹنوں میں دیے بیٹھی رہی۔

پتا نہیں، میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے مہرو سے کہا۔ ”تمہیں پتا ہے، میں اور ابراہیم کویت جا رہے ہیں۔ ایک کمپنی میں کچھ نوکریاں نکلی ہیں۔ امید ہے کہ اچھی ملازمت مل جائے گی۔“

اس نے اپنی تربتر آنکھیں میرے چہرے پر جمائیں اور معصومیت سے بولی۔ ”یہ...... کویت کہاں ہے؟“

”یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں بہت پیسا ہے۔ بندہ محنت کرنے والا ہو تو بڑی جلدی اس کے حالات بدل جاتے ہیں۔“

مہرو کے چہرے پر امید کی ایک کرن سی چمکی لیکن ایسا صرف ایک لمحے کے لیے ہوا۔ اگلے ہی لمحے چہرے کو پھر مایوسی اور دکھ نے ڈھانپ لیا۔ اس نے ایک آہ بھر کر الٹے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھے اور بولی۔ ”بابو سائیں! اس سے کہہ دیں وہ میرے لیے اپنے آپ کو دربدر نہ کرے۔ اس کے گھر میں اس کی بیمار ماؤ کو اس کی جرورت ہے۔ ویسے بھی جو کام ہو ہی نہیں سکتا، اس کی آس نہیں رکھنی چاہیے۔“

”تم زیادہ سیانی نہ بنو۔“ میں نے ذرا جھڑک کر کہا۔ ”اللہ سے اچھے کی امید ضرور رکھنی چاہیے۔“

اس نے سر جھکا لیا۔ ایسا کرتے ہوئے آنکھوں سے پھر چند آنسو گر گئے۔

اسی دوران میں ایک عراقی پہریدار اوپر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں عصا تھا۔ اس نے چھت پر موجود لوگوں کو نیچے جانے کے لیے کہا۔ میں اور مہرو بھی نیچے آ گئے۔

☆☆☆

اس روز شام تک میں امام کاظم کے روضے اور اردگرد کی مساجد میں حضرت عالی مقام کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا رہا لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ آج کل بغداد سے باہر کسی تبلیغی دورے پر ہیں۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے کا سفر کر کے میں بس کے ذریعے رات نو بجے غوث پاک حضرت عبدالقادر جیلانی کے روضے پر واپس پہنچا۔ یہاں ابراہیم بے تابی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے مہرو سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا...... تاہم ہمارے درمیان کویت جانے کے بارے میں

تفصیل سے بات ہوئی۔ کل تک کویت جانے کے بارے میں ہمارا ارادہ ڈانواں ڈول تھا لیکن آج میں نے ابراہیم کے سامنے پختہ ارادے کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ اگر ہمیں ایک موقع مل رہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ کیا پتا کہ حالات میں کوئی تبدیلی آجائے۔ یہ بات تو اب ابراہیم کو بھی معلوم ہو چکی تھی کہ مہرو کی شادی کو ابھی سال ڈیڑھ سال لگ جانا ہے۔ اس دوران میں اگر وہ اپنی مالی حالت درست کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلا لیتا تو بہتری کی امید کی جا سکتی تھی۔

ابراہیم نے مجھے خوش خبری والے انداز میں بتایا کہ اس نے دو ہندوستانیوں سے رابطہ کیا ہے اور وہ مطلوبہ کرایہ دے کر لانچ کے ذریعے کویت جانے کے لیے تیار ہیں۔

میں نے کہا۔ ''وہ تو تیار ہو گئے ہوں گے...... لیکن کیا تم بھی تیار ہو؟''

وہ بولا۔ ''ہارون سائیں! میں نے سوچا ہے کہ جو آپ کہو گے، میں وہی کروں گا۔''

''تو پھر میں تو کہتا ہوں کہ ہم ایک بار قسمت آزما کر دیکھ لیں، کیا پتا اللہ تعالیٰ ہمارا ہاتھ پکڑ لے۔''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''لیکن میں جانے سے پہلے ایک بار مہرو سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔ کم از کم اسے خبر تو دینا چاہتا ہوں کہ میں کچھ دیر کے لیے یہاں سے جا رہا ہوں۔''

''تمہارا رابطہ کرنا بہت خطرناک ہوگا ابراہیم۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''ہاں اطلاع دینے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔''

اسی دوران میں وہ دونوں افراد آتے دکھائی دیے جن سے ابراہیم نے کویت جانے کے بارے میں بات کی تھی۔ ان کے ساتھ ایک پٹھان جندل خاں بھی تھا۔ یہاں روضے میں قیام کے دوران میں جن لوگوں سے میری دوستی ہوئی تھی، ان میں سے یہ جندل خاں بھی شامل تھا۔ عمر پینتیس سال سے اوپر ہی ہوگی۔ وزیرستان کا رہنے والا تھا۔ نماز روزے کا پابند اور بڑے اچھے اخلاق کا مالک۔ گاؤں میں اس کی زمین قرضے کے بوجھ کی وجہ سے گروی پڑی ہوئی تھی۔ اس زمین کو چھڑانا جندل خاں کی زندگی کا سب سے خوب صورت سپنا تھا۔

جندل خاں نے آتے ساتھ ہی پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''اوئے پیو یار! تم نے ام کو بتایا ہی نہیں۔ تم لوگوں کو کویت لے کر جانے والا ہے۔''

میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''خدا کا نام لو جندل خاں۔ میں کسی کو کویت کیسے لے جا سکتا ہوں۔ میں تو خود کسی آسرے کی تلاش میں پھر رہا ہوں۔''

پھر میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ کویت لے جانے کی ہامی بھرنے والے کون لوگ ہیں اور وہ کیا کہتے ہیں۔ میں نے جندل خاں اور دونوں بھارتیوں کو اچھی طرح سمجھایا کہ میں ان لوگوں کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ لوگ...... مسافروں کو کویت لے جانے کا کام کر رہے ہیں۔ باقی تم لوگ خود ان سے ملو اور فیصلہ کرو کہ ان پر بھروسا کرنا ہے یا نہیں۔

اگلے دو تین روز تک مشوروں کا سلسلہ چلتا رہا۔ تین چار افراد ہوٹل جا کر کمال رشید کے نمائندے سے مل بھی آئے۔ پھر پتا چلا کہ کم از کم دس افراد بذریعہ لانچ کویت جانے کے لیے آمادہ ہو چکے ہیں۔ ان میں تین بھارتی مسلمان تھے۔ چار پنجابی اور سندھی بھائی تھے۔ دو پٹھان حضرات تھے۔ ان میں سے جندل خاں کے بارے میں تو میں نے بتایا ہے۔ دوسرے کا نام آفتاب گل تھا۔ یہ چالیس پینتالیس سالہ فربہ اندام شخص خیبر ایجنسی کا رہنے والا تھا۔ اس کا رنگ سرخ انگارے کی طرح تھا۔ بظاہر یہ شخص بھی خوش اخلاق نظر آیا تھا لیکن جندل خاں کا خیال تھا کہ شاید یہ شخص آزاد علاقے میں کوئی جرم کر کے بھاگا ہوا ہے۔

اس دوران میں ابراہیم بھی ذہنی طور پر کویت جانے کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا۔ اس نے چچا ابوسیاف کے کمرے میں بند ہو کر ایک طویل خط مہرو کے نام لکھا تھا۔ خط لکھ کر وہ باہر آیا تو میں نے چور نظروں سے دیکھا، اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ وہ یہ خط لے کر چلا گیا اور اگلے روز دوپہر کو واپس آیا۔ اس دوران میں میں اس کی خیر خیریت کی دعائیں ہی مانگ سکتا تھا۔ بہرحال آ کر اس نے بتایا کہ وہ جعفر کی تیرہ چودہ سالہ ملازمہ کے ذریعے وہ خط مہرو تک پہنچانے میں کامیاب رہا ہے۔ اس نے مجھے خط کے مندرجات کے بارے میں نہیں بتایا لیکن مجھے پتا تھا کہ محبت کی آگ میں جلتے ہوئے اس شخص نے مہرو کو کیا کیا لکھا ہوگا۔ وہ جس طرح خود انوکھا تھا، اس کی محبت بھی انوکھی تھی۔ میں نے اکثر اسے راتوں کو تنہائیوں میں سسکیاں لیتے سنا تھا۔

پتا نہیں کیوں ایک بار پھر میرے دل میں آئی کہ میں بھی اپنے گھر والوں کو کچھ لکھوں۔ میں نے جونہی ایسا سوچا، پھر وہی انجانا خوف دل و دماغ کو جکڑنے لگا جس نے چند دن پہلے مجھے نیم دیوانہ کر دیا تھا۔ میں نے ظہر کی نماز کے بعد دیر تک گڑگڑا کر دعا مانگی کہ میرے اندر کا خوف کم ہو۔

اس کے بعد میں چچا ابوسیاف کے حجرے میں چلا گیا۔ وہ کھانے کے بعد سویا ہوا تھا۔ میں نے کاغذ قلم لیا اور بیٹھ گیا۔ اچانک میری نگاہ سامنے دیوار پر لگے ایک لمبوترے سے آئینے پر پڑی۔ ابوسیاف سر اور ڈاڑھی وغیرہ میں کنگھی کرنے کے لیے یہ آئینہ استعمال کرتا تھا۔ میں نے آئینے میں دیکھا اور دم بخود رہ گیا۔ حقیقت پسند لوگ میری بات پر شک کا اظہار کر سکتے ہیں یا پھر اسے میری دیوانگی قرار دے سکتے ہیں لیکن میں وہی لکھ رہا ہوں جو میں نے دیکھا۔ مجھے آئینے میں اپنے پیچھے کوئی کھڑا نظر آیا۔ حالانکہ وہاں میرے اور چچا ابوسیاف کے سوا اور کوئی نہیں تھا...... اس کا فاصلہ مجھ سے سات آٹھ فٹ رہا ہوگا۔ اس کا ایک شانہ اندھیرے میں تھا لیکن دوسرا اجالے میں تھا اور اس پر سفید کپڑے کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے دہشت زدہ نظروں سے مڑ کر دیکھا...... میرے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ بس ایک کھونٹی پر ابوسیاف کا براؤن تولیا لٹک رہا تھا۔ میں نے پھر آئینے میں دیکھا۔ عقب میں کوئی کھڑا تھا۔ واضح نہیں تھا لیکن یہ وہی سفید پوش ہیولا تھا۔ میں نے پتھرائی ہوئی نظروں سے پھر پیچھے دیکھا...... بس خالی دیوار اور براؤن تولیا...... میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک مہیب لرزا دینے والی سرگوشی میرے کانوں سے ٹکرائی۔ کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا......

میں نہایت دہشت کے عالم میں اٹھا اور حجرے سے نکل آیا۔ مجھے لگا کہ میں اکیلا ہوا تو وہ مجھے دبوچ لے گا۔ میں ننگے پاؤں چلتا ہوا ایسی جگہ جا کھڑا ہوا جہاں بہت سے لوگ موجود تھے اور کسی بات پر بحث مباحثہ کر رہے تھے۔ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔

میرے شانے پر کسی نے عقب سے ہاتھ رکھا۔ میں اس بری طرح دہلا کہ پورا جسم سنسنا گیا۔ مڑ کر دیکھا۔ یہ جندل خاں تھا۔ اس نے کہا۔ ”کیا ہوا پوا! خو تم ٹھیک تو ہے؟“

”ہاں...... ہاں...... کچھ نہیں۔“ میں نے بے ربط انداز میں کہا۔

”خو کسی سے جھگڑا مگڑا تو نہیں ہوا؟“

”نہیں خان! ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا اور روضے کی لائبریری کی طرف چلا گیا۔ چچا سیاف نے ایک وظیفہ بتا رکھا تھا۔ میں اسے مسلسل پڑھنے لگا۔ پسینا میرے جسم کے ہر مسام سے نکل رہا تھا۔

اس رات بھی میں دیر تک جاگتا رہا۔ میرا دل اب گواہی دینے لگا تھا کہ میں کبھی اپنے گھر والوں سے رابطہ نہیں کر پاؤں گا۔ جب بھی ایسا سوچوں گا، میرے دل و دماغ میں قیامت برپا ہو جائے گی۔

کیوں ہو رہا تھا ایسا؟ کیا حل تھا اس کا؟ عالی مقام سے پھر ملاقات کیوں نہ ہو سکی تھی؟

اس رات ایک بار پھر اپنوں کی یاد بڑی شدت سے آئی۔ والد، والدہ، بڑے بھائی جان اسلم، چھوٹے بھائی جان فاروق، شعیب اور بہنیں...... اور ان کے ساتھ ساتھ عارفہ۔ سب کے چہرے ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آئے...... اور مجھے خون کے آنسو رلاتے رہے۔ مجھے لگا وہ سب کے سب ایک دھند میں گم ہوتے جا رہے ہیں۔

اگلے روز میں آخری بار عطا صاحب کے پاس کام پر گیا۔ وہ جانتے تھے کہ میں یہ کام چھوڑ رہا ہوں...... بہرحال میں نے انہیں اپنی کویت روانگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ انہوں نے زیادہ پوچھ گچھ بھی نہیں کی۔ بس یہی کہا کہ کبھی کبھی ملتے رہنا۔ میری جو محنت بنی تھی وہ انہوں نے اسی وقت مجھے نقد دے دی اور میں انہیں سلام کر کے اور ان کی دعائیں لے کر ان سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

دوسرے روز کمال رشید کا نمائندہ باقر خود روضے پر پہنچا۔ اس نے روضے کے سامنے واقع ایک قہوہ خانے میں، خواہش مند حضرات سے ملاقات کی۔ تقریباً پندرہ افراد کے ساتھ معاملات طے ہو گئے۔ ہر شخص نے فی کس تقریباً تین ہزار پاکستانی روپے دینے تھے اور بذریعہ لانچ کویت کے ساحل پر اترنا تھا۔ ان پندرہ افراد میں میرے اور ابراہیم کے علاوہ جندل خاں اور آفتاب گل بھی شامل تھے۔ آفتاب گل ایک طرح سے ہمارا لیڈر بن گیا تھا۔ باقر سے زیادہ تر بات چیت اسی نے کی۔ باقر کا تعلق پتا نہیں کس ملک سے تھا۔ بہرحال وہ اردو اور بنگالی بھی کسی حد تک جانتا تھا۔

اس روز شام کو ہم سب نے مشترکہ طور پر فیصلہ کیا اور اپنے اپنے پیسے باقر کو دے دیے۔ جیسا کہ امین نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، میرے اور ابراہیم سے رعایتی کرایہ لیا گیا۔ ہم دونوں نے فی کس تقریباً نو سو پاکستانی روپے دیے۔

باقر نے پورے گروپ کو تیاری کی ہدایت کی اور کہا کہ وہ ٹھیک چار دن بعد ہم سے پھر یہیں پر رابطہ کرے گا۔ باقر نے ہم دونوں سے بھی یہی کہا کہ ہم تیاری کریں، تاہم اس دوران میں کمال رشید صاحب یا امین سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہی بات دو دن پہلے امین نے بھی مجھ

سے کہی تھی۔

اب ہمارا انتظار شروع ہوا جو بہت کٹھن تھا۔ دل میں کئی طرح کے وسوسے بھی ابھر رہے تھے۔ اگر کمال رشید اور باقر وغیرہ کہیں اوجھل ہو جاتے تو ہمارا کیا ہوتا؟ پھر یہ اندیشہ بھی تھا کہ آگے سفر میں پتا نہیں کس طرح کے حالات پیش آئیں گے۔ ان دیکھے حالات کی فکرمندی ہر وقت ہمیں گھیرے رہتی تھی۔ ہر شخص کے اپنے اپنے سپنے تھے۔ ایک شخص اپنی جواں سال بیوی کی زندگی بچانے کے لیے کویت میں محنت مزدوری کرنا چاہتا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر بھارتی کو اپنی تین بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے تھے۔ آفتاب گل اپنے خاندان اور قبیلے سے الرجک تھا۔ وہ کویت جانا چاہتا تھا اور پھر وہاں سے کسی طرح سعودی عرب میں داخل ہو کر اپنی باقی زندگی خانہ خدا میں گزار دینے کا خواہش مند تھا۔ جندل خاں کی زمین پندرہ بیس برس سے گروی پڑی تھی۔ وہ یہ زمین چھڑا کر اپنی غربت کا جال توڑنا چاہتا تھا...... اپنے عزیز و اقارب کے سامنے سرخرو ہونا چاہتا تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کی شادیاں کرے اور اپنی فاقہ زدہ بیوی کے چہرے پر کم از کم ایک بار تو خوش حالی کی چمک دیکھ سکے۔

ہاں...... ہر شخص کے اپنے سپنے تھے اور ہر دل کے اپنے ارمان تھے۔ ہر نگاہ کویت پر لگی تھی اور ہر دل سے یہ دعا نکل رہی تھی کہ وہ بخیریت کویت پہنچیں اور دولت و خوش حالی کی اس سرزمین پر ان کے لیے ایک نئے دور کا آغاز ہو۔

ابوسیاف کو پتا چل چکا تھا کہ ہم یہاں سے کویت جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ابوسیاف کے ذریعے روضے کے دیگر خدمت گاروں کو بھی معلوم ہو چکا تھا۔ ان میں سے کئی میرے بڑے اچھے دوست بن گئے تھے۔ وہ مجھ سے ایک بے نام ہمدردی رکھتے تھے اور میری بھلائی دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ یہاں ہر اچھے برے وقت میں میرا سہارا بنے تھے۔ جن دنوں مجھے کوئی کام نہیں مل رہا تھا اور میری حالت بہت پتلی ہوتی جا رہی تھی، یہ لوگ میری ڈھارس بندھاتے تھے۔ لنگر سے میرے لیے باقاعدہ کھانا لے کر آتے تھے۔ مجھے مفید مشورے دیتے تھے۔ ان میں سے ایک مشورہ یہ بھی ہوتا تھا کہ میں اپنے وطن واپس چلا جاؤں۔ میں انہیں کیا بتاتا کہ میرے دل و دماغ نے میرے لیے واپس جانا کتنا مشکل بنا دیا ہے۔ جب میں روضے کے گرد و نواح میں کام ڈھونڈ رہا تھا، کچھ دن ایسے بھی آئے تھے جب مجھے اپنے تن بدن کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ مجھے وہ شب و روز بھی یاد تھے جب میرے جسم پر صرف ایک انڈرویئر ہوتا تھا اور میں نیم دیوانوں کی طرح روضے کے ارد گرد گھومتا رہتا تھا۔ ان دنوں میری حالت بھک منگوں کی سی ہو گئی تھی۔ کسی نے کچھ دیا تو کھا لیا ورنہ فاقہ کر لیا۔

بہرحال اب میں نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔ ابوسیاف کا خیال تھا کہ کویت میں روزگار تو واقعی بہت اچھا مل سکتا ہے لیکن مجھے جو قدم اٹھانا ہے، سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے۔ لوگ لانچ کے ذریعے کویت پہنچ بھی جاتے ہیں لیکن بعض کو بہت مشکل بھی ہوتی ہے۔ دیگر دوستوں نے بھی سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کا مشورہ دیا۔ بہرحال اب تو فیصلہ ہو چکا تھا۔ ہم رقم دے چکے تھے اور شدت سے باقر کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ نماز کے بعد سب خشوع و خضوع سے دعا مانگتے۔ خاص طور سے جندل خاں کو میں نے کئی بار دعا میں آنسو بہاتے ہوئے دیکھا۔ وہ پشتو میں گڑگڑاتا اور قدرت سے اپنے لیے آسانیاں مانگتا۔

انتظار کی گھڑیاں بڑی کٹھن تھیں۔ کمال رشید کے نمائندے نے منگل کی صبح آنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم سب روضے کے صحن میں اکٹھے ہو گئے اور فجر کی نماز کے بعد اس کا انتظار شروع کر دیا۔ ابوسیاف نے کہیں جانا تھا۔ میں نے کل شام کو ہی اسے خدا حافظ کہہ دیا تھا۔ دل میں جو سب سے بڑا دکھ تھا، وہ اس بات کا تھا کہ میں حضرت عالی مقام کو دوبارہ دیکھے بغیر یہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ کاش میں ان کو ایک بار پھر دیکھ سکتا۔ ان کی دید میرے اندر کے انجانے خوف کو شاید اتنا تکلیف دہ نہ ہونے دیتی۔ کسی وقت تو مجھے لگتا تھا کہ میں ہر وقت ایک نادیدہ موت کے گھیرے میں ہوں جو کسی بھی وقت مجھے دبوچ سکتی ہے۔ ابوسیاف کے حجرے میں آئینے کے اندر جو عکس میں نے دیکھا تھا اس کی یاد...... دل کو خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزا دیتی تھی۔ میں اس دن کے بعد ابوسیاف کے حجرے میں گیا ہی نہیں تھا اور اب تو ویسے ہی اس جگہ کو خدا حافظ کہنے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ میرا وہم تھا، تصور تھا، نظر کا دھوکا تھا یا پھر حقیقت تھی...... لیکن جو کچھ بھی تھا، میں اسے دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں خود کو اکیلا نہیں رہنے دیتا تھا۔ کم از کم ابراہیم تو ہر وقت میرے ساتھ ہوتا تھا۔

ہم صحن میں بیٹھے رہے، میری نگاہ غوث پاک کے روضے پر جمی رہی۔ آنکھیں نم رہیں اور دل سے دعائیں نکلتی رہیں۔ اس وقت سب سے اہم دعا تو یہی تھی کہ باقر احمد کی صورت نظر آ جائے۔ سورج نکلا...... آٹھ بجے...... اور پھر

دس بج گئے۔ ہماری بے چینی عروج پر پہنچ گئی اور پھر باقر دروازے پر نظر آیا۔ اس وقت وہ ہمیں رحمت کا فرشتہ ہی لگا۔ ایسا فرشتہ جو ہمارے لیے آسانیوں اور خوش حالیوں کی طرف جانے والے راستے کھولنے والا تھا۔ ہم نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔

اس نے عربی میں کہا۔ ”آپ سب لوگ اپنا سامان اٹھاؤ۔ ہم بس اڈے کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔“

ہمارے گروپ میں احسان نامی ایک حافظ قرآن بھی تھا اور وہ تھوڑی بہت عربی جانتا تھا۔ اس نے ہمیں ترجمہ کرکے بتایا۔

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ ہم نے فوراً اپنا اپنا سامان اٹھایا اور باقر کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ہم حضرت غوث پاک کے آبائی قبرستان کے پاس سے گزرے۔ مجھے وہ پہلی رات یاد آئی اور وہ دو قبریں بھی دکھائی دیں جن کے درمیان سے کسی نے مجھے کھینچ کر باہر نکالا تھا۔ وہ سارے مناظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔

قریباً آدھ گھنٹا پیدل چلنے کے بعد ہم بس اسٹینڈ پر پہنچے۔ یہاں سے دس مسافر مزید ہمارے ساتھ شامل ہوئے۔ باقر نے ہمیں ایک ایسی بس میں بٹھایا جس نے پاکستان کے دیہاتی علاقوں میں چلنے والے کھٹاروں کی یاد تازہ کر دی۔ سیٹیں پھٹی ہوئی، شیشے ٹوٹے ہوئے۔ دن کے بارہ بجے تھے جب بس روانہ ہوئی۔ بغداد سے نکلنے کے بعد کچھ دیر تک تو کہیں کہیں ہریالی نظر آتی رہی پھر لق ودق صحرائی علاقہ شروع ہو گیا، یہاں ریت کے بگولے اڑتے پھرتے تھے اور گرم ہوائیں ہمارے جسم جھلسا رہی تھیں۔ سب پتھر کے مجسموں کی طرح خاموش بیٹھے اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے...... بلکہ کہنا چاہیے کہ اندیشوں میں گم تھے۔ ابراہیم نے کہا۔ ”سائیں! کہیں رک کر کھانا وانا بھی کھلائیں گے یا اسی طرح چلا چلا کر بے ہوش کر دیں گے...... دیکھو تین بج چکے ہیں۔“

ابھی ابراہیم کی بات منہ میں ہی تھی کہ بس ایک ویران صحرائی ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ برا بھلا کھانا کھا کر ہم نے اپنے واٹر کولرز میں پانی بھرا اور پھر سے کھٹارا بس میں آبیٹھے۔ جلد ہی سورج نے غروب ہونے کی تیاری کر لی۔ آسمان پر ایک طرف کچھ گدلا پن سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے باقر احمد سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

اس نے عربی میں بڑے کھردرے پن سے جواب دیا۔ اس کی بات کا ترجمہ کرتے ہوئے حافظ احسان نے بتایا۔ ”باقر صاحب کہہ رہے ہیں کہ آندھی آ سکتی ہے۔“

واقعی کوئی ایک گھنٹے بعد آندھی آ گئی اور خوب آئی۔ یہ ریت کا طوفان تھا جس نے ہمیں سرتاپا ہلا دیا۔ ریت بس کی ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے اندر آئی اور برچھیوں کی طرح ہمارے جسم کے کھلے حصوں سے ٹکرانے لگی۔ بس رک گئی۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ ہر گھڑی یہی لگ رہا تھا جیسے بس الٹ جائے گی۔

”باہر نکل جاؤ...... سب باہر نکل جاؤ۔“ ہمارے گروپ لیڈر آفتاب گل نے چلا کر کہا۔

ہم بس سے باہر نکل آئے اور منہ سر لپیٹ کر اوندھے منہ ریت پر لیٹ گئے۔ ریت نے بڑی تیزی سے ہمیں ڈھانپنا شروع کر دیا۔ ایک دو منٹ بعد مجھے لگا کہ میں ریت میں زندہ دفن ہو رہا ہوں۔ چہرے سمیت میرا سارا جسم ریت میں جا رہا تھا۔ میں نے اپنا سر بہ مشکل ریت میں سے باہر نکالا لیکن چند ہی سیکنڈ بعد وہ پھر ریت میں دبنا شروع ہو گیا۔ ان لمحوں میں نہ جانے کیوں اپنی نئی نویلی دلہن کا چہرہ پھر میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ عارفہ! تمہیں کیا پتا، میں کس مصیبت میں ہوں۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو مجھے معاف کر دینا...... ہاں، اپنے بدنصیب دُلہے کو معاف کر دینا۔

وہ ایک قیامت تھی جو ہم پر گزری۔ قریباً پون گھنٹے بعد طوفان کی شدت کچھ کم ہوئی اور ہم اٹھ کر بس میں گھسنے کے قابل ہوئے۔

قارئین! میرے ساتھ جو جو پیش آیا، میں وہ بلاکم وکاست لکھتا چلا جا رہا ہوں...... وہ مناظر بڑے ہولناک تھے۔ بس کی باڈی کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے ایک بھارتی بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ اس آفت کے سدباب کے لیے بلند آواز میں اذانیں دے رہے تھے۔ ایک نوجوان لڑکا مسلسل روتا چلا جا رہا تھا۔ بس کے اندر بھی ریت بھر گئی تھی اور لگتا تھا کہ ”صحرا“ بس کے اندر داخل ہو گیا ہے۔

ہم نے رات کا باقی حصہ بس کے اندر ہی گزارا۔ صبح جندل خان نے اذان دی۔ اب موسم پُرسکون تھا۔ ہم نے ایک ٹیلے کے دامن میں تیمم کرنے کے بعد نماز پڑھی۔ اسی دوران میں باقر احمد نے کسی پاس کی صحرائی بستی سے چند مزدور بلوائے اور انہوں نے بس کے اندر کی ریت صاف کی۔ روکھا سوکھا ناشتا کر کے ہم نے پھر سفر شروع کر دیا۔

ریت سے اٹی ہوئی سڑک پر آہستہ روی سے چلتے ہوئے ہم سہ پہر قریباً چار بجے بصرہ پہنچ گئے۔ اس قدیم شہر کے گلی کوچوں میں خستہ حال وسادہ لوح لوگ گھومتے پھرتے

نظر آتے تھے۔ درودیوار پر بوسیدگی کی جھلک تھی۔ ہماری بس...... بس اسٹینڈ پر رکی تو ہم پچیس مسافر باقر احمد کی قیادت میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ کہیں کہیں سے ہمیں سمندر کی جھلک بھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ابراہیم سے کہا۔ ”ہم بچپن سے لاہور شہر کے گلی کوچوں میں یہ آوازیں سنتے آئے ہیں...... ”بصرے کی کھجوریں“ لو آج ہم نے بصرہ بھی دیکھ لیا۔“

ابراہیم خاموش رہا۔ وہ سارا راستہ ہی تقریباً خاموش رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دل ودماغ میں صرف اور صرف مہرو کا خیال ہے۔

ہم سمندر کے کنارے سے کچھ فاصلے پر ایک کشادہ کوٹھی نما مکان میں پہنچے۔ پتا نہیں کیوں مجھے امید تھی کہ یہاں امین سے ملاقات ہو گی۔ امین سے تو ملاقات نہیں ہوئی لیکن تنومند کمال رشید کا دیدار ضرور ہو گیا۔ وہ ایک سائبان کے نیچے صرف ایک نیکر پہنے اوندھا لیٹا تھا اور ایک لڑکی اس کی ٹانگوں کی مالش کر رہی تھی۔ لڑکی بھی مختصر لباس میں تھی۔ اس کے لمبے شہد رنگ بال آگے کی طرف جھول رہے تھے۔ جب اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے بال پیچھے ہٹائے تو میں حیران ہوا۔ یہ وہی خاموش آنکھوں والی فرح تھی۔ بغداد کے ہوٹل میں اس کی بے عزتی کا منظر میں ابھی تک بھولا نہیں تھا۔

کمال رشید نے بس ایک طائرانہ نظر ہم پر ڈالی اور پھر اوندھا لیٹ گیا۔ باقر ہمیں مکان کے اندرونی حصے میں لے آیا۔ یہ کافی کشادہ جگہ تھی۔ ہمیں تین کمروں میں ٹھہرا دیا گیا۔ مکان کے ایک برآمدے میں ایک رائفل بردار عراقی بھی ٹہلتا نظر آیا۔ اس کی آٹومیٹک رائفل دیکھ کر ہم کچھ اور بھی نروس ہوئے۔

کھانا وغیرہ کھانے کے بعد ہم سو گئے اور کافی دیر بعد اٹھے۔ باقر پاس سے گزرا تو میں نے پوچھا۔ ”باقر صاحب! کیا امین بھی یہاں ہی ہے؟“

باقر ٹوٹی پھوٹی اردو میں نہایت بے رخی سے بولا۔ ”اپنے کام سے کام رکھو۔ فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔“

میں کٹ کر رہ گیا۔ آفتاب گل کا چہرہ انگارے کی طرح دہک گیا۔ شاید وہ باقر سے کچھ کہتا لیکن جندل خان نے اس کا بازو دبا کر اسے بولنے سے روک دیا اور اس نے ٹھیک ہی کیا۔ ہمیں کسی طرح کی بدمزگی پیدا نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ہم ان لوگوں کے رحم وکرم پر تھے۔ وہ ہمارے ساتھ جو چاہے کر سکتے تھے۔ فی الوقت ان لوگوں کا رویہ ہمارے ساتھ ایسا ہی تھا جیسے مالک کا نوکروں سے ہوتا ہے...... بلکہ ادنیٰ نوکروں سے۔

احاطے میں ایک طرف کھجوروں کا ایک جھنڈ تھا۔ میں اور جندل خان ان کھجوروں کے نیچے آبیٹھے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے جندل خان سے کہا۔ ”آفتاب گل کو روک کر تم نے اچھا ہی کیا ورنہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔“

جندل خان بولا۔ ”یہ آفتاب بڑا غصے والا ہے۔ اس غصے کی وجہ سے ہی تو اس کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“

جندل خان کچھ دیر تذبذب میں رہا۔ پھر اس نے مجھے آفتاب گل کی روداد سناتے ہوئے کہا۔ ”خو، جہاں تک ام جانتا ہے...... آزاد علاقے میں آفتاب سے دو بندوں کا قتل ہوا تھا۔ یہ دو ڈھائی سال پہلے کی بات ہے۔“

”ایسا کیوں ہوا؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

جندل خان نے رازداری کے انداز میں آفتاب گل کی کہانی سناتے ہوئے بتایا۔ ”آفتاب گل کا بس ایک ہی اولاد تھا۔ اس کا بیٹی زرغونہ۔ وہ شادی شدہ تھا لیکن اپنے سسرال میں خوش نہیں تھا۔ اس کا خاوند محنت مزدوری کے لیے مسقط گیا ہوا تھا۔ سسرال والا زرغونہ کو بہت تنگ کرتا تھا۔ خاص طور سے اس کا سسر۔ وہ بہت سخت طبیعت کا تھا۔ ایک روز اس نے زرغونہ کو دھکا دیا۔ وہ بری طرح گر گیا۔ اس کا حمل خراب ہو گیا۔ اس کو اسپتال لے جایا گیا لیکن اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی وہ بیچارہ لڑکی ختم ہو گیا۔ اس کی موت کا اطلاع اتنا خوفناک تھا کہ اسے سنتے ہی آفتاب گل کا بیوی کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ ایک طرح سے آفتاب گل کا دنیا اندھیر ہو گیا...... بس یہی تو چھوٹا سا کنبہ تھا اس کا۔ وہ بجی تھری رائفل لے کر بیٹی کے سسرال میں گھس گیا۔ اس نے بیٹی کے سسر کو گولیاں مار دیں۔ بیٹی کا جیٹھانی سامنے آیا تو آفتاب نے اسے بھی نہیں چھوڑا۔ یہی عورت زرغونہ کے ساس سسر کے کان بھرتا تھا۔ وہ دونوں موقع پر ہی ختم ہو گیا۔ آفتاب گل بھاگ گیا۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ دشمنوں نے غصہ اس کے مکان پر اور اس کی کپڑے کی دکان پر اتارا۔ دونوں جگہوں کو آگ لگا دیا۔ زبردست دشمنی چل نکلا تھا۔ آفتاب کچھ دیر خیبر ایجنسی میں چھپا رہا۔ پھر چھپتا چھپاتا کوئٹہ پہنچ گیا اور کوئٹہ سے ادھر نکل آیا۔“

مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ آفتاب گل کی کہانی کچھ اس سے ملتی جلتی ہو گی۔ جہاں جہاں ناانصافی ہوتی ہے، وہاں

وہاں خون بھی بہتا ہے۔ یہ سلسلہ نہ جانے کب سے چل رہا ہے اور کب تک چلتا رہے گا۔

اسی دوران میں اندر سے ابراہیم نے ہمیں پکارا اور کہا کہ ہم کھانا کھالیں۔ ایک ہال کمرے میں دو بڑی بڑی چٹائیاں بچھی تھیں اور انہی پر ہمارے لیے کھانا لگایا جا رہا تھا۔ کھانا لگانے والوں میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے ایک وہی فرح نامی لڑکی تھی۔ ہمیں یہاں ایک دو اور لڑکیاں بھی نظر آئی تھیں۔ یقیناً وہ بھی فرح کی طرح ''خدمت گار'' ہی تھیں لیکن وہ مناسب لباس میں تھیں۔ صرف فرح ہی ایسی تھی جس کا لباس نازیبا تھا۔ اب بھی اس کے بالائی جسم پر برائے نام لباس تھا۔ زیریں جسم پر جینز کی ایک نیکر تھی۔ وہ اسی لباس میں ہمارے سامنے کھانا سرو کر رہی تھی۔

آفتاب گل سے نہیں رہا گیا۔ وہ بولا۔ ''ہارون! ام کو یہ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ امارا سر شرم سے جھک رہا ہے۔ آخر یہ لڑکی ٹھیک کپڑا کیوں نہیں پہنتا۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''سائیں! ہوسکتا ہے کہ یہ اس کی اپنی مرضی کے کپڑے نہ ہوں۔''

''کچھ بھی ہے لیکن یہ ٹھیک نہیں۔'' آفتاب نے کہا۔ ''اس کو کم از کم امارے سامنے تو اس طرح نہیں آنا چاہیے۔''

آفتاب اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے اپنے کندھوں سے اپنی چادر اتاری اور لڑکی کے شانوں پر ڈال دی۔ بولا۔ ''تم امارا بیٹی کی طرح ہے، ام کو اس طرح اچھا نہیں لگتا۔''

لڑکی اردو نہیں جانتی تھی۔ بس حیرانی سے آفتاب گل کی طرف دیکھتی رہی۔ اسی دوران میں ایک طرف سے باقر لپکتا ہوا آگیا۔ آفتاب سے مخاطب ہو کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔ ''کیا بات ہے سرخ آدمی؟'' وہ آفتاب کو سرخ آدمی ہی کہتا تھا۔

آفتاب نے کہا۔ ''یہ بچی ایسے کپڑوں میں کیوں پھرتا ہے، ام کو یہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔''

باقر نے چادر کو زور سے جھٹکا اور فرح کے کندھوں سے اتار پھینکا۔ پھنکار کر بولا۔ ''یہ ایسے ہی رہے گی، یہ باس کا حکم ہے۔''

''کیوں اس نے ایسا کیا جرم کیا ہے؟'' آفتاب نے پوچھا۔

''تم اپنے کام سے کام رکھو سرخ آدمی۔ یہ ایسے ہی کپڑوں میں رہتی ہے۔''

آفتاب کا چہرہ انگارے کی طرح دہکنے لگا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور ذرا دھیمے لہجے میں بولا۔ ''تو پھر..... اس کو اماری طرف نہ بھیجو۔ کسی اور کام پر لگاؤ۔''

باقر پھنکارا۔ ''یہ ادھر ہی رہے گی۔ یہی کام کرے گی۔ تم اپنی یہ منحوس آنکھیں بند کرلو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے آفتاب کو گالی دے دی۔

آفتاب، باقر کی طرف جھپٹا لیکن میں نے اسے راستے میں روک لیا۔ میں نے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا اور دھکیل کر پیچھے لے گیا۔ ابراہیم نے آفتاب کے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ دیا تھا کہ کہیں وہ باقر کو جوابی گالی نہ دے دے۔ ہماری یہ تدبیر کامیاب رہی اور ہم نے صورتِ حال کو سنگین ہونے سے بچالیا۔ رائفل بردار عراقی بھی فوراً موقع پر پہنچ گیا تھا۔ بہرحال کچھ دیر گرجنے برسنے کے بعد باقر باہر چلا گیا۔ بعد میں جندل خاں نے آفتاب کی طرف سے اس سے معافی مانگی اور اسے ٹھنڈا کیا۔ ہم سب نے آفتاب گل کو بھی سمجھایا کہ وہ تو ہمارا لیڈر ہے اگر وہ اس طرح غصے میں آئے گا تو پھر ہم سب کا بہت نقصان ہوجائے گا۔

وہ رات جیسے تیسے کٹ گئی۔ صبح ناشتا لانے والوں میں فرح شامل تھی اور پھر اسی لباس میں تھی۔ آفتاب گل منہ پھیرے بیٹھا رہا۔

نو بجے کے لگ بھگ ہمیں فربہ اندام کمال رشید کی صورت نظر آئی۔ اسے دیکھ کر ہم سب مؤدب کھڑے ہوگئے۔ اس نے روکھے سوکھے لہجے میں ہمیں کچھ ہدایات دیں، جن کا ترجمہ حافظ احسان نے ہمیں کر کے سنایا۔ کمال رشید نے کہا تھا۔ ''تم لوگوں کے پاس آج کا سارا دن ہے۔ شہر میں گھوم پھر لو...... اور کچھ خریداری کرنی ہے تو وہ بھی کرلو لیکن کسی اجنبی سے کسی طرح کی کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم رات کسی وقت یہاں سے نکلیں گے۔''

کمال رشید نے شہر میں سیر کرنے کا کہا تھا لیکن سیر تو اس وقت ہوتی ہے جب دل میں اطمینان اور خوشی ہو۔ ہم سب تو شدید ذہنی تناؤ کا شکار تھے۔ پتا نہیں کہ آج رات کو کس طرح کے حالات پیش آنا تھے۔ ہم کو لانچ کے ذریعے سفر کرنا تھا۔ اب خبر نہیں کہ یہ کس حد تک قانونی تھا۔ کمال رشید وغیرہ کا رویہ بھی زیادہ تسلی بخش نہیں تھا۔ ایک بار تو دل میں آئی کہ ابراہیم کو لے کر خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤں لیکن یہ فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے لیکن کیا ہونے والا ہے، اس کا اندازہ نہیں تھا۔

(جاری ہے)

رات کا مسافر

طاہر جاوید مغل

بے پروائی اور بے وقعتی کے سبب عہدِ حاضر کا انسان نہ تو اپنے قول کی پاسداری کرتا ہے اور نہ ہی اپنے فعل کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی کھیل اس کی زندگی کے ساتھ بھی کھیلا جا رہا تھا جس کے قول و فعل میں اگرچہ کوئی تضاد تو نہ تھا مگر اس کی زندگی ایک خاموش وعدے کے عوض گروی رکھ دی گئی تھی جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی ورنہ... بے وفائی کی صورت میں ویرانے اس کے منتظر تھے لیکن جس لمحے کا انتظار اس نے برسوں کیا... جب اس کی برسات میں بھیگنے کا وقت آیا تو تپتی دھوپ میں اس کے قدم صحرا کی جانب اٹھ گئے۔ جانے یہ اسی بھولے بسرے عہد سے منحرف ہونے کا نتیجہ تھا یا مقدر کی ستم ظریفی کہ کسی کے ہاتھوں کی مہندی اور سہرے کے پھولوں کی مہک بھی اس کے قدموں کو روک نہ سکی... اس نے منہ کیا پھیرا کہ خوابوں نے بھی آنکھوں سے رختِ سفر باندھ لیا... بے سمت بھٹکتے ہوئے اس لمبی مسافت میں اب اسے اجنبی چہروں کے سوا اور کیا ملنا تھا۔ تاریک رستوں پر اس کا ہم سفر بس ایک سایہ تھا جو آسیب کی مانند اسے ایک پل کے لیے بھی خود سے جدا نہ کرتا تھا، خدا جانے یہ محبتوں کی انتہا تھی یا نفرتوں کا انتقام... جو بھی تھا اسے زندگی سے دور جانا تھا، چاہے آگ کا دریا عبور کرتے ہوئے یا گرم صحرا پار کرتے ہوئے... ہر حال میں اس عہد کی پاسداری لازم تھی کہ جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی۔

منظورِ نظر کی نظروں میں رہنے کے لیے ایک اندھے راستے کا

زندہ ماجرا

تیسرا اور آخری حصہ

ہمیں کو لانچ کے ذریعے سفر کرنا تھا اور یہ بھی خبر نہیں تھی کہ یہ قانونی تھا یا غیر قانونی مگر ہم سب لوگ تین چار ٹولیوں میں نکل گئے۔ میں اور ابراہیم علیحدہ نکلے۔ ہم نے کچھ خشک راشن لیا جس میں بسکٹ، کھجوریں اور ملک پاؤڈر وغیرہ شامل تھے۔ میں نے خاص طور پر چند شاپرز لیے۔

"سائیں! ان کا کیا کرو گے؟" ابراہیم نے پوچھا۔

"یہ میرے اور تمہارے کام آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"کس کام؟"

"بھئی یہ پلاسٹک کے شاپرز ہیں۔ ان میں رکھ کر ہم اپنی چیزوں کو واٹر پروف کر لیں گے۔ سمندر کا پانی بڑا ظالم ہوتا ہے۔"

"تو سائیں، تمہارا خیال ہے کہ ہمیں سمندر میں غوطہ

لگانا پڑے گا؟''

''کیا پتا ایسا ہی ہو۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

غربت کے مارے ہوئے بصرہ شہر میں دو تین گھنٹے گھوم پھر کر ہم اپنے ڈیرے پر واپس پہنچ گئے۔ گروپ کے سارے لوگ ایک دوسرے کو اپنی شاپنگ دکھا رہے تھے۔ میرے پاس بڑے بڑے شاپرز دیکھ کر دیگر لوگوں کے ذہن میں بھی وہی سوال ابھرے جو ابراہیم نے مجھ سے کیے تھے۔

سورج غروب ہوتے ہی مغرب کی اذان ہوئی۔ باقر نے رات دس بجے کے قریب آنے کا کہا تھا۔ جوں جوں وقت نزدیک آرہا تھا ہماری بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ ہم سب نے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کی اور دیر تک نم آنکھوں کے ساتھ دعائیں مانگتے رہے۔ کئی ایک نے نمازِ حاجات بھی ادا کی۔ نماز کے بعد ہم نے اپنا اپنا سامان باندھ لیا۔ میں نے تین چار شاپرز ابراہیم کو بھی دیے۔ ایک شاپر میں، میں نے اپنا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات رکھے اور اس کی کئی تہیں بنا کر اوپر سے باندھ دیا۔ ایک شاپر میں کھانے پینے کی اشیا اور ایک میں جوتے اور کپڑوں کا جوڑا رکھ لیا۔ ابراہیم نے بھی میری ہی طرح کیا...... میں نے پاسپورٹ والا لفافہ اپنی پنڈلی سے باندھا تھا۔ مکمل تیاری کے بعد ہم بڑی بے قراری سے روانگی کا انتظار کرنے لگے۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی جارہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ کمال رشید اور باقر دونوں کوٹھی میں نہیں ہیں۔ اندیشے دل و دماغ کو گھیرنے لگے۔ نظریں بار بار گھڑی کی سوئیوں کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ ہمیں باقر کی شکل نظر آئی اور ہمارے جسموں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ باقر کے ساتھ دو کمانڈو ٹائپ افراد تھے۔ باقر نے ہمیں اٹھنے اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

ہم کٹھ پتلیوں کی طرح کھڑے ہوگئے اور اپنا اپنا سامان اٹھا کر اس کے ساتھ چل دیے۔ آفتاب گل سب سے آگے تھا۔ ہم ایک نیم تاریک گلی میں کھڑے ایک ٹرک تک پہنچے۔ اس کھٹارا ٹرک کی چھت نہیں تھی۔ بیٹھنے کے لیے کوئی سیٹ بھی نہیں تھی۔ مسافروں نے احتجاج کیا تو ایک عراقی نے گرج کر ہمیں بیٹھنے کا حکم دیا۔ ہم ٹرک کے فرش پر ہی بیٹھ گئے۔

دس پندرہ منٹ بعد ٹرک نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور ٹوٹی پھوٹی نیم تاریک سڑکوں پر آگے بڑھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم شہر سے دور بالکل تاریک راستے پر سفر کر رہے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ٹرک کی ہیڈ لائٹس بھی آن نہیں کی گئی تھیں۔ ہم سب پتھر کے مجسموں کی طرح بالکل گم صم بیٹھے تھے۔ حتیٰ کہ ہر وقت بولنے والا آفتاب گل بھی خاموش تھا۔

قریباً دو گھنٹے تک ٹوٹی پھوٹی بدحال سڑکوں پر سفر کرنے کے بعد ہمارا ٹرک ایک ویران ساحل پر پہنچ گیا۔ رات کے سناٹے میں لہروں کا مدھم شور سنائی دیتا تھا۔ ہمیں ٹرک سے اتارا گیا۔ ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ٹرک کے اگلے کیبن میں سے دو لڑکیاں بھی نیچے اتریں۔ ان میں سے ایک وہی ادھورے لباس والی فرح تھی..... فی الوقت اس کا لباس کچھ مناسب ہی تھا۔ ہم سب اندھیرے میں چلتے ہوئے کچھ چٹانوں کی اوٹ میں پہنچ گئے۔ باقر نے کہا۔ ''سب چپ چاپ بیٹھ جائیں۔ کوئی کسی طرح کی لائٹ نہیں جلائے گا۔ کوئی اونچی آواز میں بات نہیں کرے گا۔''

ہم سب ڈرے سہمے چٹانوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ دونوں لڑکیاں بھی ایک طرف خاموش بیٹھی تھیں۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کتنی دیر انتظار کرنا ہے اور آگے کیا پیش آنا ہے۔ اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ باقر یا اس کے ساتھیوں سے کچھ پوچھ سکتے۔ ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ دور کہیں سمندر کے سینے پر روشنیاں سی ٹمٹما رہی تھیں۔ غالباً یہ نامعلوم سمتوں میں سفر کرنے والے بحری جہاز تھے۔ ہمیں قریباً آدھ گھنٹا انتظار کرنا پڑا اور یہ انتظار، ناقابلِ بیان حد تک مشکل تھا۔ بالآخر لانچ کے انجن کی آواز آئی مگر روشنی پھر بھی دکھائی نہیں دی۔

''سب لوگ لانچ میں چلو۔'' باقر نے بڑے تحکم سے کہا۔

ہم سب روبوٹس کی طرح اٹھے اور بجلی کی سی تیزی سے لانچ میں جا بیٹھے۔ لانچ کافی بڑی تھی، بری بھلی نشستیں بھی موجود تھیں۔ کہیں سے ڈیزل کی بو آرہی تھی۔ دو مسلح محافظ لانچ میں موجود تھے۔ دونوں لڑکیاں لانچ کے چھوٹے سے کیبن میں چلی گئیں۔ ایک آواز تاریکی میں ابھری۔ ''سب آگئے؟''

میں چونک گیا۔ یہ امین کی آواز تھی۔ اس کے سوال کا جواب آفتاب گل نے دیا۔ ''ہاں سب آگئے۔''

لانچ روانہ ہوگئی۔ اس کی لائٹس اب بھی آف تھیں۔ سب خاموش اور خوفزدہ تھے۔ باقر اور اس کے ساتھی وہیں ساحل پر رہ گئے تھے۔ اب ہم نئے لوگوں کے حوالے تھے۔ بہرحال امین کی موجودگی سے مجھے کچھ تسلی ہو رہی تھی۔ امین کے ساتھ میری علیک سلیک ہوئی اور ہم لانچ کے پچھلے حصے میں کیبن کے پاس جا بیٹھے۔ ''تم کہاں تھے؟

اتنے دن نظر ہی نہیں آئے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس مصروفیت چل رہی تھی۔'' امین نے مختصر جواب دیا۔

''وہ تمہاری دوست کرسٹی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ہوٹل میں ہی ہے۔'' امین نے پھر مختصر جواب دیا۔ وہ ٹینشن میں نظر آتا تھا۔

اگلے چار پانچ منٹ میں ہمارے درمیان جو باتیں ہوئیں، ان سے پتا چلا کہ ہمارا یہ سفر قریباً دو گھنٹے کا ہوگا۔ ہم ایک محفوظ راستے سے کویت کے ساحل تک پہنچیں گے۔ کمال رشید بھی ساتھ تھا اور کیبن میں موجود تھا۔

لانچ درمیانی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس میں دو مسلح افراد موجود تھے اور وہ گاہے بگاہے ٹیلی اسکوپس کے ذریعے اردگرد کا جائزہ بھی لیتے تھے۔ اب امین قدرے ''ریلیکسڈ'' نظر آنے لگا تھا۔ شاید ہم لوگ زیادہ خطرناک علاقے سے گزر گئے تھے۔ اسی دوران میں مجھے فرح نظر آئی۔ وہ کیبن سے نکلی تھی اور ایک بار پھر مختصر لباس میں نظر آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ٹرے میں گلاس اور بیئر وغیرہ لے کر پھر کیبن میں چلی گئی۔

میں نے امین سے پوچھا۔ ''کمال رشید کے حرم میں اور لڑکیاں بھی ہیں لیکن یہ فرح ہمیشہ بیہودہ لباس میں نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ اسپیشل سلوک کیوں ہو رہا ہے؟''

''بس، یہ اس کی اپنی بیوقوفی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

وہ ہولے سے مسکرایا۔ ''بندہ مجبور ہو اور اس میں اکڑ بھی ہو تو پھر وہ اسی طرح ذلیل ہوتا ہے۔ کمال رشید کی نوکری کرنا اس لڑکی کی مجبوری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ اڑی (مزاحمت) بھی کرتی ہے۔ پچھلے مہینے کمال رشید کے کچھ مہمان انڈیا سے آئے تھے۔ اس نے ان کے سامنے تھوڑے کپڑے پہننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ صرف حرم میں تھوڑے کپڑے (مختصر لباس) پہننے کی پابند ہے۔ کمال رشید اس پر چڑھ گیا۔ اب دیکھو یہ نہ صرف حرم میں بلکہ اس کے علاوہ بھی ایسی لباس پہننے پر مجبور ہے۔ باقی لڑکیوں نے اس سے نصیحت پکڑی ہے۔''

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے امین سے پوچھا۔ ''اب یہ دو لڑکیاں کہاں جارہی ہیں؟''

اس نے لوفر انداز میں آنکھ دبائی اور بولا۔ ''ذرا کویت میں ''مہمان نوازی'' کرنے کے لیے۔''

''مہمان نوازی؟''

''یہاں سب کچھ چلتا ہے ہارون بھائی! کویت کے کسی شیخ نے ایک دو ہفتوں کے لیے مانگا ہے ان دو لڑکیوں کو۔ مال شال اکٹھا کر کے واپس آجائیں گی۔ اس میں زیادہ حصہ کمال رشید کا ہوگا۔ تھوڑا بہت ان کو بھی ملے گا۔''

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ بااختیار لوگ اور دولت کے پجاری، عورت کو کس کس طرح رسوا کرتے ہیں۔ یہ رسوائی ہر دور میں اور ہر خطے میں ہوتی رہی ہے اور شاید آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔ جب تک عورت اپنا مقام نہیں پہچانے گی اور اپنی اصل طاقت و توانائی کا ادراک نہیں کرے گی، وہ ایسے ہی کچلی جاتی رہے گی۔ کبھی مذہب اور رسم و رواج کے نام پر۔ کبھی رشتوں ناتوں کے جال پھینک کر اور کبھی صرف اس کی جسمانی کمزوری کو جواز بنا کر اسے پامال کیا جاتا رہے گا۔

میں امین کو سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ کمال رشید جیسے شخص کے ساتھ نہ چلے...... اور اس گورکھ دھندے سے دور ہوجائے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ مانے گا نہیں۔ وہ بہت اونچی ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد لانچ کے عملے میں بے چینی سی نظر آئی۔ وہ آپس میں کھسر پسر کر رہے تھے اور بار بار ٹیلی اسکوپس کے ذریعے کچھ دیکھنے لگے تھے۔ امین بھی اٹھ کر مسلح گارڈز کے پاس چلا گیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ لانچ کو ایک جگہ تاریکی میں روک دیا گیا اور انجن بند کر دیا گیا۔ اسی دوران میں لمبا تڑنگا کمال رشید بھی کیبن میں سے نکل آیا۔ وہ واضح طور پر نشے میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے واکی ٹاکی نکالا اور عربی میں کسی سے باتیں کرنے لگا۔ ہم پچیس مسافر بالکل بچوں کی طرح ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ پتا نہیں یہاں کیا ہونے جارہا تھا۔

کچھ دیر بعد لانچ پھر چل پڑی۔ اس مرتبہ اس کی

مشورہ

ایک سیاح ہوٹل میں گیا تو بیرے نے آکر آرڈر لیا۔ سیاح نے فرائی مچھلی منگوائی۔

بیرا مچھلی لے آیا اور پوچھا۔ ''اور کچھ؟''

سیاح نے کہا۔ ''ہمدردی کے دو بول۔''

بیرا اپنا منہ سیاح کے کان کے پاس کر کے بولا۔ ''مچھلی نہ کھانا دو دن کی باسی ہے۔''

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

اسپیڈ تیز تھی۔ امین ابھی تک مسلح گارڈز کے پاس ہی موجود تھا۔ اچانک ایک گارڈ نے زور زور سے چلانا شروع کردیا۔ کمال رشید پھر کیبن سے باہر نکل آیا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے ہارون سائیں!“ ابراہیم نے پریشانی کے عالم میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”کچھ گڑبڑ ہی لگ رہی ہے۔“

ہمیں دو روشنیاں بڑی تیزی سے اپنی طرف بڑھتی دکھائی دیں۔ کچھ ہی دیر میں یہ روشنیاں قریب پہنچ گئیں۔ یہ ایک بڑے سائز کی اسپیڈ بوٹ تھی۔ اس کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ یہ سرکاری بوٹ ہے۔ سامنے ہی ڈیک پر دو باوردی افراد کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید رائفلیں تھیں...... بوٹ میں سے کسی نے میگافون کے ذریعے لانچ چلانے والے کو لانچ روکنے کا حکم دیا۔ لانچ کی رفتار آہستہ ہوئی اور سرکاری بوٹ اس کے سامنے آکر رک گئی۔ ہماری حالت بہت بری تھی۔ گلے خشک ہوچکے تھے۔ ہم ڈری ڈری نظروں سے کمال رشید اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ خود بھی پریشانی کی انتہا کو چھو رہے تھے۔

ہماری لانچ سرچ لائٹس کی روشنی میں نہا گئی۔ ساحلی محافظوں کا انچارج ڈیک پر آیا اور اس نے کرخت لہجے میں کچھ پوچھا۔ اس کی بات کا جواب کمال رشید نے دیا۔ دونوں میں سات آٹھ جملوں کا تبادلہ ہوا۔ باوردی محافظوں نے اپنی رائفلیں سیدھی کرلیں۔ کمال رشید کے دو مسلح گارڈز کیبن کے عقب میں تھے اور نظر نہیں آرہے تھے۔ اچانک باوردی انچارج کا لہجہ مزید تلخ ہوگیا۔ وہ بوٹ کو چلا کر آگے لے آیا۔ غالباً وہ لوگ لانچ پر اترنا چاہتے تھے۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ نشے میں دھت کمال نے وہ غلطی کی جو شاید اسے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ تیزی سے نیچے جھکا اور اس نے ایک ترپال کے نیچے رکھی ہوئی گن اٹھالی۔ یہ جی تھری ٹائپ کی گن تھی۔ اس نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ باوردی انچارج پر فائر کیا...... لیکن اس کا نشانہ خطا گیا۔ نشانہ خطا ہونے کی وجہ بڑی عجیب تھی۔ اس ”وجہ“ کا نام فرح تھا۔ وہ کمال کے قریب ہی کھڑی تھی۔ میں نے دیکھا وہ بے دریغ کمال رشید کی طرف بڑھی اور اس کی رائفل پر جھپٹا مارا۔ رائفل کا رخ بدلنے سے فائر خالی گیا۔

فرح رائفل سے چمٹ گئی تھی۔ کمال رشید نے رائفل کو زوردار جھٹکے دیے۔ پھر اپنی ٹانگ کی ضرب سے فرح کو دور پھینک دیا۔ وہ جیسے غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے فرح کو نشانہ بنانا چاہا لیکن تب میں نے جی دار پٹھان آفتاب گل کو دیکھا۔ وہ فرح کو بچانے کے لیے کمال رشید پر جھپٹ پڑا۔ ”نہیں استاد نہیں۔“ وہ پکارا۔

کمال رشید نے گولی چلادی جو سیدھی آفتاب گل کی ران میں لگی۔ سرکاری کشتی میں موجود گارڈز شاید گولی چلاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ لانچ میں موجود مسافروں کو نقصان پہنچے گا مگر جب انہوں نے دیکھا کہ کمال رشید بے دریغ فائرنگ کر رہا ہے تو انہوں نے بھی گولی چلادی۔ ان کی رائفلوں نے دھماکے سے شعلے اگلے۔ میں نے کمال رشید کو پہلو کے بل گرتے دیکھا۔ جی تھری ٹائپ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

کمال کو گرتے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے کیبن کے پیچھے سے سرکاری کشتی پر فائرنگ شروع کردی۔ ”لیٹ جاؤ...... فرش پر لیٹ جاؤ۔“ میں نے پکار کر ساتھیوں سے کہا۔ ہم سب اوندھے منہ لانچ کے فرش سے چپک گئے۔ یہی وقت تھا جب میں نے امین کو زخمی ہو کر پانی میں گرتے دیکھا۔ گولی شاید اس کے پیٹ میں کہیں لگی تھی۔ اکثر مسافر بلند آواز سے کلمہ پڑھ رہے تھے۔ ان کی آوازیں دھماکوں کے شور میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھیں۔

یکایک لانچ کو ایک زور کا جھٹکا لگا۔ لانچ ڈرائیور نے پوری رفتار سے لانچ بھگادی تھی۔ جونہی لانچ بھاگی، کسی نے لانچ کے اندر سے سمندر میں چھلانگ لگادی۔ یہ فرح تھی۔ میں نے سرچ لائٹ میں اس کے سرخ لباس کی جھلک صاف دیکھی۔ وہ مختصر لباس جو اس کے جسم کو چھپاتا کم اور دکھاتا زیادہ تھا۔

سرکاری بوٹ نے بھی اسٹارٹ لیا اور تیزی سے لانچ کے پیچھے آئی۔ تب مجھے پتا چلا کہ سرکاری بوٹ سے بھی دو گارڈز نے پانی میں چھلانگیں لگائی ہیں۔ انہوں نے لائف جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ وہ یقیناً فرح کو پانی سے نکالنا چاہتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ زخمی امین بھی ان کے ہاتھ لگ جاتا۔

اب لانچ انتہائی رفتار سے نامعلوم سمت میں اڑی جارہی تھی۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ وہ اچھل کر ہوا میں تیرنے لگی ہے۔ سرکاری بوٹ بھی پوری اسپیڈ سے پیچھے آرہی تھی۔ سرکاری بوٹ سے اب فائر نہیں ہو رہا تھا۔ وجہ یقیناً یہی تھی کہ وہ لوگ عام مسافروں کو نشانہ بنانا نہیں چاہتے تھے۔ مجھ سے چند فٹ کی دوری پر آفتاب گل لہولہان پڑا تھا۔ اب اندازہ ہو رہا تھا کہ گولی اس کی ران میں نہیں بلکہ

ناف میں لگی ہے اور اس کی حالت اچھی نہیں۔ لانچ کو لگنے والے جھٹکوں کے سبب آفتاب کے منہ سے بے ساختہ کراہیں نکل جاتی تھیں۔ میں رینگتا ہوا اس کے قریب گیا۔ اس کا پیٹ اور دونوں ہاتھ خون میں لت پت تھے۔ ”یہ کیا ہوگیا آفتاب بھائی۔“ میں نے لرزتی آواز میں کہا۔

وہ ہمت کر کے بولا۔ ”تم سب تو ٹھیک ہو نا؟“

”ہاں ہم ٹھیک ہیں لیکن......“

میری بات منہ میں ہی رہ گئی۔ کسی نے مجھے دھکا دے کر آفتاب گل سے دور ہٹا دیا۔ یہ لانچ کے مسلح گارڈز میں سے ایک تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ یہ مدراسی تھا اور ٹوٹی پھوٹی اردو بول سکتا تھا۔ اس نے گرج کر کہا۔ ”پیچھے ہٹو، اس کتے کو گولی مار کر سمندر میں پھینکنا ہے۔“

اس نے رائفل آفتاب گل کی طرف سیدھی کرنی چاہی تو میں نے ہمت کر کے اس کی رائفل پکڑلی۔ ”نہیں، اس کا کوئی قصور نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے صرف ایک لڑکی کی جان بچانے کی کوشش کی ہے۔“

”ایک لڑکی نہیں...... ایک غدار لڑکی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب اسی کتیا کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اسی حرامزادی نے مخبری کی ہے۔“ مدراسی دہاڑا۔ اس نے ایک بار پھر رائفل آفتاب گل کی طرف سیدھی کرنا چاہی۔ اسی دوران میں ابراہیم اور جندل خاں وغیرہ بھی سامنے آگئے۔ ہمیں دیکھ کر دوسروں کو بھی ہمت ہوئی اور وہ گارڈز کی منتیں کرنے لگے کہ آفتاب گل پر گولی نہ چلائی جائے۔ پتا نہیں کہ یہ منت سماجت کا اثر تھا یا پھر گارڈز کو صورت حال کی سنگینی نظر آرہی تھی۔ وہ آفتاب گل کو نظر انداز کر کے دوسری طرف چلے گئے۔ وہ بار بار ٹیلی اسکوپس کی مدد سے عقب میں دیکھ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا کہ سرکاری بوٹ کی روشنی اب کچھ فاصلے پر نظر آرہی تھی۔ ایسا تو نہیں تھا کہ سرکاری بوٹ، لانچ کی رفتار کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ اصل بات کیا تھی، اس کا پتا پانچ دس منٹ بعد لگا۔

لانچ لہروں کا سینہ چیرتی ہوئی نیم دائرے کی شکل میں آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ آفتاب گل کی ناف سے مسلسل خون بہہ رہا ہے۔ اس کے قریب لانچ کے فرش پر خون کا چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ میں نے ایک پرانا کپڑا آفتاب گل کے زخم پر رکھا اور اس کی کمر کے گرد کس کے پٹی باندھ دی۔ ”یارا پیاس لگ رہی ہے ام کو۔“ آفتاب گل نے کہا۔

جندل خاں جلدی سے کپ میں پانی لے کر آیا۔ جب میں اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہا تھا، لانچ نے ایک بار پھر تیزی سے موڑ کاٹا۔ پانی نیچے بہہ گیا اور میں آفتاب کے اوپر گرتے گرتے بچا۔ ابھی ہم سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ لانچ تیز رفتاری سے دوسری طرف مڑی۔ یہ موڑ پہلے موڑ سے بھی زیادہ کاٹ دار تھا۔ لانچ کی ایک سمت بہت اوپر اٹھ گئی۔ ایسا ہونے سے کوئی وزنی شے لڑھکتی ہوئی ہمارے قریب پہنچ گئی۔ غور سے دیکھا تو یہ تنومند کمال رشید کی لاش تھی...... جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ ایک گولی سیدھی کمال رشید کے منہ پر لگی تھی۔ دو گولیوں نے اس کے سینے کو چھلنی کیا تھا۔ وہ مرچکا تھا مگر اس کے جسم سے اب بھی شراب کی بو اٹھ رہی تھی۔ کچھ ہی منٹ پہلے تک یہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔ گرج دار آواز میں باتیں کر رہا تھا اور کھا پی رہا تھا۔ کیبن کے اندر دو لڑکیاں اس کی خدمت گزاری میں مصروف تھیں مگر اب یوں لگتا تھا جیسے وہ کبھی زندہ ہی نہیں تھا۔ بس یہی ہے انسان کی حقیقت۔ شاید اسی لیے زندگی کو پانی کے بلبلے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

پھر ہم نے ایک اور عبرت ناک منظر دیکھا۔ مدراسی گارڈ آگے آیا۔ اب رائفل اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے لانچ کا جنگلا تھام رکھا تھا۔ وہ ابراہیم اور جندل سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”پکڑو اس کو۔ سمندر میں ڈالنا ہے۔“ اس کا اشارہ کمال کی لاش کی طرف تھا۔

اس نے ابراہیم اور جندل کے ساتھ مل کر بڑی...... بے پروائی سے لاش کو لانچ سے باہر پھینک دیا۔ چھپاکا سا ہوا۔ لاش ایک سیکنڈ کے لیے خلیج فارس کے جھاگ اڑاتے پانی پر نظر آئی پھر اوجھل ہوگئی۔ بیکراں سمندر میں گہری تاریکیوں نے اسے ڈھانپ لیا۔ ایک گھنٹا پہلے تک بھی اس شخص نے کہاں سوچا ہوگا کہ اس کا یہ انجام ہونے والا ہے۔ اس نے ایک عورت کو ذلیل کیا اور اپنے اس عمل میں آخری حد تک چلا گیا۔ اس نے اسے مردوں کی نگاہوں کے سامنے ایک مستقل تماشا بنایا...... اور بھول گیا کہ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے اور یہ بھی بھول گیا کہ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق کبھی کبھی ایک کمزور سا جانور بھی جان بچانے کے لیے درندے پر حملہ کردیتا ہے۔ شاید کچھ دیر پہلے مدراسی گارڈ نے ٹھیک ہی کہا تھا، آج اس لانچ اور لانچ کے مسافروں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا اس کے پیچھے فرح کا ہاتھ تھا۔ ”طمانچے کھانے والی“ نے آج ایک جوابی طمانچہ مارا تھا اور یہ کمال کے لیے موت کا طمانچہ ثابت ہوا تھا۔

لانچ اڑی جارہی تھی اور ہم پچیس افراد سکتے کی سی حالت میں تھے۔ لانچ نے ایک بار پھر موڑ کاٹا اور ہم پھسلتے

ہوئے کیبن کی دیوار سے لگ گئے۔

''یہ کھلے پانی میں اس طرح موڑ کیوں کاٹ رہے ہیں۔'' ابراہیم نے مجھ سے پوچھا۔

بھارتی مسلمان ذکی احمد نے کہا۔ ''مجھے کچھ کچھ اندازہ ہورہا ہے کہ یہ ایسا کیوں کررہے ہیں۔'' یہ ذکی احمد وہی تھا جو اپنی تین بچیوں کی شادیاں کرنے کے لیے پردیس کاٹنا چاہتا تھا۔

''کیا اندازہ ہورہا ہے؟'' جندل خاں نے پوچھا۔

ذکی احمد لرزاں آواز میں بولا۔ ''یہاں سمندر زیادہ گہرا نہیں ہے اور نیچے چٹانیں وغیرہ ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ لوگ اس چور راستے کے بہت زیادہ بھیدی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس والوں کی بوٹ پیچھے رہ گئی ہے۔''

ذکی احمد کی بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ ہمیں کچھ نظر نہیں آرہا تھا لیکن لانچ والے کو پتا تھا کہ اس نے کس طرف جانا ہے۔

یہ سب کچھ بہت خطرناک بھی تھا۔ اندھیرے میں اندازے کی تھوڑی سی غلطی تیز رفتار لانچ کو کسی پتھر سے ٹکرا کر تباہ کرسکتی تھی۔ یعنی پیچھے شیر اور آگے کنواں والی صورتِ حال تھی۔ میرا منہ بالکل خشک ہورہا تھا۔ دل کی رفتار دگنی تو ضرور ہوگئی ہوگی۔ یقیناً دوسروں کی حالت بھی یہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص جنگلے کو تھامے باقاعدہ رو رہا تھا اور بلند آواز سے دعائیں مانگ رہا تھا۔ سرکاری کشتی کی روشنیاں اب نظر نہیں آرہی تھیں لیکن لانچ کی رفتار بدستور تیز تھی۔ پتا نہیں کہ یہ سلسلہ کتنی دیر مزید جاری رہنا تھا۔ ہم میں سے کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ گارڈز سے کچھ پوچھ سکتا۔

قریباً آدھ گھنٹے کے نہایت خطرناک اور تیز رفتار سفر کے بعد ہمیں ایک ویران ساحل نظر آیا۔ لانچ والوں نے ساحل سے تقریباً ڈیڑھ سو میٹر دور ہی لانچ کھلے پانی میں روک دی۔ مدراسی گارڈ نے حکم دینے والے انداز میں کہا۔ ''چلو بھئی۔ نیچے اترو سب...... جلدی کرو۔''

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

گارڈ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''یہی ہے تمہاری ماں کویت...... اب چمٹ جاؤ اس سے اور دودھ پیو اس کا۔ چلو، جلدی اترو۔''

ہم نے ڈری ہوئی نظروں سے لہریں لیتے پانی کو دیکھا۔ ہم میں سے کئی ایسے تھے جو تیرنا نہیں جانتے تھے اور ان میں، میں بھی شامل تھا۔ میں نے ہمت کر کے مدراسی گارڈ سے کہا۔ ''یہاں پانی گہرا ہے۔ ہم میں سے کئی ڈوب جائیں گے۔ لانچ کو تھوڑا آگے لے جاؤ۔''

''بکواس بند کرو اور جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔'' سیاہ فام مدراسی گرجا۔

''یہاں کتنا پانی ہوگا؟'' ذکی احمد نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''جتنا بھی ہے لیکن اترو۔ آگے جائیں گے تو یہ تمہاری بہن (لانچ) پھنس جائے گی ریت میں۔ جلدی اترو۔''

دونوں گارڈز نے اپنی رائفلیں کندھوں سے اتار کر ہاتھوں میں لے لیں۔ یہ قیامت کے لمحے تھے۔ کم از کم ان کے لیے تو قیامت ہی تھی جو تیرنا نہیں جانتے تھے۔ پانی میں ہلکے درجے کی طغیانی تھی اور لانچ ہچکولے کھا رہی تھی۔ ہر ہچکولے پر آفتاب گل تکلیف سے کراہ اٹھتا تھا۔ یہ رات کا آخری پہر تھا اور افق کی طرف ہلکی سی سفیدی نظر آنے لگی تھی۔

مسافروں نے اترنے سے انکار کیا تو گارڈز نے انہیں بے دریغ رائفلوں کے دستوں سے مارنا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ وہ گالیاں بھی بک رہے تھے اور شوٹ کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ مسافروں نے خوفزدہ ہو کر پانی میں چھلانگیں لگانا شروع کر دیں۔ کچھ کو گارڈز نے خود دھکے دے دیے۔ وہ جلد از جلد لانچ خالی کر کے یہاں سے بھاگ نکلنا چاہتے تھے۔ ہم خالی ہاتھ تھے، کسی طرح کی مزاحمت بے سود تھی۔ وہ لوگ اتنے مشتعل تھے کہ کسی بھی لمحے گولی چلا سکتے تھے۔ میں نے ابراہیم کو پانی میں چھلانگ لگاتے دیکھا، پھر آفتاب گل کو دیکھا۔ وہ خود کو بہ مشکل گھسیٹ کر لانچ کے کونے تک پہنچا اور پانی میں لڑھک گیا۔ ایک رائفل میری طرف بھی سیدھی ہوچکی تھی۔ میں نے بھی پانی میں چھلانگ لگا دی۔ میرے کانوں میں دہشت زدہ آوازیں گونج رہی تھیں۔ ان میں ''اللہ اکبر'' کے نعرے بھی شامل تھے۔ یہ وہ نعرے تھے جو پانی میں کودنے والے خوفزدہ لوگ لگا رہے تھے۔ اسی دوران میں مجھے ایک فائر کی آواز بھی سنائی دی۔ مجھے شک گزرا کہ یہ فائر آفتاب گل پر کیا گیا ہے۔ بہرحال اس وقت کسی کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ میں تیرنا نہیں جانتا تھا اور گہرے پانی میں کود چکا تھا۔ مجھے اپنے بالکل قریب ہی جندل خاں کی آواز سنائی دی۔ وہ شاید مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ اگر اس نے مجھے پکارا تھا تو غلطی کی تھی۔ مجھے تو خود مدد کی ضرورت تھی۔ پانی میں گرنے کے بعد ایک دفعہ تو

میں ڈوبتا چلا گیا پھر پانی نے مجھے اچھالا۔ میں نے لمبا سانس لیا۔ دوسرا سانس لینے کی کوشش کی تو سمندر کا نمکین پانی میرے پھیپھڑوں میں داخل ہو گیا۔ مجھے لگا کہ سانس رک گیا ہے اور آخری وقت آ گیا ہے۔ کیا یہ سمندر میری قبر بن جائے گا؟ کیا میں اب کبھی اپنے پیاروں کی شکلیں نہ دیکھ سکوں گا؟

جان بچانے کی فطری خواہش کے تحت میں نے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں چلانے شروع کیے۔ پیچھے سے ایک زوردار لہر آئی۔ میں اس لہر میں ڈوبتا ابھرتا غوطے کھاتا جانے کس طرح ساحل پر پہنچ گیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا اور میں مسلسل الٹیاں کر رہا تھا۔ ساحل پر میں نے کئی مسافروں کو بڑی بری حالت میں دیکھا۔ ایک دو نیم بے ہوش پڑے تھے۔ جو تیر سکتے تھے، وہ قدرے بہتر حالت میں تھے۔

خود کو سنبھالنے کے بعد میں نے سب سے پہلے ابراہیم اور آفتاب گل کو تلاش کیا۔ ابراہیم تو میرے قریب ہی موجود تھا۔ آفتاب گل پندرہ بیس میٹر دور ریت پر چت پڑا تھا۔ چار پانچ مسافر اس کے گرد جمع تھے۔ مجھے فوراً اس فائر کا خیال آیا جو آخری وقت لانچ پر سے کیا گیا تھا۔ ''تو کیا آفتاب گل مر چکا ہے؟'' یہ سوال درد کی ایک ٹیس کی طرح دماغ میں ابھرا۔ میں اور ابراہیم لپکتے ہوئے آفتاب گل کے پاس پہنچے...... وہ زندہ تھا لیکن اس کے سینے پر دائیں جانب گولی کا ایک اور زخم نظر آ رہا تھا...... تو یہ اندیشہ درست ثابت ہوا تھا کہ سفاک گارڈز نے آخری فائر آفتاب گل پر ہی کیا تھا۔ انہوں نے آفتاب کی اس غلطی کو معاف نہیں کیا تھا کہ اس نے تصادم کے وقت فرخ کی جان بچانے کی کوشش کی۔

لانچ کا اب دور دور تک پتا نہیں تھا۔ ہمارے سامنے سمندر کی جھاگ اڑاتی لہریں تھیں اور ہمارے پیچھے ایک ویران ریتیلا ساحل تھا جس پر کہیں کہیں کھجوروں کے جھنڈ نظر آتے تھے۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود آفتاب ابھی تک ہوش میں تھا اور سر ہلا کر ہمارے سوالوں کے جواب بھی دے رہا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ جندل خاں کے سامان میں ایک ٹارچ بھی تھی...... ''جندل خاں! کہاں ہو؟'' میں نے آواز دی۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ ''جندل کہاں ہے؟'' میں نے ساتھیوں سے پوچھا۔ سب ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ اتنے میں ایک وزیرستانی پٹھان آگے آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''امارا خیال ہے کہ جندل خاں نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں قریباً چلا اٹھا۔

ہم سب نے بے تابی سے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ جندل کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔

اتنے میں ذکی احمد نے ایک اور شخص کا نام لیا اور کہا کہ وہ بھی نظر نہیں آ رہا۔ ہم نے افراتفری میں اپنی گنتی کی۔ پچیس میں سے چار افراد گنتی میں نہیں تھے اور ان میں جندل خاں بھی شامل تھا۔ ایک ہلکی سی امید اب بھی موجود تھی کہ شاید ان چار میں سے کچھ افراد ڈر کر ادھر ادھر بھاگ گئے ہوں۔

اب دن کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ہم ادھر ادھر پھیل گئے اور تلاش کرنے لگے لیکن کہیں کسی کا نام و نشان نہیں تھا۔ اچانک مجھے کنارے کے بالکل پاس کوئی چیز ہچکولے کھاتی نظر آئی۔ قریب جا کر دیکھا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ جندل خاں کی گٹھڑی تھی۔ ابراہیم گھٹنے گھٹنے پانی میں اترا اور یہ گٹھڑی نکال لایا۔ میں نے گٹھڑی کھولی۔ دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ یہ جندل خاں کی چیزیں تھیں۔ اس کا رخت سفر تھا۔ کپڑوں کا ایک جوڑا، ایک چادر، مونگ پھلی، گڑ، نسوار کی ڈبیا، شیشہ، کنگھی۔ پلاسٹک کے ایک تہ کیے ہوئے لفافے میں دو تین تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں جندل خاں اپنے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ دوسری تصویر میں یقیناً اس کے بچے اور بیوی تھی۔ بیوی سرتاپا چادر میں تھی، بس اس کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ ایک پھول سی بچی جندل خاں نے گود میں اٹھا رکھی تھی۔ تین لڑکے پاس پاس کھڑے تھے۔ ان کی عمریں تین اور آٹھ سال کے درمیان ہوں گی۔

کتنی محبت سے اس نے سنبھالی ہوئی تھیں یہ تصویریں۔ اب یہ تصویریں تو تھیں لیکن وہ خود نہیں تھا۔ اپنے بچوں کے لیے حق حلال کی روزی تلاش کرتے کرتے وہ خلیج فارس کے پانیوں میں دفن ہو چکا تھا۔ اس کی آخری آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ وہ مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا...... ہاں وہ ابھی زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اپنی پھول سی بچی کے لیے اور ان سب کے لیے جو اس سے پیار کرتے تھے اور اس کی راہ دیکھتے تھے۔

ہم سب حواس باختہ تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ سب سے پہلی ضرورت تو یہ تھی کہ ہم فوراً یہ جگہ چھوڑ دیں اور صحرا میں کچھ آگے چلے جائیں۔ کنارے پر کسی بھی وقت کوئی ہمیں دیکھ سکتا تھا اور ہم مزید مصیبت میں

گرفتار ہو سکتے تھے۔ آفتاب گل کے شدید زخمی ہونے کے بعد میری حیثیت ایک بار پھر گروپ لیڈر کی سی ہو گئی۔ مشورے کے بعد ہم نے آگے جانے کا فیصلہ کیا۔ حالت کسی کی بھی اچھی نہیں تھی۔ کئی مسافر ابھی تک قے کر رہے تھے۔ زیادہ تر کھانے پینے کا سامان لانچ کے اندر ہی رہ گیا تھا یا پھر چھلانگیں لگاتے ہوئے پانی میں گر گیا تھا۔ جو بچا کر لائے تھے، وہ بھی بری طرح بھیگا ہوا تھا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ جن مسافروں کے پاس سفری کاغذ...... پاسپورٹ وغیرہ موجود تھے، وہ سب کے سب بھیگ کر...... بے کار ہو گئے تھے۔ میرے عین سامنے ایک جہلمی نوجوان سر پکڑ کر بیٹھا رو رہا تھا۔ اس کے پاسپورٹ کا ستیاناس ہو چکا تھا۔ پورے گروپ میں شاید صرف میں اور ابراہیم تھے جن کے سفری کاغذ محفوظ رہے تھے اور ایسا ان شاپرز کی وجہ سے ہوا تھا جو میں نے بازار سے خریدے تھے۔ ابراہیم کا باقی سارا سامان بھی پانی میں بہہ گیا تھا۔ وہ بس ایک چھوٹی سی تھیلی بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ ریگزین کی بنی ہوئی اس براؤن تھیلی میں کیا ہے۔

سب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے کوشش کر کے زخمی آفتاب گل کو اپنی کمر پر لادا۔ پیچھے سے ابراہیم نے سہارا دیا اور ہم درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھے۔ اب صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ہم دور تک دیکھ سکتے تھے۔ چلتے چلتے میں دو لمحے کے لیے رک گیا۔ میں نے مڑ کر سمندر کی طرف دیکھا۔ شاید دل میں ابھی یہ امید تھی کہ وہاں جندل خاں نظر آئے گا اور پکار کر کہے گا۔ ''ٹھہرو ہارون! ام آ رہا ہے۔''

لیکن جندل کہیں نہیں تھا۔ سمندر کی لہروں پر، صحرا کی ریت اور کھجوروں کے نیچے کہیں اس کا نشان نہیں تھا۔ وہ تین دیگر افراد سمیت ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں تھک گیا تو ابراہیم نے آفتاب کو اپنی پشت پر اٹھا لیا۔ ساحل سے قریباً دو کلومیٹر آگے ہم خشک درختوں کے اس جھنڈ تک پہنچ گئے۔ عارضی طور پر خود کو چھپانے کے لیے یہ جگہ مناسب تھی۔ یہ کھجور کے آٹھ دس درخت تھے اور یہاں تھوڑا بہت سایہ بھی موجود تھا۔

ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں ہیں اور کس ملک کی حد میں ہیں۔ ہر جگہ ریت ایک جیسی ہوتی ہے اور کھجوریں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ہر جگہ ایک ہی طرح کی ہوا چلتی ہے اور آسمان کا رنگ بھی ایک سا دکھائی دیتا ہے...... ہاں لانچ والوں نے کہا تھا کہ یہ کویت ہے۔

آفتاب گل کی حالت بری تھی۔ پہلی گولی تو اس کی ناف میں شاید اپینڈکس کے آس پاس کہیں لگی تھی۔ دوسری گولی سینے میں دائیں طرف لگی تھی اور شانہ چیر کر عقب سے نکل گئی تھی۔ دونوں زخم مسلسل خون اگلے رہے تھے۔ ذکی احمد کے سامان میں سے مرہم پٹی کی کچھ اشیا نکل آئیں۔ ہم نے کوشش کر کے آفتاب گل کے زخموں سے خون کا اخراج بند کر دیا۔ بہرحال ناف والی گولی، اس کے جسم کے اندر ہی تھی اور یہی زیادہ خطرناک زخم تھا۔

کھانے پینے کی بہت معمولی سی چیزیں ہمارے پاس تھیں۔ خاص طور سے پانی تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ جوں جوں سورج اوپر آتا گیا، پیاس کی شدت بڑھتی گئی۔ گلے میں کانٹے سے پڑ گئے۔ اگلے دو ڈھائی گھنٹوں میں ہمارا گروپ مکمل طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ دونوں حصوں کی اپنی اپنی رائے تھی۔ ذکی احمد مجھے ایک طرف لے گیا اور سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''ہارون! زیادہ ساتھیوں کا خیال یہی ہے کہ ہم آفتاب گل کو اپنے ساتھ لیے لیے نہیں پھر سکتے، بہتر ہے کہ اس کے پاس کچھ خوراک اور پانی وغیرہ چھوڑ دیا جائے اور اسے اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ کوئی اس کی مدد کے لیے آ جائے۔''

''نہیں ذکی صاحب! کم از کم میرا ضمیر تو یہ گوارا نہیں کرتا۔'' میں نے صاف جواب دیا۔

ابراہیم نے بھی فوراً میری تائید کی۔

مصطفیٰ نامی جہلمی نوجوان بولا۔ ''ہم لکڑیوں سے ایک اسٹریچر سا بنا سکتے ہیں اور خان صاحب کو اس پر لٹا کر اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔''

اس معاملے پر کچھ دیر چپکے چپکے بحث ہوئی، پھر کچھ اور لوگ بھی دوسرے گروپ کے ہمنوا بن گئے۔ آخر میں صرف میں، ابراہیم، مصطفیٰ اور ذکی احمد رہ گئے۔ ذکی احمد زیادہ عمر کا تھا اور کمزور بھی تھا۔ میں نے کہا۔ ''ذکی صاحب! آپ کی حمایت کا بہت شکریہ۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ خود کو مصیبت میں نہ ڈالیں۔ آپ ان لوگوں کے ساتھ چلے جائیں۔ ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔''

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد ہم نے ذکی احمد کو جانے پر آمادہ کر لیا۔ کچھ دیر بعد ہمیں معلوم ہوا کہ علیٰحدہ ہونے والا گروپ بھی دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک ٹولی شمال کی طرف جانا چاہ رہی تھی، دوسری شمال مشرق کی طرف۔ یہ سب کچھ بس اندازے سے ہی ہو رہا تھا۔ رخصت کے

وقت ذکی احمد کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ”خدا حافظ!“ اس نے خشک ہونٹوں کے ساتھ کہا۔

”خدا حافظ!“ ہم نے بھی جواب دیا۔ وہ لوگ دو ٹولیوں کی شکل میں ہم سے دور ہوتے چلے گئے۔ میری نگاہیں دیر تک ذکی احمد پر جمی رہیں۔ اس کا خاکی کرتہ پاجامہ دور سے بھی نظر آرہا تھا۔ اپنے جھکے ہوئے کندھوں پر تین جوان بیٹیوں کے مستقبل کا بوجھ اٹھائے وہ چلتا چلا جارہا تھا۔ پھر وہ اپنی ٹولی سمیت ٹیلوں کے پیچھے اوجھل ہوگیا۔ زندگی کی ریل گاڑیاں ایسے ہی پٹریاں بدلتی ہیں اور مسافروں کی راہیں اور منزلیں تبدیل ہوتی ہیں۔

☆☆☆

درختوں کے اس جھنڈ میں آج ہمیں دوسرا روز تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا اور سورج سوا نیزے پر چمک رہا تھا۔ جو تھوڑا بہت خشک راشن ہمارے پاس تھا، وہ اب دو دن سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا۔ پانی بھی بہت احتیاط سے استعمال کیا جاتا تو مشکل سے ڈھائی تین دن گزر سکتے تھے۔ آفتاب گل کا ناف کا زخم خراب ہونا شروع ہوگیا تھا۔ وہ جگہ سرخ تھی اور اسے بخار بھی تھا۔ وہ بڑے صبر کا مظاہرہ کررہا تھا لیکن جب پیاس شدت پکڑ جاتی تو وہ مجبور نظروں سے ہماری طرف دیکھتا۔ ہم پانی کے چند قطرے اس کے منہ میں ٹپکا دیتے۔ مصطفیٰ صبح سویرے کا نکلا ہوا تھا، میں نے ہی اسے کہا تھا کہ وہ اردگرد کسی بستی یا گھر کا کھوج لگائے اور یہ پتا کرنے کی کوشش بھی کرے کہ کیا واقعی ہم کویتی علاقے میں ہیں؟

سہ پہر کے پانچ بجے تک گرمی اور پیاس کی وجہ سے ہمارا دم جیسے آنکھوں میں آگیا۔ آفتاب گل نے مجھے اشارے سے قریب بلایا اور بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ”ہارون! امارے لیے اپنا جان خطرے میں نہ ڈالو۔ میں اب نہیں بچوں گا۔ تم لوگ چلے جاؤ۔ اگر تم......“

میں نے آفتاب کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”نہیں آفتاب بھائی! آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔“

ابراہیم بولا۔ ”سائیں! مجھ کو لگتا ہے کہ مصطفیٰ واپس آرہا ہے۔“ واقعی دور ایک مدھم ہیولا نظر آرہا تھا لیکن یہ کوئی بدو بھی ہوسکتا تھا۔ بہرحال تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں اندازہ ہوگیا کہ یہ پتلون شرٹ والا مصطفیٰ ہی ہے۔ ہم پُرامید نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ تھکا ہارا اور ہانپتا کانپتا ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اس کا رنگ سیاہ ہورہا تھا اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ وہ ناکام لوٹا ہے۔

اس نے نفی میں سر ہلا کر ہمارے اندازے کی تصدیق کی۔ ”نہیں جی...... اس طرف تو دور تک کسی بندے یا بستی کا نام ونشان نہیں۔ پانی بھی کہیں نظر نہیں آیا۔“

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے اسے ایک گھونٹ پانی دیا۔ وہ ہونٹوں کو تر کر کے بولا۔ ”اور مجھے تو لگتا ہے کہ...... شاید...... ہم کویتی علاقے میں بھی نہیں ہیں۔“

”کیسے لگتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کافی آگے ریت میں ایک پرانا بورڈ دبا ہوا نظر آیا ہے۔ اس کے لفظ مٹ چکے ہیں مگر دو چار پڑھے بھی جاتے ہیں۔ ان میں بصرہ اور نصیریہ کا لفظ بھی پڑھا جاتا ہے۔ آگے شاید تیر کا نشان ہے۔“

مایوسی اور بے بسی کی ایک اور لہر سینے میں دوڑ گئی۔ تو کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ لانچ والوں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے ہمیں پھر عراقی علاقے میں اتار دیا...... یا پھر ہم ہی غلط سمت میں چل کر اس طرف آگئے؟ بہرحال ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

پہاڑ جیسا دن گزرنے میں نہیں آرہا تھا۔ خدا خدا کر کے شام ہوئی اور گرمی کی جگہ ہلکی ہلکی خنکی نے لے لی۔ ریت جتنی جلدی گرم ہوتی ہے، دھوپ کے بغیر اتنی ہی جلدی ٹھنڈی بھی ہوجاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پیاس کی شدت بھی قدرے کم محسوس ہونے لگی۔ یہ ایک چاندنی رات تھی۔ مشرق کی طرف سے چاند کا سنہری گولا سمندر کے اندر سے نمودار ہوا اور دھیرے دھیرے افق پر بلند ہونے لگا۔ ہم نے چند کھجوریں کھائیں۔ دو دو بسکٹ لیے اور ایک ایک گھونٹ پانی پی کر آفتاب گل کے دائیں بائیں لیٹ گئے۔ میں آج سارا دن لکڑی کا ایک اسٹریچر تیار کرتا رہا تھا۔ اس کے لیے میں نے کھجور کی تین چار مضبوط شاخیں استعمال کی تھیں۔ اس کے علاوہ بدنصیب جندل خان کی گٹھری سے برآمد ہونے والی ایک بڑی چادر بھی کام آئی تھی۔

ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہوئی تو ہم پیاس اور تھکن کے ماروں کو نیند آنے لگی...... بہت دیر تک تکلیف میں کراہنے کے بعد اب آفتاب گل پر بھی غنودگی طاری ہورہی تھی۔ وہ سویا تو ابراہیم اور مصطفیٰ بھی سو گئے۔ میں جاگتا رہا اور عرب کے آسمان کے تارے گنتا رہا۔ دو دن پہلے کے خونی واقعات ایک ایک کر کے نگاہوں کے سامنے آئے۔ امین کا زخمی ہو کر پانی میں گرنا۔ کمال رشید کا گولیوں سے چھلنی ہونا

اور پھر گارڈز کی خوفناک دھمکیوں کے بعد ہمارا سمندر میں چھلانگیں لگانا۔ یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں دل میں یہ اندیشہ محسوس ہورہا تھا کہ شاید ہم زندہ سلامت اس ویرانے سے نکل نہیں سکیں گے۔ اسی صحرا میں چلتے چلتے ہم کہیں یکے بعد دیگرے گریں گے اور ہمارے اوپر ریت کی قبریں بن جائیں گی۔ ہمارے پیچھے بے رحم سمندر تھا اور آگے قاتل ریت تھی جس کا کوئی کنارہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ رات کے پونے نو بجے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق پاکستان میں یہی کوئی دس ساڑھے دس کا وقت ہوگا۔ میں نے تصور کی آنکھوں سے دیکھا۔ میرے گھر والے کھانا کھا چکے ہوں گے اور اب سونے سے پہلے شاید ٹی وی وغیرہ دیکھ رہے ہوں۔ امی بھیگی آنکھوں کے ساتھ نوافل پڑھ رہی ہوں گی۔ اسلم بھائی جان.... بے چینی سے گھر کے سامنے گراؤنڈ میں ٹہل رہے ہوں گے۔ انہوں نے میری تلاش میں لوگوں کو دوڑ دوڑ رکھا ہوگا۔ ابا جان وظائف میں مصروف ہوں گے۔ میری دلہن میرے ننھے بھتیجے ذوالفقار سے کھیل رہی ہوگی۔ اس کی شرارتوں میں اپنا دکھ بھلانے کی ناکام کوشش کر رہی ہوگی۔ مجھے اپنی دو چھوٹی بہنیں، جنہیں میں نے کبھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی، بری طرح یاد آئیں۔ میں نے تصور کی نظر سے دیکھا۔ میری چھوٹی بہن، ابا جان کے کہنے پر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اٹھائے میرے لیے دعا مانگ رہی تھی۔ بڑوں کی طرح اس کا چہرہ بھی کملایا ہوا تھا۔ ”اللہ میاں میرے بھائی جان کو واپس لے آ۔ ہمیں پھر ان کی شکل دکھا دے۔“ پھر میری آنکھوں کے سامنے میرے دوستوں کی شکلیں آئیں۔ لاہور میں مزنگ چونگی کی رونقیں، ملتان روڈ کی گہما گہمی لکشمی چوک کی روشنیاں۔ ٹھنڈے مشروبات گردش کر رہے تھے، پکوان کھائے جارہے تھے، خوشی سے بھرپور قہقہے گونج رہے تھے۔

کچھ اسی طرح کا ”احساس“ پیدا ہوا جو اعتبار ساجد کی یہ مشہور نظم دل میں جگاتی ہے

اے اس شہر کے پیارے لوگو!
تم نے کب یہ سوچا ہوگا
دور کہیں ایک صحرا ہوگا
جس میں سبز رتوں کا شاعر
جنم جنم کا پیاسا ہوگا
کیسے ہر شب کٹتی ہوگی؟
کیسے ہر دن ڈھلتا ہوگا......؟

آنکھوں میں نمی جاگ گئی۔ سوچتے سوچتے میں سوگیا۔ دوبارہ بیدار ہوا تو چاند نصف نہار پر چمک رہا تھا۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ آفتاب گل نیند میں کراہ رہا تھا۔ مصطفیٰ بھی سویا ہوا تھا لیکن ابراہیم اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ آفتاب کو دیکھنے کے بعد میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ چاندنی میں دور تک نظر آرہا تھا مگر ابراہیم کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شاید پیشاب وغیرہ کے لیے گیا ہے۔ اس کی ریگزین کی براؤن پوٹلی اس کے بچھونے کے نیچے سرہانے کی طرف پڑی تھی۔ وہ اپنے سارے سامان میں سے بس اس پوٹلی نما تھیلی کو ہی بچا سکا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس نے یہ تھیلی کیوں بچائی ہے۔ اس میں اس کا سب سے قیمتی سامان تھا۔ ہیرے جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی۔ اس میں مہرو کی نشانیاں تھیں۔ میں نے یونہی سرد ریت پر بیٹھ کر اس تھیلی کی زپ کھولی۔ اس میں کئی چیزیں تھیں، مجھے بس چند ہی یاد رہیں۔ ان یاد رہنے والی چیزوں کا تعلق مہرو سے ہی تھا۔ شاپر میں لپٹی ہوئی اس کی ایک پرانی جوتی۔ ایک پڑیا میں رکھے ہوئے اس کے چند بال، اس کی قمیص کا سرخ بٹن اور سبز نیلے رنگ کی کچھ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں۔ کیسی انوکھی محبت تھی اس کی؟ کیسے جنونی جذبے تھے اس کے سینے میں؟ اور اب وہ کہاں تھا؟ کافی دیر ہوگئی تھی۔ اسے آجانا چاہیے تھا۔ میں اسے تلاش کرتا ہوا نکلا۔ وہ مجھے خشک کھجوروں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ کے پیچھے نظر آیا۔ اس نے ایک سوکھے تنے سے ٹیک لگا رکھی تھی اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ میں چند لمحے تو ساکت کھڑا رہا، پھر آگے بڑھ کر کہا۔ ”کیا بات ہے ابراہیم؟ کیا ہوا؟“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ پھر اپنا سر اپنے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں پر رکھ کر چہرہ چھپا لیا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا، اسے تسلی دینے لگا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اسے ہوا کیا ہے۔

اس نے کہا۔ ”ہارون سائیں! آج بری رات ہے۔ بہت بری رات ہے۔“

”تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔“ میں نے اس کا تربتر چہرہ اپنی طرف پھیرتے ہوئے پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”شاید تم کو یاد نہیں رہا سائیں! آج بغداد میں مہرو کی منگنی ہے۔ وہ چمکدار جوڑا پہنے، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، سج کر بیٹھی ہوگی اور وہ حرام زادہ...... وہ زبیر...... وہ اس کی انگلی میں مندری

پہنائے گا، اپنے ہاتھوں سے مندری پہنائے گا۔"

اس کی آواز غم کی شدت سے ٹوٹ گئی۔

ابراہیم ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھے بھی یاد آ گیا۔ چاند کی چودھویں رات کو جعفر کے گھر زبیر اور مہرو کی منگنی ہونا تھی۔

میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "ابراہیم! حوصلہ کرو۔ یہ منگنی ہی ہے، خدانخواستہ شادی تو نہیں ہے۔"

"لیکن سائیں...... وہ میری مہرو کے پاس بیٹھے گا۔ اس کو چھوئے گا۔ اس کو ہتھ لگائے گا۔"

"ہاتھ لگائے گا؟ وہ کیوں؟"

"جب لڑکا مندری پہناتا ہے تو لڑکی کے ہاتھوں کو ہاتھ تو لگتے ہیں نا...... میں یہ برداشت نہیں کرسکتا...... سائیں بالکل نہیں کرسکتا۔ وہ کیوں اسے ہتھ لگائے...... کیوں؟"

اس نے شدید بے چینی کے عالم میں اپنا سر کھجور کے تنے سے رگڑا۔ میں نے دیکھا اس کے دائیں ہاتھ کی کھال بری طرح چھلی ہوئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ جنون کے عالم میں کھجور کے تنے پر مکے رسید کرتا رہا ہے۔

وہ دردناک آواز میں بولا۔ "میں بھی جندل خاں کی طرح سمندر میں ہی کیوں نہ رہ گیا۔ کیوں میری جان ان عذابوں سے چھوٹ نہ گئی۔"

میں نے اسے جھڑکا۔ "مایوسی گناہ ہے۔ خدا سے اچھے دنوں کی امید رکھنی چاہیے۔ ابھی کوشش کرنے کے لیے تمہارے پاس کافی وقت ہے ابراہیم۔"

"کافی وقت تو ہم کہہ رہے ہیں نا سائیں...... مجھے تو...... یہ ڈر بھی ہے کہ کہیں اس کے پا جعفر نے منگنی کو اس کے نکاح میں ہی نہ بدل دیا ہو۔ اس کے گھر والے مشورہ دے رہے تھے کہ جب اتنا خرچہ کرنا ہے تو پھر کیوں نہ ساتھ ہی نکاح بھی کر دیا جائے۔"

"یہ سب تمہارے وہم ہیں ابراہیم۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تمہاری لگن سچی ہے تو تمہیں کامیابی ضرور ملے گی۔ خدا کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔"

"لیکن ابھی تک تو ہر طرف اندھیرا ہی ہے...... کوئی بھی وسیلہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ جو تھوڑی بہت پونجی تھی میرے پاس وہ بھی پانی میں رہ گئی۔ کویت جانے...... اور کمائیاں کرنے کی سوچ بھی بس سوچ ہی رہی۔ نہ ہم کویت جاسکے ہیں، نہ بغداد میں ہیں۔ پتا نہیں کہاں پڑے ہوئے ہیں، اگر پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو پتا نہیں کیا حشر ہوگا۔"

"ہمارا دین کہتا ہے ابراہیم کہ مایوسی گناہ ہے۔ امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

"لیکن سائیں! دین یہ بھی تو کہتا ہے کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ اپنی حیثیت کو دیکھے بغیر، جاگتی آنکھوں سے خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ میں نے اپنے خط میں کیا کیا نہیں لکھ دیا تھا مہرو کو...... اب وہ سب کچھ شرمندگی کا پہاڑ بن گیا ہے۔ تم نے ہی تو کہا تھا سائیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے دن بدل جائیں گے۔ ہم کیا سے کیا ہو جائیں گے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ اس طویل خط کی بات کر رہا ہے جو آٹھ دن پہلے بغداد چھوڑنے سے پیشتر اس نے مہرو کو لکھا تھا۔ یقیناً اس خط میں اس نے مہرو کو یہی لکھا ہوگا کہ وہ کویت جا رہا ہے اور بہت جلد اسے کچھ بن کے دکھا دے گا۔ اب وہ ساری باتیں اسے یاد آ رہی تھیں۔

میں اس کے پاس بیٹھ کر اسے دیر تک سمجھاتا رہا اور تسلی دینے کی کوشش کرتا رہا۔ حالانکہ تسلی تو میرے اپنے پاس بھی نہیں تھی۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ واپس درختوں میں لے آیا۔

اگلے روز صبح منہ اندھیرے پروگرام کے مطابق ہم نے زخمی آفتاب کو لکڑی کے اسٹریچر پر ڈالا اور روانہ ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ آگ برساتا سورج طلوع ہوتا اور اس ویرانے کو جہنم زار بنا دیتا، ہم آٹھ دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ اس سفر کے دوران میں ابراہیم کی سخت جانی اور ہمت کا صحیح اندازہ ہوا...... اس نے بہت کم آرام کیا اور میرے یا مصطفیٰ کے ساتھ مل کر مسلسل اسٹریچر کو اٹھائے رکھا۔ شاید یہ جسمانی مشقت اس کی ذہنی اذیت کو کم کرنے میں بھی اس کی مدد کر رہی تھی۔ ہماری نگاہیں ہر پل کسی ذی نفس کا کھوج لگانے میں لگی ہوئی تھیں لیکن ذی نفس کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ ہم بس اندازے سے چلتے جا رہے تھے اور اندازہ یہی تھا کہ ہم عراقی علاقے کی طرف جا رہے ہیں۔ مصطفیٰ کے سوا ہم تینوں کے پاس سفری کاغذات ٹھیک حالت میں موجود تھے۔ اگر کہیں کسی قانون نافذ کرنے والی ایجنسی سے آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو زیادہ خطرے کی بات نہیں تھی۔

وہ بڑا ہی مشکل دن تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میلوں تک کہیں سائے کا نام و نشان نہیں۔ پیاس سے دم آنکھوں میں آ چکا تھا۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ شاید ہم یکے بعد دیگرے چکرا کر گر جائیں گے اور کبھی اٹھ نہ سکیں گے۔ دور اوپر چمکیلے آسمان پر اڑتے ہوئے گدھ ایک ایک کر کے نیچے اتریں گے اور اپنی لمبی چونچوں سے ہمارا گوشت نوچنا

شروع کر دیں گے۔ سورج ڈھلا اور تمازت کچھ کم ہوئی تو ہم جیسے موت کے منہ میں سے واپس آنا شروع ہو گئے۔ صحرا کی شام زندگی کی نوید کی طرح لگی۔ مگر یہ عارضی نوید تھی۔ کل پھر یہی آگ برساتا سورج ہونا تھا اور یہی جان لیوا راستہ ہونا تھا۔

آفتاب گل بار بار بے ہوشی میں بڑبڑانے لگتا تھا۔ "ام کو چھوڑ دو۔ یہاں بہت ٹھنڈا پانی ہے۔ تم جاؤ......"

زخم کے زہر نے شاید اس کے اعصاب کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا...... وہ رات بھی جیسے تیسے کٹی۔ صبح ابراہیم نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ "کیا ہوا؟" میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"مصطفیٰ نہیں ہے۔" ابراہیم نے بتایا۔

"کہیں ادھر ادھر نکلا ہوگا۔"

"نہیں، میں نے دیکھ لیا ہے، کہیں بھی نہیں ہے۔ وہ چلا گیا ہے شاید۔"

میں تیزی سے اشیائے خورونوش کی طرف لپکا...... یعنی بسکٹ اور پانی...... دونوں چیزیں موجود تھیں لیکن وہ اپنے حصے کا پانی لے گیا تھا اور بسکٹ بھی۔ بہرحال یہ بھی اس کی مہربانی تھی۔ اگر وہ سارا راشن لے جاتا تو بھی ہم کیا کر لیتے۔ غالباً اس سے اسٹریچر اٹھانے کی مشقت برداشت نہیں ہوئی تھی اور اس نے اکیلے سفر کرنا مناسب سمجھا تھا۔

ایک بار پھر منہ اندھیرے ہم نے آفتاب والا اسٹریچر اٹھایا اور چل پڑے۔ آفتاب پر تھوڑا سا سایہ رکھنے کے لیے ہم نے جندل خاں کے ایک بڑے رومال کو سائبان کی طرح استعمال کیا ہوا تھا۔

ایک جگہ دو نیم خشک درختوں کا تھوڑا سا سایہ نظر آیا۔ یہ جگہ مشکل سے آدھی چارپائی جتنی ہوگی، پھر بھی ایک نعمت کی طرح لگی۔ ہم نے یہاں رک کر ایک ایک گھونٹ پانی سے اپنے گلے تر کیے اور کچھ پانی نیم بے ہوش آفتاب کے منہ میں ٹپکایا۔

ابراہیم...... مصطفیٰ کے چلے جانے پر اظہار افسوس کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "ابراہیم! ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی بہتری بھی چھپا رکھی ہوتی ہے۔"

"مثلاً کیا سائیں؟" ابراہیم نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "ہم تینوں کے پاس پاسپورٹ وغیرہ موجود ہیں۔ مصطفیٰ کا پاسپورٹ پانی میں خراب ہو چکا ہے بلکہ ختم ہی ہو گیا ہے۔ پاسپورٹ پر دخول والا صفحہ ہی غائب ہے۔ وہ ہمارا ہمسفر رہتا تو اس کی وجہ سے ہم بھی مشکل میں پڑ سکتے تھے۔" ابراہیم سوچ میں پڑ گیا۔

یکایک مجھے اپنی بائیں جانب ریت کے ٹیلے کے پیچھے حرکت نظر آئی۔ پہلے تین چار سر نمودار ہوئے پھر باقی دھڑ نظر آئے۔ پتا چلا کہ پانچ کے قریب افراد تیزی سے ہماری طرف لپک رہے ہیں۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کریں۔ فاصلہ اتنا کم تھا کہ ردعمل کا موقع ہی نہیں تھا۔ ان افراد کے کپڑے سیاہی مائل تھے۔ اپنے حلیے سے یہ بدو لگتے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے کہ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں چھوٹی نال والی رائفل تھی۔

میں اور ابراہیم ہراس کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔ ہمارے قریب پہنچتے ہی یہ لوگ ناقابل فہم زبان میں چلانے لگے۔ ان کا انداز بے حد جارحانہ تھا۔ ان کے اشاروں سے پتا چلتا تھا کہ وہ ہمیں ہاتھ کھڑے کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ ہم نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ انہوں نے ہمیں اوندھے منہ ریت پر لیٹنے کو کہا۔ ہم نے ذرا تذبذب دکھایا تو ایک دراز قد بدو نے چلا کر کچھ کہا اور رائفل بردار شخص نے رائفل کا دستہ بے رحمی سے ابراہیم کی گردن پر رسید کیا۔ ابراہیم کے چہرے پر طیش کے آثار نظر آئے لیکن جب اس نے دیکھا کہ میں لیٹنے کے لیے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا ہوں تو وہ بھی بیٹھ گیا۔ ہم لیٹ گئے تو انہوں نے بڑے غصیلے انداز میں ہماری جامہ تلاشی لی اور جو کچھ ہاتھ لگا، وہ نکال لیا۔ میری کلائی میں ابھی تک شادی والی گھڑی موجود تھی اور ایک انگلی میں چھوٹی طلائی انگوٹھی بھی تھی۔ یہ دونوں چیزیں بھی ان کے قبضے میں چلی گئیں پھر وہ لکڑی کے اسٹریچر پر پڑے آفتاب گل کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی جیب سے بھی نقدی وغیرہ نکال لی۔

وہ عربی سے ملتی جلتی زبان ہی بول رہے تھے اور ان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ صحرائی لٹیرے ہیں، ان کی خودرو داڑھیاں جھاڑ جھنکاڑ کی طرح تھیں۔ تین افراد کے چہرے پر بڑی بڑی پگڑیاں تھیں اور ان بوسیدہ پگڑیوں کے پلو سے انہوں نے اپنے چہرے بھی ڈھانپ رکھے تھے۔ ایک ایسے ہی شخص کے ہاتھ میں مجھے ایک خم دار چھری بھی نظر آئی۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں ابراہیم کو سمجھا دیا کہ ہمیں مزاحمت کر کے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔

ہمارے مختصر سامان کو بھی الٹ پلٹ کیا گیا اور اس میں سے جو چیز ان کو اپنے کام کی لگی، وہ انہوں نے نکال

لی۔ اب وہ ہمیں، ہمارے حال پر چھوڑ کر واپس جانے کے لیے تیار نظر آتے تھے لیکن اس موقع پر ان میں سے ایک شخص سے ایک ایسا کام ہو گیا جس نے سارا نقشہ ہی بدل دیا۔ جاتے جاتے اس شخص کی نظر ریگزین کی اس براؤن تھیلی پر پڑی جو پلاسٹک کے ایک شاپر میں سے جھانک رہی تھی۔ اس نے تھیلی اٹھائی تو ابراہیم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

لٹیرا تھیلی اٹھا کر اپنے ساتھیوں کی طرف دوڑا تو ابراہیم بھی بے ساختہ اٹھ کر اس کے پیچھے لپکا۔ ”رک جاؤ...... چھوڑ دو اسے...... چھوڑ دو۔“ وہ پکارا۔

اس کی پکار میں موجود تڑپ سے لگتا تھا جیسے یہ لٹیرا اس کی ساری عمر کی پونجی لے کر بھاگ رہا ہے۔

لٹیروں نے جب ابراہیم کو اپنے پیچھے آتے دیکھا تو وہ رک گئے۔ رائفل بردار نے ابراہیم کو ڈرانے کے لیے اس کے پاؤں کے قریب فائر کیا۔ دھماکے کے ساتھ بہت سی ریت اچھلی لیکن اگر فائر کرنے والا یہ سمجھتا تھا کہ ابراہیم ڈر کر رک جائے گا تو ایسا نہیں ہوا۔ وہ تھیلی کی طرف لپکتا چلا گیا۔

”ٹھہرو ابراہیم۔“ میں بھی پکارا۔

لیکن وہ ٹھہرنے والا نہیں تھا۔ یہ تھیلی اس کا عشق تھی اور عشق انمول ہوتا ہے۔ رائفل بردار نے دوسرا فائر سیدھا ابراہیم پر کیا۔ گولی ابراہیم کے کندھے کے اوپر سے گزری۔ وہ چلاتا ہوا تھیلی بردار پر جا پڑا۔ تب تک میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ابراہیم کی طرف دوڑ لگا چکا تھا۔ ان لوگوں کی ساری توجہ ابراہیم کی طرف تھی جو تھیلی بردار سے گتھم گتھا ہو چکا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اندھا دھند رائفل والے بدو پر جا پڑا۔ میں نے اس کی رائفل کا بیرل نیچے جھکا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے سر کی بھرپور ضرب اس کے چہرے پر لگی۔ وہ کراہتا ہوا پشت کے بل گرا۔

دراز قد شخص نے مجھے رائفل بردار کے اوپر سے کھینچ لیا اور میرے ساتھ لپٹ گیا۔ ایسی لڑائی بھڑائی میں کالج کے زمانے میں خوب کر چکا تھا۔ میں نے اس شخص کی ناف میں گھٹنے کی زوردار چوٹ لگائی اور پھر اڑنگا لگا کر اسے گرا دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ ابراہیم بھی اپنے دو حریفوں سے پوری پوری ٹکر لے رہا ہے۔ دراز قد شخص جب میرے نیچے آیا تو اس نے اپنے لبادے کے اندر سے خم دار چھری نکال لی۔ مجھے اپنا سر پیچھے ہٹانے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی ہوتی تو شاید میں یہ روداد آپ کو سنانے کے لیے آج زندہ نہ ہوتا۔

چھری میری گردن کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے دراز قد شخص کے چہرے پر مکوں کی بارش کر دی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آ رہی تھی۔ شاید اسے ہم دونوں سے ایسی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔

یکایک اوپر تلے تین چار فائر ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی کسی گاڑی کے انجن کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹیلے کے عقب سے ایک جیپ برآمد ہوئی تھی اور تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ فائرنگ بھی اسی پر سے کی گئی تھی۔ جس وقت میں جیپ کی طرف دیکھ رہا تھا، دراز قد شخص نے میرے نیچے سے نکل کر دوڑ لگا دی اور صرف وہی نہیں باقی افراد بھی ایک دم بھاگ کھڑے ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک ریتیلے ٹیلے کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ انہوں نے جو چیزیں ہم سے چھینی تھیں، ان میں سے دو چار ریت پر ہی پڑی رہ گئی تھیں۔ ریگزین کی براؤن تھیلی بھی ان میں شامل تھی۔ اس میں مہرو کی نشانیاں تھیں اور یہ ابراہیم کی متاعِ حیات تھی۔

اس نے جلدی سے تھیلی اٹھا کر اپنی شلوار کے نیفے میں اڑس لی۔ جیپ میں چار افراد سوار تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر دو ہوائی فائر کیے اور ہمارے پاس آ کر رک گئے۔ لٹیروں کی طرح ان لوگوں نے بھی اپنے چہرے ڈھاٹوں میں چھپائے ہوئے تھے تاہم ان کے لباس کچھ بہتر تھے۔ ایک شخص کے ہاتھ میں رائفل بھی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ لوگ کھلی چھت والی جیپ میں سے چھلانگیں لگا کر نیچے اترے۔ تب ایک شخص کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ یہ نوجوان حافظ احسان تھا۔ یہ لانچ کے بدقسمت مسافروں میں سے ایک تھا اور ساحل پر اترنے کے بعد اس کا بھی کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ بھی جندل خاں وغیرہ سمیت سمندر میں ڈوب چکا ہے۔ حافظ احسان مقامی طرز کے لباس میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر ہم سے لپٹ گیا۔ اسی دوران میں جیپ کے عربی سوار بھی اپنے چہروں سے ڈھاٹے کھول چکے تھے۔ وہ اپنی صورتوں سے صحرائی باشندے ہی نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک رعب دار شخص کی پیشانی پر نماز کا محراب بہت نمایاں تھا۔

حافظ احسان نے پہلے اس رعب دار شخص سے عربی میں بات کی۔ پھر ہمیں بتایا کہ اب ہمیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم بالکل محفوظ جگہ پر ہیں۔ اس نے رعب دار شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”ان کا

نام شیخ حارث ہے۔ یہاں ان کا ایک احاطہ ہے جس میں یہ بھیڑیں وغیرہ پالتے ہیں۔ بہت نیک آدمی ہیں۔ اگر یہ نہ ملتے تو شاید میں اسی ویرانے میں گھوم گھوم کر مر جاتا۔“

پھر حافظ احسان نے مجھے اور ابراہیم کو سرتاپا دیکھا اور پوچھا کہ ہمیں کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں لگی۔ ہم دونوں بالکل ٹھیک تھے۔ صرف ابراہیم کے سر سے تھوڑا سا خون رس رہا تھا۔ حافظ احسان نے کہا۔ ”یہ وہی لوگ تھے جن کو ہم اپنی زبان میں راہزن کہتے ہیں۔ اپنے علاقے میں کسی بھولے بھٹکے مسافر کو دیکھ کر اسے لوٹنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ شیخ حارث ایسے لوگوں سے نمٹنا خوب جانتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ شام تک ان کا پتا چل جائے گا۔“

پھر حافظ احسان، زخمی آفتاب گل کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس کی حالت پر تشویش کا اظہار کیا۔ وہ گاہے بگاہے اپنے میزبان شیخ حارث کے سوالوں کا جواب بھی دے رہا تھا۔

کھلی چھت والی یہ جیپ پرانی تھی لیکن کافی کشادہ تھی۔ کچھ دیر بعد ہم نے زخمی آفتاب کو احتیاط سے جیپ کی سب سے پچھلی نشست پر لٹایا اور خود بھی سوار ہو گئے۔ اب ہم ایک نئی منزل کی طرف جا رہے تھے اور ایک طرح سے یہ ہماری غیبی امداد ہی تھی۔

☆☆☆

شیخ حارث کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ یہاں سات آٹھ کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ ارد گرد چند درخت موجود تھے۔ ٹیلوں کے ارد گرد صحرائی جھاڑ جھنکاڑ نظر آ رہا تھا۔ احاطے میں بھیڑوں کے دو علیحدہ علیحدہ ریوڑ تھے۔ بھیڑوں کی مجموعی تعداد تین سو سے کم نہیں ہوگی۔ ایک بیڈفورڈ ٹرک بھی یہاں موجود تھا جو جانوروں کے لیے چارا وغیرہ لانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ شیخ یہاں اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ شیخ حارث کے گھر میں جس سب سے اہم اور دلچسپ ہستی سے ہماری ملاقات ہوئی، وہ شیخ حارث کے والد محترم تھے۔ حافظ احسان کے مطابق ان کی تصدیق شدہ عمر ایک سو دس برس تھی۔ ان کی کمر جھک کر کمان بن چکی تھی اور لمبی سفید ڈاڑھی گھٹنوں سے چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ چوبیس گھنٹوں میں اونٹنی کے دودھ کا صرف آدھا گلاس پیتے تھے اور یہی ان کی کل خوراک تھی۔ ان کے دن اور رات کا اکثر حصہ عبادت میں گزرتا تھا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ نوے سال کے بعد ان کی ”اندر کی آنکھیں“ کھل گئی تھیں اور اب وہ ماضی اور مستقبل کے بارے میں بہت کچھ جان لیتے ہیں۔ میں نے ان کو جائے نماز پر دوزانو بیٹھے دیکھا اور مجھے ان کے چہرے پر وہی نورانی جھلک نظر آئی جو صرف ”اللہ والوں“ کا نصیب ہوتی ہے۔

شیخ حارث کے ٹھکانے پر پہنچ کر ہم نے سب سے پہلے آفتاب گل کی نازک حالت پر توجہ دی۔ شیخ کا ایک آدمی کہیں سے ایک ہنرمند جراح کو لے آیا۔ اس نے دستیاب اوزاروں کی مدد سے آفتاب گل کی ناف میں ایک کٹ لگایا اور کسی نہ کسی طرح گولی نکالنے میں کامیاب ہوا۔ تب اس نے زخم کو سی کر بینڈیج کر دی اور کھانے کے لیے کچھ ایلوپیتھک دوائیں بھی دیں لیکن وہ زیادہ مطمئن نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ جیسے ہی مریض کی حالت کچھ بہتر ہو اسے بصرہ یا پھر بغداد لے جایا جائے۔

شیخ حارث اور حافظ احسان سے ملنے کے بعد اس بات کی مکمل تصدیق ہو چکی تھی کہ ہم عراق میں ہی ہیں...... اور یہ بڑی تکلیف دہ سچائی تھی۔ رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ اتنی تکلیفیں اٹھانے کے بعد بھی ہم اسی جگہ موجود تھے جہاں سے چلے تھے۔ پچھلے چند دنوں کی صعوبتوں نے جسم اور ذہن کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرا وزن دس پندرہ دنوں میں کم و بیش دس پاؤنڈ کم ہو گیا تھا۔ میری پتلون کی بیلٹ بہت ڈھیلی ہو گئی تھی۔ بال منتشر اور ڈاڑھی بڑھ چکی تھی۔ حافظ احسان بھی پہلے سے بہت کمزور نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں پر مجھے چوٹوں کے نشان بھی نظر آئے۔ اس نے بتایا کہ سمندر کے نمکین پانی میں غوطے کھاتے ہوئے وہ ساحل کے قریب پہنچا تو اس نے جندل خاں کو ڈوبتے دیکھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا رکھے تھے اور مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ کنارے پر پہنچتے ہی حافظ احسان کے ذہن میں خوف جاگا کہ ابھی پولیس کی موٹر بوٹ...... لانچ کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے گی اور وہ سب پکڑے جائیں گے۔ وہ اندھا دھند وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس نے کہا۔ ”ہارون بھائی! میں نے قریباً دس کلومیٹر تک سخت گرمی میں سفر کیا اور پھر پیاس سے بدحال ہو گیا۔ میرے پاس پینے کے لیے ایک قطرہ نہیں تھا اور دور دور تک کوئی مددگار نظر نہیں آتا تھا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے بارڈر پولیس کے کچھ لوگوں نے مجھے پکڑا اور اپنی چوکی پر لے گئے۔ انہوں نے وہاں اڑتالیس گھنٹے تک مجھے بری طرح مارا اور مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں کس چکر میں یہاں گھوم رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی بار بار پوچھا کہ میں صدام حسین

کے بارے میں کس طرح کے خیالات رکھتا ہوں۔ وہ میری کسی بات پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ بھیگا ہوا پاسپورٹ میرے پاس تھا، اگر وہ بھی نہ ہوتا تو وہ میری اور بری حالت کر دیتے۔ تیسرے روز انہیں کسی وجہ سے اچانک اپنی چوکی سے جانا پڑا۔ گاڑی میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاسکتے۔ پتا نہیں ان کے دل میں کیا آئی کہ انہوں نے برا بھلا کہنے کے بعد مجھے چھوڑ دیا۔ کچھ پانی بھی انہوں نے مجھے دے دیا تھا لیکن میں ایک بار پھر راستہ بھول گیا۔ اگر شیخ حارث رحمت کا فرشتہ بن کر نہ آتے تو پتا نہیں میرا کیا حال ہوتا۔''

ہم نے حافظ احسان کی پوری روداد سنی۔ روداد ختم ہوئی تو شیخ کا ایک ملازم ہمارے لیے دھلے ہوئے صاف ستھرے کپڑے لے آیا۔ ہم نے شیو وغیرہ بنائی اور ٹھنڈے پانی سے پُرلطف غسل کیا۔ مغرب کی اذان ہوئی تو ہم نے شیخ حارث کی امامت میں باجماعت نماز ادا کی۔ شیخ کے عمر رسیدہ والد ایک وھیل چیئر پر نماز میں شریک تھے۔ شیخ حارث نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ابراہیم میرا رشتے دار ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔ شیخ حارث نے کہا کہ میری اور ابراہیم کی شکل میں تھوڑی سی مشابہت پائی جاتی ہے۔

شیخ حارث کی مالی حالت بہت بری تھی، نہ بہت اچھی تھی۔ بہرحال انہوں نے ہماری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اصل عرب ہونے کا ثبوت دیا۔ ہم مسلسل آفتاب کی دیکھ بھال بھی کر رہے تھے۔ اسے دوا ہضم نہیں ہو رہی تھی اور وہ کسی وقت قے بھی کر دیتا تھا۔ اس کی طرف سے دل بہت پریشان تھا۔ ابراہیم مسلسل اس کے سرہانے موجود رہتا تھا، وہ اٹھتا تھا تو میں بیٹھ جاتا تھا۔

اگلے روز ظہر کی نماز کے بعد میں نے شیخ حارث کے والد محترم سے ملاقات کی سعادت حاصل کی۔ اتنی عمر میں بھی ان کی قوتِ سماعت زبردست تھی اور بینائی بھی زیادہ کم نہیں ہوئی تھی۔ میں ان کے سامنے دوزانو بیٹھا تھا۔ میرے پہلو میں حافظ احسان تھا۔ بزرگوار نے اپنی گھنی سفید بھوؤں کے نیچے سے مجھے بغور دیکھا۔ پھر اپنا دستِ شفقت میرے سر پر رکھا۔ میں صرف پانچ دس منٹ ان کے پاس بیٹھنے کی خواہش رکھتا تھا لیکن میری خوش نصیبی کہ ان کے ساتھ میری ملاقات طویل ہوتی چلی گئی۔ یہ وہی اپنائیت تھی جو عام لوگ بھی مجھ سے محسوس کرنے لگتے تھے۔ بزرگوار نے مجھ سے کئی باتیں پوچھیں۔ میں نے ان کا جواب دیا اور حافظ احسان نے میرے جوابات کا عربی میں ترجمہ کر کے ان تک پہنچایا۔ ان کی اپنائیت دیکھ کر میرا دل بھر آیا تھا۔ میں نے انہیں اپنی داستانِ غم سنائی اور ان پر اسرار حالات کا ذکر بھی کر دیا جو اب تک وقتاً فوقتاً پیش آتے رہے تھے۔

عصر کی نماز کے بعد بھی ہماری نشست جاری رہی۔ میں نے پوچھا۔ ''بزرگوار! کیا واقعی ہمارے اردگرد ایک ایسی دنیا موجود ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی۔ جنات، روحیں، نوری اور ناری ہیولے؟''

میرا سوال احسان نے ان تک عربی میں پہنچایا، پھر ان کا جواب عربی میں لے کر اردو میں مجھے بتایا۔ بزرگوار نے کہا۔ ''بہت کچھ برحق ہے لیکن ابھی ہم اس کی اصل حقیقت نہیں جانتے۔ سائنس بے چاری کوشش کر رہی ہے لیکن ابھی وہ ان منزلوں سے بہت دور ہے، جب اس کائنات میں موجود ایک دوسری کائنات کے راز ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ ہم پر کھل سکیں، ہم خدا کی ان مخلوقات سے مل سکیں جو مختلف شکلوں میں ہمارے آس پاس موجود رہتی ہیں۔''

میں نے بزرگوار کو اس ہیولے کے بارے میں بتایا جو مجھے وقتاً فوقتاً نظر آتا تھا اور وہ ناقابلِ فہم الفاظ جو میرے کانوں میں گونجا کرتے تھے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان بزرگوار نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کہی جو کچھ عرصہ پہلے روضے کے درویش صفت بزرگ عالی مقام نے کہی تھی۔ بزرگوار کی شکن شکن پیشانی پر کچھ مزید شکنیں ابھریں اور انہوں نے احسان کی وساطت سے کہا۔ ''بیٹا، مجھے لگتا ہے کہ تمہارے آباؤاجداد دین سے جو رغبت رکھتے تھے، وہ تمہاری رغبت سے بہت زیادہ تھی۔ ہوسکتا ہے کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے، اس کا تعلق تمہارے دادا، پڑدادا...... یا پھر اس سے بھی اگلی کسی پیڑھی کے ساتھ ہو۔''

''کس قسم کا تعلق بزرگوار۔'' میں نے عاجز لہجے میں کہا۔ میری آنکھوں میں نمی تھی۔

وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ ان کی کمر اتنی جھکی ہوئی تھی کہ ان کا سر گود میں نظر آتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ وہ ماضی میں جھانک لیتے ہیں۔ شاید وہ اب بھی یہی کوشش کر رہے تھے۔ کتنی ہی دیر بعد انہوں نے اپنا سر تھوڑا سا اٹھایا اور بولے۔ ''آگے کچھ نظر نہیں آ رہا ایک اندھیرا سا ہے۔ ایک جگہ پہنچ کر ایک دیوار سی سامنے آجاتی ہے۔ بہرحال تم اس کی

تفصیل میں زیادہ نہ جاؤ۔ اللہ رب العزت کی طرف دھیان دو اور جتنا بھی ہو سکے گناہوں کی معافی مانگو۔''

''مم...... مجھے کوئی وظیفہ بتائیں یا حضرت...... جو میری مشکلوں کو آسان کرنے میں میری مدد کرے۔ میرے لیے واپسی کی کوئی امید پیدا ہو۔''

''اللہ کے ذکر اور نیک بندوں کی صحبت سے بڑھ کر کوئی وظیفہ نہیں......'' انہوں نے کہا اور پھر ذرا توقف کر کے بولے۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھنا بیٹا۔ اس ہیولے کے نظر آنے کو معمولی چیز نہ سمجھنا۔ یہ ہر وقت تمہارے آس پاس موجود ہے اور کسی وقت تمہاری جان بھی لے سکتا ہے۔ خاص طور سے جب یہ رات کو نظر آئے گا تو زیادہ خطرناک ہوگا۔''

میرے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ میرے اصرار پر بزرگوار نے مجھے ایک وظیفہ بھی بتایا اور کہا کہ میں عشا کے بعد کثرت سے اس کا ورد کروں...... اور یہ بھی کوشش کروں کہ اندھیرا پھیلنے کے بعد تنہا نہ رہوں۔

اگلے روز شام کے فوراً بعد آفتاب گل کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ جراح آیا تاہم اس نے بھی یہی کہا کہ سفر کرنے کے لیے مریض کی حالت کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ ایک بڑے لیمپ کی روشنی میں ابراہیم اور میں مسلسل آفتاب کے سرہانے بیٹھے رہے اور وہ سب کچھ کرتے رہے جو ہمارے بس میں تھا۔ بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کی حالت میں آفتاب کسی وقت بڑبڑانے لگتا تھا اور مکہ معظمہ کی باتیں کرتا تھا۔ شاید اسے لگتا تھا کہ وہ اپنی منزل یعنی خدا کے گھر پہنچ چکا ہے۔

کسی وقت اس کا رنگ انگارے کی طرح سرخ تھا لیکن اب یہ انگارہ راکھ بن چکا تھا۔ رات کے گیارہ بجے ہوں گے جب آفتاب گل ذرا ہوش میں آیا۔ اس نے اشارے سے مجھے کہا کہ میں اس کا سفری بیگ اس کے پاس لے کر آؤں۔ میں بیگ اس کے پاس لے گیا۔ بیگ تقریباً خالی تھا۔ اس میں جو بھی کوئی قابلِ استعمال چیز تھی، وہ لٹیرے نکال کر لے گئے تھے۔ اس بیگ کا پیندا لکڑی کا تھا۔ آفتاب نے پیندے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس پیندے کو دھیان سے دیکھوں۔

میں نے غور کیا تو پتا چلا کہ اس پیندے کی دو پرتیں ہیں اور ان کے درمیان بھی شاید کچھ ہے۔ آفتاب کے کہنے پر ہم نے چاقو کی مدد سے پیندے کو کھولا تو اس میں سونے کے کچھ زیورات نظر آئے۔ اس کے علاوہ چند بڑے کرنسی نوٹ بھی تھے۔ ہم حیران رہ گئے۔ اگر لٹیرے یہ بیگ ہی اٹھا کر لے جاتے تو یقیناً فائدے میں رہتے۔ یہ کوئی دس ہزار پاکستانی روپیا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق زیورات کی مالیت بھی ایک لاکھ روپے سے کم نہیں تھی۔ یاد رہے کہ یہ 1973ء کی بات ہے۔ اس وقت کا ایک لاکھ آج کی بہت بڑی رقم ہے۔

آفتاب نے میرا اور ابراہیم کا ہاتھ ایک ساتھ پکڑا اور بہت نحیف آواز میں بولا۔ ''تم دونوں نے امارا بہت خدمت کیا۔ امارے سگے بیٹے یا بھائی بھی ہوتے تو ایسا نہ کرتے۔ اپنی جان تک کا پروا نہ کیا تم دونوں نے...... اب امارا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اب امارے پاس جو کچھ ہے، یہ ام تم دونوں کو دیتا ہے۔ یہ تم آدھا آدھا لے لینا اور بس کبھی کبھی پڑھ کر ام کو بخش دیا کرنا۔''

''نہیں آفتاب بھائی۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔ ''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم تمہیں کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ تمہاری طبیعت ذرا بہتر ہوتی ہے تو ہم شیخ صاحب کے ٹرک میں بستر بچھا کر تمہیں بصرہ لے جائیں گے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا کہ اس نے بہت فاصلہ طے کر لیا ہے، اب وہ واپس آنا نہیں چاہتا۔

......اور وہ واقعی واپس نہیں آیا۔ قریباً دو گھنٹے بعد وہ مر گیا۔ اس کی سانس کی الجھی ہوئی ڈور ٹوٹ گئی۔ وہ دلیر تھا۔ اپنی پیاری بیٹی کی خاطر اس نے دو قتل کیے پھر ایک دوسری بیٹی کو بچانے کے لیے کمال رشید کی گولی سے جان لیوا طور پر زخمی ہوگیا۔ وہ اپنے گناہوں کی معافی حاصل کرنے کے لیے خانۂ خدا جانا چاہتا تھا لیکن اس کی معافی شاید راستے میں ہی قبول ہوگئی تھی۔

شیخ حارث نے آفتاب گل کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ شیخ کے والد اور ملازمین نے بھی شرکت کی۔ ہم نے آہوں اور سسکیوں کے درمیان اسے احاطے سے تھوڑی دور کھجوروں کے ایک جھنڈ کے نیچے دفن کر دیا۔ یہاں پہلے سے چار پانچ پرانی قبریں موجود تھیں۔

ایک دو روز بہت اداسی رہی۔ آفتاب گل کا سامان میرے پاس ہی تھا۔ میں نے ابراہیم سے کہا کہ وہ اسے اپنے پاس رکھ لے مگر وہ بولا۔ ''نہیں سائیں! ابھی اسے پاس ہی رکھو۔''

ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ آفتاب گل مالی طور پر اتنا مضبوط شخص ہوگا اور جاتے جاتے وہ اپنا اثاثہ اس طرح ہم دونوں کو دے جائے گا۔ جس طرح لانچ کے دیگر مسافر اسے

چھوڑ کر نکل گئے تھے اگر ہم بھی نکل جاتے تو یقیناً آفتاب بہت تکلیف جھیل کر دنیا سے رخصت ہوتا۔ اب کم از کم یہ تو ہوا تھا کہ اسے ہمدردی، محبت اور مسلسل توجہ ملی تھی۔ اس کا آخری وقت نسبتاً آسان گزرا تھا۔

تیسرے روز ہمیں اس سامان میں سے کچھ واپس مل گیا جو صحرائی لٹیرے ہم سے چھین کر لے گئے تھے۔ اس میں میری کچھ نقدی بھی شامل تھی، بہر حال زیادہ تر اشیا ان کے پاس ہی رہ گئی تھیں۔ ان میں میری شادی کی انگوٹھی بھی تھی جس کا مجھے بہت افسوس تھا۔ معلوم ہوا کہ ان لٹیروں میں سے دو پکڑے گئے تھے۔

رات کو میں دیر تک جندل خاں اور آفتاب گل کی چھوڑی ہوئی اشیا دیکھتا رہا۔ خاص طور سے جندل خاں کی اشیا مجھے بہت دکھی کر دیتی تھیں۔ اس کی کنگھی، شیشہ، نسوار کی ڈبیا، کپڑے اور وہ دو تصویریں۔ ایک تصویر میں وہ اپنی پھول سی بچی کو گود میں اٹھائے کھڑا تھا۔ باقی بچے اس کے دائیں بائیں تھے۔ نہ جانے وہ کہاں تھے؟ کس حال میں تھے؟ میرے کانوں میں ایک گیت کے بول گونجنے لگے۔

سات سمندر پار سے۔ گڑیوں کے بازار سے
چھوٹی سی گڑیا لانا
گڑیا چاہے نہ لانا۔ پپا جلدی آجانا

......لیکن اب پپا کو کبھی واپس نہیں جانا تھا۔ وہ سات سمندر پار ہی نہیں کر سکا تھا۔ اب کچھ نگاہوں کو ہر شام اس کے خط کا انتظار کرنا تھا مگر اب خط کو نہیں آنا تھا۔ نہ خط لکھنے والے کو خود آنا تھا۔ آہستہ آہستہ آسیں ٹوٹ جاتی تھیں، رو رو کر آنسو خشک ہو جاتے تھے مگر زخمی دل تو کسی کے لیے دھڑکتے رہتے تھے، یہ جانے بغیر کہ ان کی خاطر پردیس کی خاک چھاننے والا خلیج فارس کے پانیوں میں گم ہو چکا ہے اور یہ کسی ایک جندل خاں کی کہانی تو نہیں تھی۔ پتا نہیں ایسے کتنے پردیسی اسی طرح اپنے بچوں کے ماتھے چوم کر انجانے دیسوں کی طرف جاتے ہیں اور ان کی خوشیوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے موت کے اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔ کبھی ان کا سراغ نہیں ملتا۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں، جو مر جاتے ہیں ان کے لیے آخر قرار آجاتا ہے لیکن جو کھو جاتے ہیں، وہ ہمیشہ تڑپاتے رہتے ہیں۔

کیا میرے گھر والے بھی اسی طرح ہمیشہ میرے لیے تڑپتے رہیں گے؟ میری ماں ہر صبح دروازہ کھول کر کھڑی رہے گی، میری دلہن ہر شام میرا انتظار کرتی رہے گی، میرے لیے ہر بدلتے موسم میں آہیں بھری جائیں گی، ہر تہوار پر آنسو بہائے جائیں گے؟ کیا اب میرے گھر کے در و دیوار کبھی مجھے دوبارہ نہیں دیکھ سکیں گے؟ دل سے ایک شدید ٹیس اٹھی۔ نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں ہر وہم اور خوف کے جال کو توڑ دوں گا۔ میں واپس جاؤں گا۔ جیسے بھی ہوا واپس جاؤں گا۔ مجھے جندل خاں نہیں بننا۔ مجھے اپنے گھر والوں کو ہمیشہ کا دکھ نہیں دینا۔ کل شیخ حارث نے بھی یہی بات کہی تھی۔ میری ساری روداد سننے کے بعد اس نے کہا تھا...... ہارون! تم نے اپنی دلہن کے ساتھ اور اپنے گھر والوں کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ یہاں رہو گے تو کسی دن کسی جگہ تم بھی جندل اور آفتاب کی طرح کھو جاؤ گے۔ جتنی جلدی ہو سکے اپنی واپسی کے بارے میں سوچو۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ بغداد میں ان کے ایک دو جاننے والے ہیں۔ وہ واپسی کے سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور بے چینی سے اس مختصر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ صحرا کی خشک اور سنسان رات نے قرب و جوار کو ڈھانپ رکھا تھا۔ بس احاطے کی طرف سے کسی وقت کسی جانور کے بولنے کی آواز آتی تھی اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں میں نے آئینے کے اندر اپنا چہرہ دیکھا۔ رنگ سانولا ہو چکا تھا، رخساروں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ سر کے بال جھاڑ جھنکار کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ کیا یہ وہی ہارون انور تھا...... وہی دُلہا تھا جو اپریل کی اس پر اسرار رات کو خوشیوں اور روشنیوں سے بھرے ہوئے اس گھر کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا تھا۔

آئینے میں دیکھتے دیکھتے اچانک میں چونک گیا۔ میرے پیچھے کوئی کھڑا تھا۔ میں نے آنکھیں سکوڑ کر غور سے دیکھا اور سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ یہ وہی تھا...... یہ وہی تھا جس نے ہر موڑ پر مجھے اپنی خطرناک موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ میں بے ساختہ گھوما۔ اپنے عقب میں دیکھا۔ عقب خالی تھا۔ سفید مٹی کی دیوار تھی اور لکڑی کی ایک تپائی تھی جس پر اونٹ کی کھال کا نمدہ بچھا ہوا تھا۔ میں نے پھر آئینے میں دیکھا، وہ تپائی کے ساتھ کھڑا نظر آرہا تھا۔ میرے کانوں میں وہی لرزا دینے والی آواز گونجی۔ کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا نا...... اور ایسا نہیں ہوا۔

اس مرتبہ اس آواز میں قہر تھا اور ایک ناقابلِ بیان حرارت تھی۔ ان ساعتوں میں اچانک مجھے شیخ حارث کے والدِ محترم کی بات یاد آئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ رات کے اندھیرے میں میرے لیے اندیشے ہیں۔ خاص طور سے اس وقت جب میں تنہا ہوں اور اب اندھیرا تھا اور تنہائی بھی تھی۔ میں کمرے سے نکلنے کے لیے پلٹا لیکن مجھے لگا کہ

کسی نے مجھے پیچھے سے جکڑ لیا ہے۔ اس نے نہ صرف مجھے جکڑ لیا تھا بلکہ میرے منہ کو بھی مضبوطی سے ڈھانپ لیا تھا۔ میں چلّانا چاہتا تھا لیکن چلّا نہیں سکتا تھا۔ بھاگنا چاہتا تھا لیکن بھاگ نہیں سکتا تھا۔ میرے پاؤں جیسے زمین میں گڑ چکے تھے۔ میں نے اپنا منہ کھولنا چاہا۔ مدد کے لیے پکارنا چاہا مگر ناکام رہا۔ مجھے لگا کہ مجھ پر فالج کا حملہ ہو گیا ہے۔ مجھے جکڑنے والی قوت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ سانس سینے میں گھٹنے لگی۔ پسلیاں کڑکڑا اٹھیں۔ باڑے کی طرف بہت سی بھیڑیں زور زور سے بول رہی تھیں۔ حالانکہ پہلے ایسا نہیں ہوا تھا۔ مجھے لگا میرا آخری وقت آگیا ہے۔ میرے پاؤں کے ساتھ لیمپ ٹکرایا اور گر گیا۔ گہرا اندھیرا چھا گیا۔

میں کچھ بھی بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کر رہا۔ نہ اس میں اپنے احساسات شامل کر رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ سب میرا واہمہ تھا، میرے اندر کا خوف تھا۔ نہ ہی یہ کہوں گا کہ وہ سفید پوش ہیولا واقعی اس کمرے میں موجود تھا اور مجھے عقب سے دبوچ چکا تھا۔ بس وہی کہہ رہا ہوں جو مجھ پر بیتا۔ مجھے نہیں پتا میں نے کس طرح دروازے کی کنڈی کھولی، کس طرح باہر نکلا اور کس طرح اس کمرے تک پہنچا جہاں ابراہیم اور حافظ احسان سو رہے تھے۔ میں نے اندھا دھند ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میرے منہ سے اب بھی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ کوئی اب بھی میرے پیچھے تھا اور مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ اس کی سانسوں کی سرسراہٹ اور مشک و کافور کی بو میں صاف محسوس کر رہا تھا۔ وہ مجھے اتنے زور سے دبا رہا تھا کہ سانس کی آمد و رفت ختم ہو گئی تھی۔

پھر میں تیورا کر گر پڑا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی چادر پھیلتی چلی گئی۔ میں نے جو آخری آواز سنی وہ دروازہ کھلنے کی تھی۔

دوبارہ جب ہوش آیا تو میں اسی کمرے میں بستر پر لیٹا تھا۔ حافظ احسان میرے سرہانے کی طرف بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ ابراہیم میرے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ میرا سارا جسم آگ میں جل رہا ہے۔ ابراہیم نے ایک دو بار کپڑے سے میری ناک صاف کی تو مجھے پتا چلا کہ میری ناک سے تھوڑا تھوڑا خون رس رہا ہے۔ ابراہیم بولا۔ ”خطرے کی بات نہیں سائیں۔ یہ نکسیر کی طرح کا خون ہے۔“

قریباً دو گھنٹے بعد میری طبیعت کچھ سنبھلی تو ابراہیم نے مجھ سے سوال جواب شروع کیے۔ دوسروں کی طرح اس کا خیال بھی یہی تھا کہ میں سوتے میں ڈر گیا ہوں اور کچھ زیادہ ہی ڈر گیا ہوں لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں جاگتے میں ڈرا ہوں اور جس چیز سے ڈرا ہوں، وہ ابھی نہیں بہت پہلے سے میرے پیچھے ہے۔

میں کوئی کمزور آدمی نہیں ہوں لیکن میرے دل میں ڈر بیٹھ چکا تھا۔ مجھے اب اس کمرے سے ہی خوف آنے لگا تھا۔ وہی آئینہ تھا، وہی تپائی، وہی سفید دیواریں۔ میں نے حافظ احسان سے کہا کہ میں اس کمرے میں رہنا نہیں چاہتا۔ اس نے جا کر شیخ سے بات کی۔ شیخ نے مجھے ساتھ والے کمرے میں بھیج دیا۔ میں نے ابراہیم سے بھی کہہ دیا کہ وہ میرے پاس سے ادھر ادھر نہ ہو۔ میں مسلسل بخار میں پھنک رہا تھا۔

ابراہیم مجھے مسلسل باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاید میرے دل میں کچھ وہم بیٹھ گئے ہیں۔ میں خود کو بھی یہی سمجھانے اور یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس سے پہلے بھی یہی کرتا رہا تھا۔ فجر کی نماز میں نے وہیں کمرے میں ابراہیم کے ساتھ پڑھی۔ ٹانگوں میں سکت نہیں تھی، اس لیے بیٹھ کر پڑھی۔ سلام پھیرا تو اپنے کندھے پر سے مشک اور کافور کی خوشبو آئی۔ دل ایک بار پھر لرزنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے ابراہیم سے کہا۔ ”ذرا میرا یہ کندھا سونگھو۔“

اس نے دایاں کندھا سونگھا پھر بایاں...... کہنے لگا۔ ”ہارون سائیں! آپ کی قمیص سے خوشبو آرہی ہے۔“

”کس چیز کی؟“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”شاید...... مشک کی...... کافور کی۔“

میں نے لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر لیں۔ سر کے اندر جیسے دھماکے سے ہونے لگے۔ ”یاالٰہی! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ میں کس عذاب میں پھنس گیا ہوں۔“

رات تک طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو میں پھر شیخ کے عمر رسیدہ والدِ محترم کے پاس چلا گیا اور ان کے سامنے اپنا سارا رونا رویا۔ انہوں نے ایک تعویذ میرے بازو سے باندھا اور پڑھنے کے لیے ایک دو مزید وظیفے بتائے۔ اس کے علاوہ ایک بار پھر ہدایت کی کہ میں کچھ عرصے کے لیے رات کے وقت اکیلا نہ رہوں۔ میرے کمرے میں کوئی نہ کوئی ہونا چاہیے۔ میری ناک سے رسنے والا خون بند کرنے کے لیے مجھے انہوں نے ایک سونگھنے والی دوا بھی دی۔ یہ کوئی قدیم عراقی نسخہ تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اخراجِ خون بند کرنے والی یہ دوا ایران اور ہندوستان کے بادشاہ تک استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہ واقعی تیر بہ ہدف تھی۔

مجھے اب پورا پورا یقین ہو چکا تھا کہ میں کبھی پاکستان واپس نہیں جا سکوں گا۔ جو کچھ دو دن پہلے میرے ساتھ ہوا وہ دل دہلا دینے والا تھا۔ مجھے بالکل یہی لگا تھا کہ میں

موت کے منہ میں سے واپس آیا ہوں۔ مشک اور کافور والی بات بھی بری طرح ذہن میں جم چکی تھی۔ اگر وہ سب کچھ خیال تھا تو یہ خوشبو کہاں سے آئی تھی؟ ایک بات یہ سوچی جاسکتی ہے کہ اس واقعے سے صرف ایک دن پہلے ہم آفتاب گل کو دفن کر کے آئے تھے...... اس کے کفن پر بھی خوشبو وغیرہ لگائی گئی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ وہی خوشبو ہو لیکن اگر یہ وہی خوشبو تھی تو پھر ایک دن پہلے کیوں نہ آئی؟ اور یہ میری پوری قمیص پر کس طرح پھیلی؟ اور ابراہیم، احسان وغیرہ نے بھی تو میت کو کندھا دیا تھا۔ ان کے لباس خوشبو سے کیسے محفوظ رہ گئے؟ اور اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ یہ وہ ''خوشبو'' ہی نہیں لگتی تھی۔

☆☆☆

قریباً پانچ روز بعد ہم نے اپنے مہربان میزبان اور ان کے والد گرامی کو خدا حافظ کہا اور ان کی ہی گاڑی پر بصرہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ جیپ ڈرائیور کے علاوہ دو مسلح محافظ ہمارے ساتھ تھے۔ شیخ حارث نے وقتِ رخصت ہمیں بہت سا سامانِ خورونوش دیا۔ اس میں ان کی بھیڑوں کا مکھن، مقامی طور پر تیار کی گئی مٹھائی اور کھجوریں وغیرہ شامل تھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہمیں دو دو چادریں بھی دیں، جن میں سے ایک چادر ٹھنڈی اور دوسری گرم تھی۔ ہمارے کپڑے دھو کر صاف ستھرے کر دیے گئے تھے۔ ان لوگوں نے ہمیں گھر سے ایسے رخصت کیا جیسے کوئی اپنے قریبی عزیزوں کو کرتا ہے۔ وہ ہمیں کافی کچھ دے کر بھیج رہے تھے لیکن اس میں سے جو سب سے اہم چیز تھی وہ محترم بزرگوار کی دعائیں تھیں۔ وہی جھکی ہوئی کمر والا ایک سو دس سالہ عرب...... جس کی بوڑھی آنکھوں میں روحانی چمک تھی۔ بصرہ وہاں سے کم و بیش آٹھ میل دور تھا۔ ہماری جیپ گمنام صحرائی راستوں پر چلتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ آفتاب گل اور اس کی قبر بہت پیچھے رہ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کی مٹی اسے پکارتی ہے۔ خیبر ایجنسی کے آزاد علاقے میں رہنے والے آفتاب کو کسی ویرانے کی مٹی نے پکارا تھا۔

ابراہیم اور میں خستہ حال جیپ کی درمیانی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ ابراہیم کی آنکھیں حسبِ معمول سوجی ہوئی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ راتوں کو روتا رہتا ہے۔ اس کے رونے کی وجہ مجھ سے بڑھ کر اور کون جانتا تھا۔ وہ سرتاپا مہرو کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہچکولے کھاتی ہوئی جیپ میں وہ کچھ دیر کے لیے سو گیا تھا لیکن اس نے اپنا ہاتھ مسلسل ریگزین کی براؤن تھیلی پر رکھا ہوا تھا جو اس کی گود میں تھی۔ یہ تھیلی اس کے لیے ہر شے سے زیادہ قیمتی تھی۔ میں نے تجربے کے طور پر اس تھیلی کو اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکالنا چاہا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اپنی سوجی ہوئی سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

اتنے میں عقب سے حافظ احسان کی آواز آئی۔ ''وہ دیکھو ہارون بھائی! سمندر نظر آرہا ہے۔''

واقعی بائیں جانب ٹیلوں کے پیچھے گاہے بگاہے سمندر کی جھلک نظر آتی تھی۔ سمندر دیکھ کر دل مزید آزردہ ہوگیا۔ اپنا وہ سفر یاد آگیا جو بڑی آسوں امیدوں کے ساتھ شروع ہو کر آہوں اور سسکیوں پر ختم ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر جندل خاں بھی یاد آگیا۔ پانی کی خاموش لہروں پر جیسے پھر ایک گیت گونجنے لگا۔ سات سمندر پار سے...... گڑیوں کے بازار سے...... چھوٹی سی گڑیا لانا......

مجھے یاد آیا۔ ڈوبتے ہوئے جندل خاں مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ وہ میرے بالکل قریب تھا، جہاں میں نے اور بہت کچھ سیکھا تھا کاش تیرنا بھی سیکھا ہوتا۔

ہم سیدھا بصرہ کے بس اڈے پر پہنچے۔ وہی بوسیدہ شہر تھا، وہی دھول اڑاتی سڑکیں۔ شیخ حارث کے آدمیوں نے ہمارے ٹکٹ خود لیے اور بڑے احترام کے ساتھ ہمیں بس میں سوار کرایا۔ بس جب تک روانہ نہیں ہوگئی وہ وہیں کھڑے رہے۔ بس حرکت میں آئی تو انہوں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلائے اور آخر تک ہلاتے رہے۔

جو کچھ ہمارے ساتھ بیت چکا تھا، اس کے بعد روضے میں واپس جانے کی ہمت تو ہم میں نہیں تھی۔ بغداد پہنچ کر ہم ایک مسافر سرائے میں ٹھہر گئے۔ یہ جگہ عباسیہ کہلاتی تھی اور حضرت عبدالقادر کے روضے اور مسجد سے کافی دور تھی۔ میں بھرے پرے اور جانے پہچانے شہر بغداد میں آچکا تھا لیکن میرا خوف ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ خاص طور سے سورج غروب ہوتے ہی میری بے چینی میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ ایسے میں میری کوشش ہوتی تھی کہ ابراہیم یا حافظ احسان میں سے کوئی میرے ساتھ رہے۔ ان دنوں مجھے آئینے کے سامنے جاتے ہوئے بھی خوف آتا تھا۔ لگتا تھا کہ میں جب بھی آئینے کے سامنے جاؤں گا، وہ سفید پوش میرے پیچھے آن کھڑا ہوگا۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ میں کوئی بزدل یا کمزور شخص نہیں ہوں لیکن میرے اندر کی کیفیت کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ میں ہر وقت اپنے اردگرد ایک جان لیوا خطرہ محسوس کرتا تھا۔

بغداد پہنچنے کے تیسرے روز صبح سویرے ابراہیم مجھے بتائے بغیر کہیں نکل گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مہرو کے بارے میں سن گن لینے گیا ہے۔ میں شام تک سخت...... بے قرار رہا۔ شام کو ابراہیم واپس آیا تو میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ مہرو کے بارے میں معلومات لے کر آیا تھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ مرجھایا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ نہ صرف مقررہ پروگرام کے مطابق مہرو کی منگنی ہوگئی ہے بلکہ شادی کا مہینا بھی طے ہوگیا ہے۔ اب نئے پروگرام کے مطابق اس کی شادی صرف پانچ ماہ بعد ہونا تھی۔

میں نے کہا۔ ''تم مجھے بتائے بغیر کیوں گئے؟''

اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ بولا۔ ''سائیں! مجھ سے رہا نہیں گیا۔''

میں نے غصے سے کہا۔ ''اگر جعفر کو پتا چل گیا تو وہ ہڈیاں توڑ کر تمہیں کوڑے کے کسی ڈھیر پر پھینک دے گا...... یا مار کر لاش غائب کرادے گا تمہاری۔''

''تو مار ڈالے۔ ایسے جینے سے تو مرنا چنگا ہے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ جعفر کے گھر کے سامنے ایک انڈین حجام کی دکان پر گیا تھا اور اس نے وہیں سے سن گن لی ہے۔ مجھے شدید خطرات کا احساس ہوا...... ابراہیم کسی بھی وقت بدترین صورت حال کا شکار ہوسکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کے لیے کچھ کرنا ہوگا اور جلد سے جلد کرنا ہوگا۔

اس رات مسافر سرائے کی میلی سی چٹائی پر میں دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ میرے پاؤں کی طرف احسان اور دائیں طرف ابراہیم سو رہے تھے۔ اب میرے دل کے اندر سے یہ پراسرار گواہی آنا شروع ہوگئی تھی کہ میں مستقبل قریب میں پاکستان نہیں جاسکوں گا۔ میں جب بھی واپس جانے کا سوچوں گا، میرے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوجائے گا بلکہ اب تو ایسا ہوگیا تھا کہ پاکستان کا تصور ذہن میں آتے ہی میرا دم گھٹنے لگتا تھا اور مجھے اپنے اردگرد کافور کی بو پھیلتی محسوس ہوتی تھی۔

میں نے سوچا میں نے اس روپے کا کیا کرنا ہے جو آفتاب گل مجھے اور ابراہیم کو آدھا آدھا سونپ گیا ہے۔ اگر میں اپنا حصہ بھی ابراہیم کو دے دوں تو شاید اس کے حالات کچھ بدل جائیں۔ ایک اندازے کے مطابق نقد اور زیور کی شکل میں میرا حصہ تقریباً ساٹھ ہزار روپے تھا۔ ان دنوں یہ ایک بڑی رقم تھی۔

میں جاگ رہا تھا اور مجھے پتا تھا کہ دکھ کا مارا ابراہیم بھی جاگ رہا ہے۔ میں نے اس کا شانہ ہلایا، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ زیرو کے بلب کی مدھم روشنی میں ہم دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے اسے اپنا سارا پروگرام بتایا۔ اس پروگرام کے مطابق میں اپنے حصے سے دستبردار ہو رہا تھا۔ اس دستبرداری کے بعد ابراہیم قریباً ایک لاکھ دس پندرہ ہزار روپے کا اکلوتا مالک تھا۔ جن دنوں میں عطا صاحب کی ورکشاپ میں کام کر رہا تھا، مجھے پتا چلا تھا کہ بازار میں موٹر سائیکل کے اسپیئر پارٹس اور مرمت وغیرہ کی ایک دکان کی شدید ضرورت ہے۔ ٹیکنیکل کام میں اپنے تجربے کی بنیاد پر میں پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ بازار میں ایک ایسی دکان ہو تو فوراً چل پڑے گی۔ عطا صاحب کی ورکشاپ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک دکان پگڑی پر مل بھی رہی تھی۔ پگڑی ادا کر کے بھی ابراہیم کے پاس یقیناً اتنی رقم بچ جاتی کہ وہ دکان میں اسپیئر پارٹس رکھ لیتا...... اگر کسی طرح جعفر کو آمادہ کرلیا جاتا اور وہ ابراہیم کی سرپرستی اور کفالت پر آمادہ ہوجاتا تو یقیناً ابراہیم کی مالی حیثیت مہرو کے منگیتر زبیر سے کہیں بہتر ہوجاتی۔

ابراہیم نے پوری بات سنی، اس کے بعد اس نے وہی کہا جس کی مجھے توقع تھی۔ اس نے کسی بھی صورت میرا حصہ لینے سے انکار کردیا۔ اسے آمادہ کرنے میں مجھے قریباً ایک گھنٹا لگا اور درجنوں دلائل دینا پڑے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اسے قرضِ حسنہ سمجھ لے اور جب وہ مالی طور پر مستحکم ہوجائے...... اور وہ ضرور ہوگا...... تو پھر مجھے رقم لوٹا دے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ ابراہیم جا کر جعفر سے یہ ساری بات کس طرح کرے؟ اور کس طرح اسے بتائے کہ وہ اور مہرو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور اگر مہرو کی شادی زبیر سے ہوگئی تو یہ ایک جھوٹی زندگی کا آغاز ہوگا۔ ایک ایسی زندگی جس کی بنیاد صرف مجبوری اور سمجھوتے پر ہوگی۔

اس بارے میں میرے اور ابراہیم کے درمیان دیر تک گفتگو ہوئی۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ ابراہیم، خود جا کر جعفر سے یہ بات نہیں کرسکے گا اور اگر کرے گا بھی تو شاید اسے قائل نہ کرسکے۔ میں نے کچھ دیر سوچا پھر ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''ٹھیک ہے ابراہیم...... جعفر سے میں بات کروں گا۔''

''لیکن...... اگر سائیں! اس نے آپ سے کوئی

بدتمیزی کی تو......"

"نہیں ابراہیم! انشاء اللہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ میں کل روضے پر جاؤں...... اور وہاں سے چچا سیاف کو بھی ساتھ لے لوں۔ چچا سیاف کی موجودگی سے جعفر اور اس کی فیملی پر اثر پڑے گا۔"

اگلے روز ہم نے سب کچھ طے کرلیا۔ شام کے فوراً بعد میں چچا سیاف سے ملنے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے روضے کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں نے بازار سے خریدا ہوا عربی لباس پہن لیا تھا اور سر پر عربی رومال بھی رکھ لیا تھا۔ اس سے مجھے اپنی شناخت چھپانے میں کافی مدد ملی۔ عراق آنے کے بعد عربی لباس میں نے ایک دو مرتبہ پہلے بھی پہنا تھا۔ بذریعہ بس میں عشا سے تھوڑی دیر پہلے روضے پر پہنچا۔ آنکھیں ایک بار پھر نم ہوگئیں...... سارے بھولے بسرے منظر نگاہوں کے سامنے آگئے۔ میں صحن میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ دل میں امید سی تھی کہ شاید کہیں حضرت عالی مقام کی نورانی صورت دکھائی دے جائے لیکن وہ کہیں نہیں تھے۔ میں چچا سیاف کے حجرے پر پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ توقع کے مطابق چچا سیاف نے ہی دروازہ کھولا۔ ماتھے پر تیوری تھی۔

"کیا بات ہے؟" چچا نے عربی میں پوچھا۔

پھر غور سے مجھے دیکھا اور حیرت سے ان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ "اوئے پوتم؟" آواز کانپ رہی تھی۔

بے چارگی سے میرے آنسو چھلک پڑے۔ میں چچا سیاف کے گلے لگ گیا اور سسکیوں سے رونے لگا۔

"تم...... کویت نہیں گئے؟" چچا سیاف نے مجھے گلے سے لگائے لگائے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں چچا...... ہمارے ساتھ وہی کچھ ہوا، جس سے تم نے ڈرایا تھا۔ ہم بڑی مشکل سے بس اپنی جانیں ہی بچا سکے ہیں۔"

میرے اندر آنے کے بعد چچا سیاف نے جلدی سے حجرے کا دروازہ بند کردیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں اور چچا سیاف چٹائی پر آمنے سامنے بیٹھے تھے اور میں اپنی دکھ بھری روداد بیان کررہا تھا۔ میں نے چچا سیاف کو بتایا کہ کس طرح ایک لڑکی کی مخبری پر ساحلی محافظوں نے لانچ کا پیچھا کیا۔ کس طرح فائرنگ کے تبادلے میں کمال نامی شخص ہلاک اور امین شدید زخمی ہوا اور کس طرح لانچ والوں نے راہِ فرار اختیار کرنے کے بعد ہمیں گہرے سمندر میں چھلانگیں لگانے پر مجبور کیا۔ ہم نے ان واقعات پر کافی دیر تک بات کی۔

اس روداد نے سیاف کو بھی غمزدہ کردیا۔ اس نے کہا کہ پہلے بھی اس طرح کے کچھ واقعات پیش آچکے ہیں لیکن ان کے پیچھے طاقتور ٹولہ ہے۔ انتظامیہ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد یہ لوگ پھر سرگرم ہوجاتے ہیں۔ کافی دیر ہم اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ میں نے ابوسیاف کو بتایا کہ ابراہیم بھی میری طرح جان بچانے میں کامیاب رہا ہے اور ہم دونوں عباسیہ کے ایک مسافر سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

ابراہیم کا ذکر شروع ہوا تو میں نے اس کی پوری کہانی چچا سیاف کو سنا ڈالی۔ اس کی غیر معمولی لگن اور اس کے غیر متزلزل عزم نے چچا سیاف کو بھی متاثر کیا۔ وہ یہ سن کر حیران ہوا کہ ابراہیم نے اپنے سینے اور بازوؤں کو جگہ جگہ سے مہرو کے نام کی مہر سے داغ رکھا ہے اور وہ اس کی خاطر اپنی جان کو ہر وقت ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے۔ میں نے سیاف کو جعفر کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا اور کہا کہ میں اس سے ابراہیم کے لیے مہرو کا رشتہ مانگنا چاہتا ہوں۔

"میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟" چچا سیاف نے اپنی عربی نما اردو میں پوچھا۔

"چچا! میں بات کرنے کے لیے تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

چچا سیاف تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن جیسا کہ تم نے بتایا ہے چودہ تاریخ کو لڑکی کی منگنی ہوگئی ہے۔ یہاں منگنی کی رسم کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ لڑکی کے گھر والوں کے لیے اپنی بات سے پھرنا کافی مشکل ہوجائے گا۔"

"لیکن یہاں دو زندگیوں کا سوال ہے چچا! میں سمجھتا ہوں کہ یہاں خاموشی گناہ ہے۔"

ہمارے درمیان تین چار منٹ تبادلہ خیال ہوا، آخر میں چچا سیاف کو رضامند کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ طے ہوا کہ ہم دونوں کل شام کو جعفر سے ملنے اس کے گھر جائیں گے۔

وہ رات کافی بے قراری میں گزری۔ خدا خدا کرکے شام ہوئی۔ ابراہیم کافی تناؤ میں نظر آتا تھا۔ مغرب کی نماز کے فوراً بعد میں چچا سیاف کی طرف روانہ ہوگیا۔ روضے سے چچا سیاف کو لینے کے بعد نو بجے کے قریب ہم دجلہ کنارے جعفر کے گھر پر پہنچ گئے۔ مجھے پتا تھا کہ جعفر کہیں بھی ہو، آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک گھر واپس آجاتا ہے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ دستک کے جواب میں تیرہ چودہ سالہ ملازمہ لڑکی نے دروازہ کھولا اور پھر ایک منٹ

بعد دراز قد جعفر ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ "تم یہاں؟ خیریت تو ہے؟" اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

"جی ہاں۔ آپ سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔"

جعفر نے ایک نگاہ چچا ابوسیاف پر ڈالی اور کوئی سخت بات کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے بیٹھک نما کمرے کا دروازہ کھلوایا۔ ہم عربی طرز کے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ چچا سیاف نے عربی میں اپنا تعارف خود کرایا اور جعفر کو بتایا کہ وہ روضے شریف کے خاص خادموں میں سے ہیں۔

"جی، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" جعفر نے پوچھا۔

اب بولنے کی باری میری تھی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ بات کا آغاز کیا۔ میں نے اسے ابراہیم کے بارے میں بتایا۔ جعفر ابراہیم کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا تھا۔ جب وہ مہرو کو یہاں لانے کے لیے پاکستان گیا تھا اور نواب شاہ پہنچا تھا تو ابراہیم سے بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے بڑے محتاط لفظوں میں جعفر کو بتایا کہ ابراہیم اور مہرو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ابراہیم صرف مہرو کی خاطر نواب شاہ سے ہزاروں میل کا سفر کرکے یہاں بغداد پہنچا ہے۔

جعفر ان لوگوں میں سے تھا جن کے تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود یہ جان کر کہ ابراہیم یہاں بغداد میں موجود ہے، اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی۔ بہرحال وہ بولا کچھ نہیں۔

اس نے میری پوری بات خاموشی سے سنی۔ بس ایک دو جگہ سوال کیا۔ آخر میں میں نے دل کڑا کرکے کہا۔ "میں جانتا ہوں جعفر بھائی! منگنی کے بعد آپ کے لیے یہ سب بہت مشکل ہوچکا ہے، اس کے باوجود میں کہوں گا کہ آپ بڑے پن کا ثبوت دیں۔ میں آپ کو اپنی اور چچا سیاف کی طرف سے یقین دلاتا ہوں کہ مہرو بہت خوش رہے گی۔ بہت خوشی والی زندگی گزارے گی۔"

جعفر نے عربی ملی اردو میں کہا۔ "میں ابھی تک تمہاری بات پوری طرح سمجھ نہیں پایا۔ تم کھل کر کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جعفر بھائی! ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کی خوشی اور ان کی بھلائی کی خاطر...... آپ مہرو کے لیے ابراہیم کا رشتہ قبول کرلیں۔"

جعفر خاموش رہا۔ اس کی نظریں میز پر جمی ہوئی تھیں جہاں کچھ دیر پہلے ملازمہ چائے کی پیالیاں اور کھجور کے بنے ہوئے بسکٹ رکھ گئی تھی۔

چند سیکنڈ بعد جعفر اٹھا اور اس نے ٹہلنے والے انداز میں کمرے کے اندر چند قدم اٹھائے۔ اس کی زخمی ٹانگ میں ابھی ہلکا سا لنگ باقی تھا۔ اس نے ملازمہ کو آواز دی۔ نوعمر ملازمہ گھبرائی ہوئی اندر آئی۔ جعفر نے شکستہ اردو میں اس سے کہا۔ "یہ چائے اور بسکٹ اٹھاؤ اور واپس لے جاؤ۔"

ملازمہ پہلے ٹھٹکی پھر آقا کے حکم کے مطابق ٹرے اٹھا کر واپس لے گئی۔ میں اور چچا سیاف دم بخود بیٹھے تھے۔ جعفر نے میری طرف انگلی اٹھائی اور سرد لہجے میں بولا۔ "تمہارے ساتھ روضے کے معزز خادم ہیں، ورنہ میں آج یہ تمہاری پتلون ضرور گیلی کردیتا...... چلے جاؤ یہاں سے...... فوراً چلے جاؤ۔" آخری الفاظ اس نے گرج کر کہے تھے۔

لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ مجھے پورے جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ لگا کہ پورے جسم کا خون سر کو چڑھ رہا ہے۔ شاید میں کچھ کہتا یا جعفر کو پکارتا لیکن اسی دوران میں چچا سیاف نے مضبوطی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "نہیں، بس اب چپ رہو۔" چچا نے کہا اور مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے آئے۔

بے عزتی کے شدید احساس سے میرے جسم کے ہر مسام نے پسینا اگل دیا تھا۔ مجھے خود سے زیادہ چچا سیاف کی توہین تکلیف دے رہی تھی۔ بہرحال چچا سیاف مجھے اپنے ساتھ لیتے چلے گئے۔ گلی میں مڑتے ہوئے میں نے ایک نظر جعفر کے گھر پر ڈالی۔ مجھے ایک کھڑکی میں مہرو کا چہرہ نظر آیا۔ جونہی میں نے دیکھا، چہرہ اوجھل ہوگیا۔ چاندی کی نتھ بھی اوجھل ہوگئی۔ کھڑکی بند ہوگئی۔ میں نے چہرے کی بس ایک جھلک ہی دیکھی تھی لیکن وہ جھلک یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ مہرو بے حد اداس اور غمزدہ ہے۔ اس نے کھڑکی بند کردی تھی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ دیا ہو...... میرے لیے پریشانیاں نہ اٹھاؤ بابو سائیں...... اور اس (ابراہیم) سے بھی کہہ دو، مجھے بھول جائے۔ جو کچھ ہماری تقدیر میں نہیں ہے، وہ ہم کیسے حاصل کرسکتے ہیں۔

چچا سیاف کو روضے میں چھوڑ کر میں مسافر سرائے واپس پہنچا تو ابراہیم بے چینی سے میرا انتظار کررہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آس کے دیے جل رہے تھے۔ وہ میرے چہرے سے نتیجے کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے بھی کوشش کی کہ اس کو کچھ پتا نہ چلے اور اپنی کوشش میں

میں کسی حد تک کامیاب ہوا۔

''کیا بنا ہارون سائیں؟'' ابراہیم نے بڑی امید سے پوچھا۔

''بن جائے گا یار! ایسے کام آہستہ آہستہ ہی بنتے ہیں نا۔''

''جعفر نے کوئی سخت بات تو نہیں کی؟''

''نہیں بھئی! اچھے طریقے سے ملا ہے۔ پوری بات سن کر تھوڑا سا ''شاک'' تو اسے لگا...... لیکن...... سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا ہے اس نے۔''

ابراہیم نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''ہارون سائیں! کہیں میرا دل رکھنے کے لیے تو نہیں کہہ رہے ہو؟''

''مجھے پتا ہوتا کہ تم اس طرح شک کرو گے تو ایک ٹیپ ریکارڈر ساتھ لے جاتا۔'' میں نے ذرا غصے سے کہا۔

وہ ایک دم میرے گھٹنے دبانے لگا۔ ''نہیں ہارون سائیں! آپ پر شک کیوں کروں گا۔ آپ تو میرے لیے وہ کر رہے ہیں، جس کا قرض میں ساری عمر نہیں اتار سکتا۔ آپ نہ ہوتے تو شاید میں اب تک کہیں مر کھپ گیا ہوتا۔'' اس کی سیاہ آنکھوں میں نمی آگئی۔

وہ مجھ سے تفصیل پوچھنے لگا کہ کیا باتیں ہوئیں؟ انہوں نے مجھے کیا کھلایا پلایا...... اور کس کس سے ملاقات ہوئی وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اسے مختصر جواب دیے اور سر درد کا بہانہ کر کے لیٹ گیا۔ رات کو میں دیر تک جاگتا رہا۔ رہ رہ کر مہرو کا خیال بھی آ رہا تھا کہ کہیں آج ہونے والی گفتگو کی وجہ سے مہرو کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ ہو جائے۔ جعفر کا رویہ دل و دماغ میں چنگاریاں سی بکھیر رہا تھا۔ اس نے مجھے سرخ جھنڈی دکھائی تھی اور واضح کر دیا تھا کہ میں اس سے آگے بڑھوں گا تو خطرناک زدن شروع ہو جائے گا لیکن میں اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ اگر کرخت بغدادی تھا تو میں بھی کڑک لاہوری تھا اور پھر میں جس طرح کے حالات سے گزر رہا تھا، مجھے جینے مرنے کی زیادہ پروا رہی بھی نہیں تھی۔ دن بہ دن ایک عجیب طرح کی بے حسی مجھ پر طاری ہوتی جا رہی تھی۔

اگلے روز صبح سویرے میں نے جعفر کے گھر فون کیا۔ یہ فون نمبر مجھے عطا صاحب سے ملا تھا۔ کم عمر ملازمہ نے فون اٹھایا۔ وہ اردو جانتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تمہاری مالکن مہرو سے بات ہو سکتی ہے؟''

اس سے پہلے کہ ملازمہ کوئی جواب دیتی، فون پر جعفر کی گرج دار آواز ابھری۔ اس نے عربی میں پوچھا۔ ''من انتا؟'' (کون ہے)

میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''جعفر بھائی! میں ہارون بول رہا ہوں۔''

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر جعفر پھنکارا۔ ''تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ میرے گھر میں فون کرو۔''

میں نے کہا۔ ''جعفر بھائی! میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے یہ بات ہم دونوں کے لیے بہت فائدہ مند ہوگی اور یہ آخری بات ہوگی۔ میرا وعدہ ہے اس کے بعد میں آپ کی مرضی کے بغیر آپ کو زحمت نہیں دوں گا۔''

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر جعفر نے ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''یہ بات فون پر مناسب نہیں ہوگی جعفر بھائی! آپ کسی بھی جگہ کا بتا دیں، میں وہاں پہنچ جاتا ہوں۔ میں آپ کا زیادہ وقت بھی نہیں لوں گا۔''

وہ پھر تھوڑی دیر خاموش رہا۔ شاید ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''کب آنا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جب بھی آپ کہیں۔''

ڈیڑھ دو منٹ کی گفتگو کے بعد ہم میں طے ہو گیا کہ ہم دو گھنٹے بعد سینٹرل چلڈرن پارک میں ملیں گے۔

مقررہ وقت پر میں اکیلا ہی مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔ یہ خوب صورت پارک تھا۔ جھولے وغیرہ تھے۔ چھوٹی سی مصنوعی جھیل میں بطخیں تیر رہی تھیں۔ چونکہ یہ ایک ورکنگ ڈے تھا اس لیے یہاں اِکا دُکا لوگ ہی نظر آتے تھے۔ میں جھیل کے قریب لکڑی کے ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ چار پانچ منٹ بعد ہی جعفر کی پرانے ماڈل کی ٹویوٹا بھی وہاں پہنچ گئی۔ وہ پینٹ کوٹ میں تھا۔ گاڑی سے نکلنے کے بعد اس نے مجھے دیکھ لیا اور سیدھا میری طرف آیا۔ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے بس اپنی انگلیوں کی پوریں میرے ہاتھ سے چھو لیں۔ ہم دونوں لکڑی کے بینچوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ گھڑی دیکھ کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''میں بھی زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا۔ میں آپ سے مہرو کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''وہ میری چھوٹی بہن ہے۔ تم اپنی زبان سے اس کا نام لیتے ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ تم مجھے بتاؤ کیا خاص بات کہنا چاہتے ہو۔''

''یہ بات اسی بارے میں ہے جعفر بھائی۔ آپ میری بات حوصلے سے سنیں اور برا نہ مانیں۔ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔''

''بکواس ہے یہ۔'' جعفر گرجا۔ ''میں نے رات کو بھی بات کی ہے اس سے۔ وہ ابراہیم کو بس ایک کزن سمجھتی ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہے بس اسی خبیث کے ذہن کا فتور ہے۔''

میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''اس ساری بات میں یہی پیچ ہے جعفر بھائی۔ وہ آپ سے بھی بہت پیار کرتی ہے۔ آپ کی ذرا سی ناراضی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لیے وہ چپ ہے۔ اپنے چہرے پر مسکراہٹ لے کر سب کچھ برداشت کر رہی ہے۔ وہ آپ کی بات مان لے گی اور اپنی ہر خواہش آپ پر قربان کر دے گی۔ مگر وہ زندگی بھر خوش نہیں رہ سکے گی۔ ابراہیم کو بھول نہیں سکے گی اور مجھے یقین ہے ابراہیم بھی یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گا۔ وہ ضرور اپنے آپ کے ساتھ کچھ کر گزرے گا۔ وہ عام لوگوں سے بالکل مختلف ہے جعفر بھائی۔''

''تم کسی ڈرامے یا فلم کی کہانی نہیں لکھ رہے ہو۔ یہ جیتی جاگتی زندگی ہے۔'' جعفر پھنکارا۔ ''بڑے دیکھے ہیں ایسے محبت کرنے والے اور مرنے والے...... اور میں تمہیں بتا دوں میں بہت سن چکا ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں سنوں گا۔ بہتر ہے کہ اس بات کو اب یہیں ختم کر دو۔ ہمیشہ کے لیے۔''

جعفر شکستہ اردو کے ساتھ ساتھ عربی کے الفاظ بھی بول رہا تھا۔ میں اس کی کہی ہوئی باتوں کو اپنے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں۔

اس کے تیور خراب ہوتے جا رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے پینترا بدلا۔ میں نے دھیمے لب و لہجے میں کہا۔ ''جعفر بھائی! جب میں آپ کے گھر میں اس رات رہا تھا، آپ نے مجھ سے ایک بات کہی تھی۔''

''کون سی بات؟''

''جب میں رخصت ہو رہا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ میں نے آپ پر احسان کیے ہیں اور آپ کسی کا احسان اپنے سر پر نہیں رکھتے۔ آپ نے کہا تھا کہ میں کچھ مانگنا چاہوں تو مانگ سکتا ہوں۔ جعفر بھائی! میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کبھی آپ پر کوئی احسان کیا ہے۔ میں تہ دل سے کہتا ہوں کہ وہ جو بھی تھا میرا اخلاقی فرض تھا۔ لیکن اگر آپ مجھ ناچیز پر کوئی مہربانی کر سکتے ہیں تو پلیز...... آج کر دیں۔ میں اپنے دوست کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ آپ اس کی زندگی بچا لیں۔'' میری آواز بھرا گئی۔ میں نے جعفر کے دونوں گھٹنے پکڑ لیے۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ ''پلیز جعفر بھائی! میں آپ کا یہ احسان مرتے دم تک نہیں بھولوں گا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ابراہیم بھی ہمیشہ آپ کی غلامی کرے گا۔''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے میرے ہاتھ اپنے گھٹنوں سے پیچھے ہٹائے اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''مجھے پتا نہیں کہ تمہارے ہاں، زبان سے پھرنے والے شخص کو کیا کہتے ہیں، لیکن ہمارے قبیلے میں اسے سور کا پیشاب پینے والا کہا جاتا ہے۔ تم میرے ساتھ یہی گندی کوشش کر رہے ہو اور ساتھ پلیز پلیز بھی کہہ رہے ہو۔ تمہارے صدقے واری جانے کو دل چاہ رہا ہے۔''

میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں انگارہ ہو گئی تھیں۔ اس نے تیزی سے میرا گریبان پکڑا اور زور سے جھنجوڑ کر زہریلی سرگوشی میں بولا۔ ''اگر تم دونوں کتے کی موت مرنا نہیں چاہتے...... تو پھر دفع ہو جاؤ یہاں سے...... اور یہ بھی سن لو، میں اپنی بہن کا نکاح آج ہی کر رہا ہوں...... ابھی، تین گھنٹے کے اندر اندر...... اور اگر آج ظہر تک مجھے تم دونوں میں سے کوئی کمینہ دوبارہ اپنے اردگرد نظر آیا تو میں شوٹ کر دوں گا اسے۔''

اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف جانا چاہ رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا۔ میں نے زمین پر بیٹھ کر اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''خدا کے لیے جعفر صاحب! ایسا نہ کریں۔ ان کی زندگیاں برباد ہو جائیں گی، وہ بے موت مر جائیں گے۔''

''دفع ہو جاؤ۔'' وہ چنگھاڑا اور اس نے میرے منہ پر لات رسید کی۔ میں پیچھے کی طرف گر گیا۔ میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھلنے لگا۔ چوٹ کھا کر دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ میں نے کہا۔ ''جعفر صاحب! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں۔''

وہ ایک دم مزید بپھر گیا۔ ''تو کیا کرو گے تم؟ کیا کرو گے؟ لڑو گے مجھ سے؟ تو ٹھیک ہے آؤ لڑو...... آؤ۔''

اس نے طیش کے عالم میں اپنا نیلا کوٹ اتار کر ایک طرف پھینک دیا۔ آستینیں اڑس لیں اور کسی باکسر کی طرح میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کا لمبوترا چہرہ دہک رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''میں آپ سے لڑنے کی جسارت نہیں کر سکتا لیکن میں آپ کو اس طرح جانے بھی نہیں دوں گا۔''

''تو پھر کیا کرو گے؟'' وہ دہاڑا اور طیش کے ریلے

میں بہہ کر مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے دیوانہ وار مجھ پر ٹھوکریں اور مکے برسائے۔ جو چند افراد پارک میں موجود تھے، وہ دور دور کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور ایک دیوار سے دے مارا۔ میرے اندر بھی ایک ضد نمودار ہوگئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے جتنا مرضی ماریں...... لیکن میں آپ کو یہ سب کرنے نہیں دوں گا۔''

''تیرا تو باپ بھی کرنے دے گا۔'' وہ پھر گرجا اور مجھے گھما کر دور گھاس پر پھینک دیا۔

اس کے بعد وہ پھر تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھا۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ اندر بیٹھ گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ انجن اسٹارٹ کرتا، میں ایک بار پھر اس کے پاس پہنچ گیا۔ ''نہیں جعفر صاحب! آپ ایسے نہیں جاسکتے...... یا پہلے مجھے مار دیں۔''

اس نے ایک بار پھر مجھے زور سے دھکا دیا اور گاڑی کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کا بازو پکڑا ہوا تھا۔ میرا بازو دروازے کے اندر آگیا اور شدید چوٹ لگی لیکن میں نے اس کا بازو نہیں چھوڑا۔ اس نے ایک بار پھر وزنی دروازے کو زور سے بند کیا مگر ناکام رہا۔ کہنی سے نیچے میرا بازو چوٹ سے سنسنا گیا۔ وحشت کے عالم میں اس نے بار بار دروازہ بند کیا اور میرے بازو کو شدید ضرب پہنچائی۔ آخر ناکام ہو کر وہ باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے گاڑی کا وزنی ''اسٹیرنگ لاک'' بھی نکال لیا تھا اور اسے کسی ڈنڈے کی طرح پکڑا ہوا تھا۔ اگلے ڈیڑھ دو منٹ میں اس نے اس آہنی راڈ کے ذریعے مجھے روئی کی طرح دھنک دیا۔ میرے ایک گھٹنے پر شدید چوٹ آئی۔ دو جگہ سے سر پھٹ گیا اور آنکھیں خون سے بھر گئیں...... میرے کانوں میں فاصلے سے کچھ آوازیں آرہی تھیں۔ یقیناً یہ وہ لوگ تھے جو دور سے یہ مار پیٹ دیکھ کر شور مچا رہے تھے۔

میں بھی جعفر پر ہاتھ اٹھا سکتا تھا لیکن میں نے نہیں اٹھایا۔ اس نے ملاقات کے شروع میں ہی مجھے مار پیٹ کا ڈراوا دیا تھا۔ اب میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں تک جاسکتا ہے...... اور وہ کافی دور تک گیا۔ میری آنکھوں میں خون جمع ہوگیا تھا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اچانک مجھے زوردار دھکا لگا اور مجھے پتا چلا کہ میں پانی میں گر گیا ہوں۔ یہ بہت گہرا پانی تھا اور مجھے تیرنا نہیں آتا تھا۔ یہ وہی مصنوعی جھیل تھی جس کے کنارے پر ہم بیٹھے تھے۔ مجھے لگا کہ میری کہانی ختم ہوگئی ہے۔ میں نیم سرد پانی میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر جان بچانے کے فطری عمل کے تحت میں نے اندھادھند ہاتھ پاؤں چلائے...... لیکن ہر بار تو قسمت ساتھ نہیں دیتی۔ میں نے سانس لی اور ڈھیروں پانی میرے پھیپھڑوں میں چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد مجھے تھوڑی سی روشنی نظر آئی۔ شاید میں مرنے سے پہلے آخری بار سطح پر ابھرا تھا۔ کسی بطخ کی مدھم ''قیں قیں'' سنائی دی۔ دل میں امید جاگی کہ شاید کوئی مجھے تھام لے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں پھر نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ سانس بند ہوچکی تھی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ آخری وقت کیسا ہوتا ہے۔

☆☆☆

کیا میں مر چکا ہوں؟ کیا یہ دوسری دنیا تھی؟ میں کہاں تھا؟ میرے اردگرد کون لوگ تھے؟ میں نے بہت کوشش کر کے آنکھیں کھولیں۔ مجھے اپنے اردگرد متحرک سائے نظر آئے۔ نتھنوں میں کسی دوا کی تیز بو گھس گئی۔ میرا مثانہ پیشاب سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے لگا، میں بہت دیر تک...... بےہوش رہا ہوں۔ میں نے ہمت کر کے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کسی لڑکی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا اور ملائمت سے بولی۔ ''نو...... نو...... پلیز۔''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پیشاب آرہا ہے۔''

اسی آواز نے کہا۔ ''یو کین ڈو واٹ ایور، یورین بیگ از اٹیچڈ ٹو یو۔''

مجھے پتا چلا کہ مجھے پیشاب کی نالی لگی ہوئی ہے۔

کچھ دیر بعد میں نے کچھ سکون محسوس کیا۔ مجھے لگا کہ میرے ہونٹ سوجے ہوئے ہیں۔ میں نے ہونٹوں کو بہ مشکل حرکت دی اور کہا۔ ''میں کہاں ہوں؟ جعفر کہاں ہے...... اور...... اور۔'' اچانک مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ میرے سینے میں ایک شدید ٹیس اٹھی۔ جعفر نے کہا تھا کہ وہ دو تین گھنٹے کے اندر اندر مہرو کا نکاح کرنے کے لیے جارہا ہے۔ تو کیا وہ نکاح ہو چکا تھا؟ مہرو ہمیشہ کے لیے ابراہیم سے بچھڑ چکی تھی؟ میں تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ ایسا کرتے ہوئے میرے سینے میں معدے کے قریب شدید ٹیس اٹھی اور میں بے حال ہوگیا۔ گھنگرالے بالوں والے ایک عراقی ڈاکٹر نے مجھے جھڑکا اور ہاتھوں سے دوبارہ لیٹنے کا اشارہ کیا۔ نرس نے میرے کندھے تھام کر مجھے دوبارہ لٹا دیا۔ میں نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ ''خدا کے لیے میری مدد کرو۔ مجھے ابراہیم سے ملاؤ...... یا ابوسیاف سے ملاؤ...... یہ بہت ضروری ہے۔ میں جلدی ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

نرس نے عربی میں کچھ کہا اور پھر مجھے تسلی دیتی ہوئی

باہر نکل گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں کسی اسپتال کے کمرے میں ہوں اور میری بائیں ٹانگ پٹیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ دواؤں کی وجہ سے ذہن پر دھندی چھائی ہوئی تھی۔ سامنے کیلنڈر پر پانچ تاریخ نظر آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا میں قریباً 72 گھنٹے بےہوش رہا تھا۔ وال کلاک پر دن کے دس بجے کا وقت نظر آرہا تھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ معدے میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

کچھ دیر بعد کسی نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور ہولے سے کہا۔ ''کیسے ہو سائیں؟''

میں نے جلدی سے آنکھیں کھولیں۔ میرے سامنے ابراہیم کھڑا تھا۔ میں نے پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر ابراہیم نے مجھے لیٹے رہنے پر مجبور کردیا۔ ''نہیں سائیں! آپ کا آپریشن ہوا ہے۔ ٹانکے خراب ہوجائیں گے۔''

میں نے آپریشن والی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''مہرو کہاں ہے؟ اس کے بارے میں کچھ پتا چلا تمہیں؟'' میری آواز لرز رہی تھی۔

''وہ ٹھیک ہے سائیں! سب ٹھیک ہے۔ بس تم ٹھیک ہوجاؤ۔ اللہ سوہنے نے تمہیں نئی زندگی دی ہے۔'' ابراہیم کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''میں یہاں کیسے آیا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

جواب میں ابراہیم نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ جب مجھے جھیل سے نکالا گیا تو میں تقریباً مردہ تھا۔ میری سانس رک چکی تھی اور نبض بھی ختم ہوچکی تھی۔ ایمبولینس والوں نے میرے پیٹ سے پانی نکالنے کے بعد میرے سینے کو بجلی کے شاک دیے تو میرے دل میں ہلکی سی حرکت پیدا ہوئی۔ مجھے فوراً قریبی اسپتال میں پہنچایا گیا۔ میرے جسم میں اندرونی اخراجِ خون بھی تھا۔ پتا چلا کہ کسی سخت ضرب کی وجہ سے معدے کے پیچھے جانے والی نالی زخمی ہوچکی ہے۔ اس کے علاوہ میرے گھٹنے میں بھی فریکچر تھا۔ مجھے فوراً آپریشن تھیٹر لے جایا گیا اور سینہ چاک کر کے متاثرہ نالی کا آپریشن کیا گیا۔ ڈاکٹر میری مسلسل بےہوشی کی وجہ سے بھی پریشان تھے۔ اس بےہوشی کا سبب ''پانی میں ڈوبنا'' اور دماغ کو آکسیجن کا نہ ملنا تھا۔ خدا خدا کر کے آج صبح کے وقت میری حالت بہتر ہونا شروع ہوئی تھی۔

میں ابراہیم سے مہرو اور جعفر کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن اسی دوران میں گھنگرالے بالوں والا عراقی ڈاکٹر کمرے میں واپس آگیا اور اس نے ابراہیم کو کمرے سے باہر نکال کر مجھے ہر طرح کی بات چیت سے منع کردیا۔

ابراہیم سے میری دوسری ملاقات رات آٹھ بجے کے قریب ہوئی۔ میری حالت قدرے بہتر ہوچکی تھی۔ بہرحال یہ سارا وقت میں نے سخت بےقراری میں گزارا تھا۔ ابراہیم کے ساتھ چچا سیاف بھی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں نے ابراہیم سے پھر پوچھا کہ مہرو کہاں اور کس حال میں ہے؟

وہ بولا۔ ''وہ ٹھیک ہے سائیں۔''

''ٹھیک تو ہے لیکن اس کا نکاح......؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوا سائیں...... جعفر پولیس کی حراست میں ہے۔''

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ انتظامیہ کا ایک بندہ اندر آگیا۔ اس نے چچا سیاف اور ابراہیم کو باہر نکلنے کا کہا...... اور مجھے بتایا کہ پولیس میرا بیان ریکارڈ کرنے کے لیے آئی ہے۔

چند منٹ بعد تین پولیس والے اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک لمبے قد کا تھا اور اس نے عینک لگا رکھی تھی۔ دو کافی ہٹے کٹے تھے۔ ان دونوں کے درمیان جعفر تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور ایک رخسار پر چوٹ کا سرخ نشان نظر آرہا تھا۔ شاید یہ چوٹ گرفتاری کے وقت یا گرفتاری کے بعد اسے لگی تھی۔

عینک والا آفیسر میرے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ باقی افراد کھڑے رہے۔ آفیسر نے کہا۔ ''کیا میں انگریزی میں بات کرسکتا ہوں؟''

''کسی حد تک۔'' میں نے انگریزی میں جواب دیا۔

آفیسر نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور جعفر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''مسٹر ہارون! کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟''

''جی ہاں۔''

''کیا یہی وہ شخص ہے جس نے تمہیں مارا اور پھر پانی میں پھینکا؟''

میں نے ایک نظر جعفر کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا اس کے ہاتھ لرز رہے ہیں۔ اس کا سر بدستور مجرمانہ انداز میں جھکا ہوا تھا۔ وہ سخت مصیبت میں لگتا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میرے بیان کی بےانتہا اہمیت ہے۔ اگر میں نے حقیقت بتا دی تو شاید...... وہ کئی برسوں کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جائے گا۔ یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ یہ آزمائش کی گھڑیاں تھیں اور پھر میں نے فیصلہ کرلیا۔

میں نے کہا۔ ”ہاں آفیسر! میرا جھگڑا انہی کے ساتھ ہوا تھا لیکن یہ ہمارا نجی معاملہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں میری بھی غلطی تھی۔ ویسے بھی یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ مجھے جان سے بھی مار دیں تو یہ ان کا حق بنتا ہے۔“ میری آواز بھرا گئی۔

جعفر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ آفیسر بھی حیران نظر آنے لگا تھا۔ اس نے کہا۔ ”مسٹر ہارون! تم جانتے ہو، تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”جی ہاں، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں بہت شرمندگی بھی محسوس کر رہا ہوں کہ میری وجہ سے بات اتنی بڑھی کہ میرا اور بڑے بھائی کا تماشا بنا۔ بہرحال بات یہاں تک نہیں پہنچنی چاہیے تھی۔“

آفیسر بولا۔ ”تم کہتے ہو کہ یہ تمہارے بڑے بھائی کی طرح ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر تمہارا بڑا بھائی یہ بھی جانتا ہوگا کہ تم کو تیرنا نہیں آتا۔ اس نے تمہیں پانی میں پھینکا۔ یہ قتلِ عمد کا اقدام تھا۔“

”نہیں آفیسر! یہاں آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ہم میں لڑائی ضرور ہوئی لیکن پانی میں مجھے انہوں نے نہیں گرایا تھا۔ کنارے پر میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔ یہ واپس مڑ گئے۔ ان کو پتا نہیں تھا کہ پانی اتنا گہرا ہے۔ آپ جہاں بھی کہیں، میں یہ بیان دینے کو تیار ہوں۔“

جعفر کا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔ آفیسر نے یکے بعد دیگرے مجھ سے کئی سوالات کیے لیکن میں جو فیصلہ کر چکا تھا، اس کے مطابق جواب دیے۔ آفیسر نے میرا بیان قلم بند کیا۔ مجھے تحریری بیان پڑھنے کے لیے کہا پھر اس پر میرے دستخط وغیرہ لیے۔ یہ ساری کارروائی ختم ہونے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ وہ لوگ جعفر سمیت واپس چلے گئے۔

رات گئے تک میں جاگتا رہا اور میری آنکھیں بار بار نم ہوتی رہیں۔ دل سے دعا نکلتی رہی۔ یا خدا! جعفر کا دل نرم کردے۔ تو دلوں کو پھیرنے والا ہے تو پھیر سکتا ہے۔ ہم ناچیز بندے تو بس حقیر کوششیں ہی کر سکتے ہیں۔ سب کچھ تیرے ہاتھ میں ہے۔

اگلے روز دوپہر کے بعد جب حافظ احسان میرے بستر کے قریب بیٹھا تھا، مجھے پتا چلا کہ جعفر مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اس کے چہرے پر طیش آمیز سنجیدگی تھی۔ حافظ احسان باہر چلا گیا۔ جعفر میرے قریب بیٹھ گیا۔ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا۔ پھر بڑے طیش سے بولا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو؟“

”مم...... میں سمجھا نہیں جعفر بھائی؟“

”تم نے ٹھیکا لیا ہوا ہے کرم نوازیاں کرنے کا۔ تم کیا سمجھتے ہو تم احسان کرتے جاؤ گے اور میں لیتا جاؤں گا......؟ لیتا جاؤں گا؟ نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔“

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میں نے تو آپ کو ایک بہت بڑی مشکل میں ڈالا ہے۔ آپ میری جان بھی لے لو تو شاید یہ آپ کا حق بنتا ہے۔“

”تم اسے مشکل کہہ رہے ہو۔ یہ عذاب ہے، بہت بڑا عذاب ہے میرے لیے۔“ اس نے اپنی کہنیاں اپنے گھٹنوں پر رکھیں اور ذرا آگے جھک کر اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک اسی طرح گم صم بیٹھا رہا۔ مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن جانے کیوں پہلی بار مجھے یوں لگا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ یہ میری خوش فہمی تھی یا واقعی پتھر پگھل رہا تھا؟ دفعتاً وہ اٹھا اور میری طرف دیکھے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟ ذہن میں کئی خدشے سر اٹھانے لگے۔ کہیں وہ پھر طیش کے منہ زور ریلے میں نہ بہہ جائے...... کہیں اس کا غصہ ابراہیم یا پھر مہرو کو نقصان نہ پہنچا دے۔

میں نے حافظ احسان کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ ابراہیم کہاں ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ غوث پاک کے روضے کے ساتھ والی مسجد میں جمعہ پڑھنے گیا ہے۔

میں نے شام تک بے چینی سے ابراہیم کا انتظار کیا لیکن وہ نہیں آیا۔ میں نے حافظ احسان سے کہا کہ وہ چچا سیاف کو فون کرے۔ اس نے فون کیا۔ وہاں سے پتا چلا کہ ابراہیم نے عصر کی نماز مسجد میں پڑھی تھی۔ ابو سیاف کے ایک ساتھی نے بتایا کہ نماز کے بعد وہ ایک لمبے قد کے عراقی کے ساتھ کہیں چلا گیا۔

میرے دل کی دھڑکنیں زیر و زبر ہونے لگیں۔ قوی امکان تھا کہ وہ لمبے قد والا شخص جعفر ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں؟ میں نے سوچا کہ احسان سے کہوں، وہ جعفر کے گھر پر فون کرے...... لیکن اسی دوران میں ابراہیم آتا دکھائی دیا۔ میں نے فاصلے سے ہی دیکھ لیا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سیدھا میری طرف آیا اور جذباتی انداز میں میرا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگایا، اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”کیا ہوا ابراہیم؟“ میں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

”ہم جیت گئے سائیں...... سب کچھ ٹھیک ہوگیا بلکہ...... میں تو کہوں گا، آپ جیت گئے۔ آپ نے سب کچھ ٹھیک کر دیا۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میرا دل یکبارگی دھڑک اٹھا تھا۔

وہ میرے ہاتھ کو اپنے رخسار سے لگاتے ہوئے بولا۔ ”سائیں! جعفر بھائی مان گئے۔ انہوں نے میرے اور مہرو کے رشتے کے لیے ہاں کہہ دی ہے۔ انہوں نے ہی مجھ کو بھیجا ہے کہ میں جا کر آپ کو بتاؤں۔“

میری آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو امڈ آئے۔ میں چند لمحے ابراہیم کی شکل دیکھتا رہا۔ میں نے اپنا سر سرہانے سے اٹھایا اور بیٹھے بیٹھے ابراہیم کو گلے سے لگا لیا۔ آپریشن کی جگہ پر شدید ٹیسیں اٹھیں لیکن خوشی کی لہر اتنی شدید تھی کہ ان ٹیسوں کا پتا ہی نہیں چلا...... ہم کتنی ہی دیر ایک دوسرے کو گلے سے لگائے رہے، پھر ابراہیم نے بڑی احتیاط سے مجھے دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔ اسی دوران میں دروازے پر حافظ احسان نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں عربی مٹھائی کا چھوٹا سا ڈبا تھا۔

☆☆☆

اگلے دس پندرہ روز میں کئی اہم کام ہوئے۔ میں نے اپنی مرضی سے خود کو کمرے سے وارڈ میں شفٹ کرا لیا تھا۔ جعفر اور عطا صاحب کے تعاون سے ابراہیم، ورکشاپ والے بازار میں کرائے کی دکان حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا...... اور میری توقع کے عین مطابق پہلے دوسرے دن سے ہی اس کی دکان چلنا بھی شروع ہوگئی۔ جعفر نے اس کے ویزے میں توسیع کے لیے ایمبیسی میں درخواست بھی جمع کرا دی۔ اصل صورتِ حال جاننے کے بعد مہرو کے منگیتر نے دانش مندی کا مظاہرہ کیا اور خود ہی راستے سے ہٹ گیا۔ اس نے خوش دلی کے ساتھ جعفر کو خدا حافظ کہہ دیا۔ جعفر نے اسے کوفہ میں اپنے ایک واقف کار کے پاس بہتر ملازمت دلا دی۔ جس روز میں اسپتال سے فارغ ہوا اس سے تیسرے روز دریائے دجلہ کے کنارے کے علاقے میں جعفر کا دو منزلہ مکان روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ یہ مہرو اور ابراہیم کی شادی کی رات تھی۔ میرے لیے یہ بڑی خوشی کا موقع تھا۔ پروگرام کے مطابق مہرو کو فی الحال رخصت ہو کر اسی مکان کے نیچے والے پورشن میں رہنا تھا۔ شادی مقامی رسموں کے مطابق ہوئی۔ رخصتی کے وقت میں نے مہرو کے سر پر پیار دیا۔ وہ ایک دم رونے لگی اور میرے کندھے سے لگ گئی۔ ”بابو سائیں! آپ نہ ہوتے تو کچھ نہ ہو سکتا تھا۔“

اس نے سرگوشی کی۔

میں نے کہا۔ ”لیکن تم نے پھر بھی میرے لیے کچھ نہیں کیا۔“

”جی؟“

”بھئی! ایک بریانی تک تو کھلائی نہیں تم نے۔“

وہ روتے روتے مسکرا دی۔ ”میں آپ کو جرور کھلاؤں گی...... بلکہ ہر روج کچھ نہ کچھ پکا کے کھلاؤں گی۔“

وہ دونوں اپنے حجلۂ عروسی میں چلے گئے لیکن میں پتا نہیں کیوں اردگرد ہی گھومتا رہا۔ دل میں اداسی تھی اور انجانے اندیشے تھے۔ ایک رات مجھ پر بھی تو ایسی آئی تھی، ایک رات میرے گھر میں بھی تو شادیانے بجے تھے اور روشنیاں جگمگائی تھیں۔ میری دلہن سیج پر بیٹھی انتظار کرتی رہی تھی اور میں ہزاروں میل دور آ گیا تھا...... شاید کبھی واپس نہ جانے کے لیے۔ پتا نہیں کیوں آج بھی دھڑکا سا تھا کہ کچھ ہو نہ جائے۔

اس رات میں بہت تھوڑی دیر کے لیے سویا۔ صبح ابراہیم کو خوش و خرم دیکھ کر تسلی ہوئی۔

جعفر کا گھر کافی کشادہ تھا۔ اس نے زیریں منزل پر ایک کمرا مجھے اور حافظ احسان کو رہنے کے لیے دے دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم جب تک چاہیں یہاں رہ سکتے ہیں لیکن چوتھے پانچویں روز ہی میں نے جعفر اور عطا صاحب سے جانے کی اجازت مانگ لی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں روضے میں اپنے دوستوں کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ جعفر اور عطا صاحب تیار نہیں تھے، عطا صاحب کی بیٹیاں بھی بڑی معصومیت کے ساتھ یہ زور دے رہی تھیں کہ میں ان کے گھر پر رہوں لیکن میں نے ان کو قائل کر لیا۔

روضے میں جانے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ حافظ احسان اب پاکستان واپس جا رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں کمرے میں تنہا رہنا نہیں چاہتا تھا۔ بس ایک انجانا سا خوف تھا جو کسی صورت دل سے نکلتا نہیں تھا۔ درحقیقت میں نے اسپتال میں کمرا چھوڑ کر وارڈ میں جانا بھی اس لیے پسند کیا تھا کہ میں شیخ حارث کے والد کی ہدایت کے مطابق رات کو اکیلا رہنا نہیں چاہتا تھا۔ میں پھر کہوں گا کہ میں کوئی کمزور دل شخص نہیں ہوں لیکن جو کچھ بار بار میرے ساتھ ہو چکا تھا اس کے بعد ایسی دلیری...... بے وقوفی کے زمرے میں ہی آتی تھی۔

میں اور حافظ احسان روضے میں واپس پہنچ گئے۔ سارے پرانے دوستوں نے خوش دلی سے میرا استقبال

کیا۔ ''پپو واپس آگیا...'' کی کئی آوازیں سنائی دیں۔ روضے میں آنے کے بعد ایک چھوٹا سا اندیشہ ضرور دل میں موجود رہا اور وہ یہ کہ کہیں کمال رشید کے کسی ساتھی سے دوبارہ ملاقات نہ ہوجائے۔ بہرحال ایسا کچھ نہیں ہوا۔

چھ سات روز بعد جب حافظ احسان پاکستان واپس جانے کے لیے روانہ ہوا تو میں بہت اداس ہوگیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ وہ ایک ایسے دیس میں جارہا ہے، جہاں میں اب کبھی قدم نہیں رکھ سکوں گا اور جب کبھی قدم رکھنے کا سوچوں گا نادیدہ حالات مجھے گھیر لیں گے۔

احسان کی فلائٹ رات دس بجے تھی۔ میں روضے کے احاطے میں سر کے نیچے تکیہ رکھ کر لیٹ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ احسان کو بغداد ائرپورٹ سے کراچی لے جانے والا جہاز مجھے یہاں سے نظر آئے گا اور وہ واقعی نظر آیا۔ بغداد کے تاریک آسمان پر ایک پُرگونج آواز کے ساتھ یہ طیارہ مشرق کی سمت بڑھتا چلا جارہا تھا۔ اس کے نیچے ایک روشنی بار بار چمک رہی تھی۔ وہ پاکستان جارہا تھا۔ میرے بچھڑے ہوئے دیس میں، میری کھوئی ہوئی سرزمین کی طرف۔ میں اسے حسرت سے دیکھتا رہا۔ میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے لیکن میں نے جلدی سے آنسو صاف کرلیے اور اپنا دھیان کسی دوسری طرف لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے دل میں یہ خوف جاگزیں ہوچکا تھا کہ میں جب بھی اس رخ پر سوچوں گا، میرے اردگرد کچھ ہوجائے گا۔ کچھ ویسا ہی، جو شیخ حارث کے گھر میں ہوا تھا اور جس نے مجھے موت کے منہ میں پہنچادیا تھا۔

آنسو پونچھنے سے آنسو ختم تو نہیں ہوجاتے۔ یہ پانی تو جب امڈتا ہے، ہر رکاوٹ کو توڑ دیتا ہے۔ میں بھی منہ چھپا کر روتا رہا...... اور روتا رہا۔ ''یا اللہ میری مدد کر۔ میری خطائیں بخش دے۔'' میں بے بسی کے عالم میں بار بار یہ الفاظ دہرا رہا تھا۔ اچانک میرے سرہانے کی طرف آہٹ ہوئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ میرے سامنے حضرت عالی مقام کھڑے تھے۔ وہی، جن کو میں نے بغداد میں دیوانوں کی طرح ڈھونڈا تھا۔ جن کی تلاش میں دور دور گیا تھا۔ آج وہ بغیر میری کسی کوشش کے میرے سامنے موجود تھے۔ انہوں نے خاکی جبّہ پہن رکھا تھا اور سلیٹی رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ چہرے سے نور پھوٹ رہا تھا۔ پتا نہیں، میرے دل میں کیا آئی، میں نے ایک دم ان کے پاؤں پکڑ لیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''یا حضرت! کہاں چلے گئے تھے آپ...... آپ نے کیوں مجھ سے منہ پھیر لیا...... کس غلطی کی سزا دی مجھ کو؟''

وہ بیٹھ گئے۔ میری پشت پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ میری بلند آواز سن کر ابوسیاف بھی حجرے سے نکل آیا۔ حضرت عالی مقام نے مجھے کندھوں سے تھاما اور اپنے پاؤں سے جدا کر کے مجھے اپنے سامنے بٹھایا۔ میرے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ حضرت عالی مقام نے اپنا بازو بڑھایا اور مجھے اپنے ساتھ لگالیا۔ میں ہچکیاں لینے لگا۔ انہوں نے کچھ کہا۔ چچا سیاف نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''حضرت پوچھ رہے ہیں، اپنے گھر جاؤ گے؟''

میں بلک پڑا۔ ''میں کیسے جاسکتا ہوں حضرت! وہ مجھے جانے نہیں دے گا۔ کبھی جانے نہیں دے گا۔''

چچا سیاف نے میری بات کا ترجمہ حضرت عالی مقام تک پہنچایا۔ چچا سیاف کے ذریعے میرے اور عالی مقام کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ اس طرح تھی۔

وہ بولے۔ ''کون جانے نہیں دے گا؟ تم جاسکتے ہو۔ تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ہاں بچے! تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ تم نے کفارہ ادا کردیا ہے۔ تم نے بھوکے کو کھانا کھلا دیا ہے۔ کھلا دیا ہے نا۔'' وہ عجیب لہجے میں بول رہے تھے۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا، حضرت عالی مقام۔ آپ...... کس بھوکے کی بات کررہے ہیں؟''

''تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔ اس کا نام ابراہیم ہے۔''

میرا سر چکرانے لگا۔ ''ابراہیم؟'' میں نے پھٹی آنکھوں میں حیرت لے کر عالی مقام کی طرف دیکھا۔ وہ دور خلا میں جیسے کسی نامعلوم چیز پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ بولے۔ ''وہ بھی ایک طرح کی بھوک ہی تھی نا۔ محبت کی بھوک...... کسی کو حاصل کرنے کی بے پناہ طلب۔ اس طلب کی وجہ سے وہ جیتے جی مر رہا تھا۔ قبر میں جارہا تھا۔ تم نے اس کا تقاضا پورا کردیا۔ اسے اس کی چاہت سے ملادیا، اس کا عشق کامل کردیا۔ تم نے کفارہ ادا کردیا۔ بس یہی تھا تمہارے ذمے...... اور تم اس ذمے داری سے سبکدوش ہوئے......''

''میری عقل آپ کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہے عالی مقام۔'' میں نے لرزاں آواز میں کہا۔

وہ بہ دستور کھوئے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''بہت سی باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں لیکن وہ ہوتی ہیں۔ ان باتوں کی، ان واقعات کی ایک ترتیب ہوتی ہے۔ ان کو ویسے ویسے ہونا ہوتا ہے جیسے جیسے لوحِ محفوظ میں لکھا گیا ہوتا

ہے۔ اناج کہیں اگتا ہے...... مسافر کہیں سے چلتا ہے، روٹی کہیں پکتی ہے...... اور لقمہ مقررہ وقت پر منہ میں پہنچ جاتا ہے۔ تم کہیں تھے، وہ لڑکی کہیں تھی، ابراہیم کہیں تھا لیکن تم تینوں نے ایک کہانی کو تکمیل دینا تھا اور تمہاری قربانی اور ہمت سے وہ کہانی مکمل ہو گئی ہے۔''

انہوں نے شاباش دینے والے انداز میں ایک بار پھر میری کمر پر ہاتھ پھیرا۔ مجھے لگا جیسے میں جاگتی آنکھوں سے ایک خواب دیکھ رہا ہوں۔ حضرت عالی مقام نے شفیق لہجے میں کہا۔ ''میں نے سنا ہے تم نے پاکستان میں اپنے گھر والوں کو ایک خط لکھا تھا اور پھر پھاڑ دیا تھا۔''

''جی حضرت۔'' میں نے کانپتی آواز میں اقرار کیا (میرا سر چکرا رہا تھا)

وہ بولے۔ ''وہ خط دوبارہ لکھو اور اگر چاہو تو ابھی لکھو۔''

انہوں نے چچا سیاف کو اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے حجرے میں گیا اور ایک کاغذ قلم لے آیا۔ عالی مقام نے کاغذ قلم میرے ہاتھ میں تھمایا اور کہا کہ لکھو۔ میرے ہاتھ لرزنے لگے۔ مجھے کافور کی بو آئی۔ مجھے لگا، ابھی کہیں سے وہ ہیولا نمودار ہونے والا ہے۔ عالی مقام نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا اور تسلی بخش انداز میں کہا۔ ''لکھو، اطمینان سے لکھو...... میں یہیں تمہارے پاس بیٹھا ہوں۔''

میرے اندر عجیب سا حوصلہ پیدا ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد میں کاغذ پر سر جھکائے، کانپتے ہاتھوں سے لکھ رہا تھا۔ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر عالی مقام تسبیح پکڑے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ میری نگاہوں کے سامنے میرے سب پیاروں کی صورتیں آ گئیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ لفظوں کے ذریعے ان سے لپٹ رہا ہوں۔ ان کو اپنے دکھڑے سنا رہا ہوں۔ میں نے یہ خط اس بار اپنے عزیز ترین دوست شیخ تنویر کے نام لکھا۔ یہ خط کیا تھا، بس آنسوؤں کا ایک دریا تھا۔ میں نے تنویر کو لکھا کہ میں نہیں جانتا کہ میرے بعد وہاں لاہور میں کیا ہوا ہے لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہاں ایک بڑی قیامت گزری ہے۔ اس قیامت کی ہولناکی اور تپش میں یہاں تک محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے اس خط میں تنویر پر انکشاف کیا کہ میں یہاں لاہور اور پاکستان سے ہزاروں میل دور بغداد میں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے روضے پر موجود ہوں اور تقریباً ملنگ کی شکل اختیار کر چکا ہوں۔ میں نے ان دردناک حالات کی بھی تھوڑی سی تصویر کھینچی جو مجھے یہاں پیش آئے تھے۔ آخر میں، میں نے لکھا...... میں شرمندگیوں اور ندامتوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہوں تنویر۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اپنے گھر والوں کا سامنا کر سکوں۔ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا۔ اب جو کرنا ہے تم نے کرنا ہے۔

خط لکھنے کے بعد اسے پوسٹ کرنے کا مرحلہ تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے پھر وہی نقشہ گھوم گیا جب مجھے پوسٹ آفس کے دروازے کے سامنے سے واپس آنا پڑا تھا اور خوف کے سبب میں دو دن تیز بخار میں مبتلا رہا تھا۔

عالی مقام نے جیسے میرے چہرے سے میرے خیالات پڑھ لیے۔ انہوں نے ابوسیاف سے کچھ کہا۔ ابوسیاف نے ترجمہ کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ ''حضرت کہہ رہے ہیں۔ کل جب خط پوسٹ کرنا ہوگا تو وہ تمہارے ساتھ جائیں گے۔''

یہ بات سن کر میرے سینے میں اطمینان کی ایک بلند لہر دوڑ گئی۔

اگلے روز صبح دس بجے کے لگ بھگ میں مرکزی پوسٹ آفس پہنچا۔ عالی مقام میرے ساتھ تھے اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک ایسے مضبوط حفاظتی حصار میں ہوں جس سے ٹکرا کر دنیا کی ہر مصیبت چکنا چور ہو سکتی ہے...... دروازے کے سامنے پہنچ کر میں نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ آج وہاں کوئی نہیں تھا۔ ارد گرد بھی کوئی نہیں تھا۔ کوئی دل دہلا دینے والی سرگوشی بھی نہیں تھی۔ کافور اور مشک کی بو بھی نہیں تھی۔ آج کچھ نہیں تھا۔ بس عالی مقام تھے اور ان کے چہرے سے پھوٹتی ہوئی روشنی تھی۔

میں خط پوسٹ کر کے واپس روضے پر پہنچا تو مجھے یوں لگا جیسے ایک بہت بڑا پہاڑ میرے کندھوں پر سے ہٹ گیا ہے۔ میں نے خود کو ہوا کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اب میری ساری سوچیں اس خط کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے تصور کی نگاہ سے اس خط کو سفر کرتے دیکھا۔ وہ بحر ہند کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا، ریگستانوں اور پہاڑوں کو پھلانگتا ہوا پاکستان پہنچا اور پھر زندہ دلوں کے شہر لاہور پہنچ گیا۔ میں نے تصور کی نظر سے دیکھا...... میرا خط اچھرہ کی سردار مارکیٹ میں شیخ تنویر کی دکان پر ہے۔ وہ دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں کے ساتھ میرا خط کھول رہا ہے، پڑھ رہا ہے...... پھر وہ میرے گھر کی طرف بھاگ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ہیں۔ وہ میرے گھر والوں کو میرے خط کے بارے میں بتاتا ہے، وہاں ایک تہلکہ سا مچ جاتا ہے۔ خط کو دل کی آنکھوں سے پڑھا جا رہا ہے۔ ایک دوسرے سے چھینا جا رہا ہے (بعد ازاں ثابت ہوا کہ خط پہنچنے کے بعد لاہور میں وہی

کچھ ہوا جس کا میں نے تصور کیا تھا)

☆☆☆

خط پوسٹ ہوئے سات روز ہو چکے تھے۔ اب مجھے خط کے ردعمل کا انتظار تھا اور یہ بڑا کٹھن انتظار تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ ردعمل کیا ہوا ہوگا بلکہ یہ خبر بھی نہیں تھی کہ خط منزل پر پہنچ سکا ہے یا نہیں۔

ہاں...... ان چار پانچ دنوں میں یہ بات ضرور ہوئی کہ میرے اندر کا خوف بتدریج ختم ہو گیا تھا۔ اندھیرا پھیلتے ہی جس طرح بے چینی مجھے گھیرتی تھی اور تنہائی جس طرح مجھے ہراساں کرتی تھی، وہ سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ عالی مقام آج کل روضے میں ہی تھے اور ان کی نورانی صورت گاہے بگاہے میری ڈھارس بندھاتی تھی۔ انہوں نے کتنے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ کے فضل و کرم سے بلا ٹل چکی ہے...... اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ کفارہ ادا ہو چکا ہے۔

ان کی کچھ باتیں میری سمجھ میں آتی تھیں، کچھ نہیں آتی تھیں لیکن ان کی ساری باتوں میں ایک خاص قسم کی روحانی مضبوطی ضرور ہوتی تھی اور شاید ان کی باتیں حقیقت کے عین مطابق بھی تھیں۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ انہوں نے کہا تھا ہر مصیبت کے ٹلنے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ بندہ اپنے رب سے اپنا رشتہ مضبوط رکھے اور انتظار کرے۔

میرے گھٹنے کی چوٹ اب ٹھیک تھی لیکن آپریشن والی جگہ پر اب بھی کبھی کبھی درد ہوتا تھا۔ جسم کی دیگر چوٹیں بھی دھیرے دھیرے ٹھیک ہو رہی تھیں۔ ابراہیم ایک بار روضے میں آ کر مجھ سے مل چکا تھا۔ ایک دن وہ پھر آ گیا۔ وہ اچھے لباس میں تھا۔ چہرے پر خوشی کی چمک تھی۔ وہ پہلے بھی نماز روزے کا پابند تھا لیکن اب کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ اس نے چھوٹی سی ڈاڑھی بھی رکھ لی تھی جو اسے اچھی لگتی تھی۔ اس نے بتایا کہ جعفر بھائی اس پر بہت مہربان ہیں اور وہ سوچ رہا ہے کہ وہ کچھ عرصے تک اپنی والدہ کو بھی پاکستان سے یہاں بلا لے۔ اس کا کام بغیر کسی انتظار کے چل نکلا تھا۔ وہ میرے لیے کافی سارا پھل لے کر آیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''سائیں! مہرو آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ جعفر بھائی بھی کہہ رہے تھے کہ جس طرح بھی ہو سکے، میں آپ کو گھر لے کر آؤں۔ زیادہ نہیں تو ایک رات تو ہمارے پاس رہیں۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میری چھوٹی بہن سے کہنا میں جمعے کے دن آؤں گا...... وہ میرے لیے بریانی پکا کر رکھے۔''

''سائیں! جمعہ تو بہت دور ہے۔ آپ کل کا رکھ لیں۔ کل بھی تو چھٹی ہے۔''

تھوڑی سی تکرار کے بعد اس نے مجھے تیسرے دن آنے پر آمادہ کر لیا۔ مہرو کو حاصل کرنے کے بعد وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ جو پھل لایا تھا وہ ہم سب نے مل کر کھایا۔

عشا کی نماز کے بعد میں دیر تک دعا مانگتا رہا۔ جندل خاں اور آفتاب گل کی بخشش کی دعا مانگی۔ اپنے لیے بھی التجائیں کیں۔ پھر وہیں احاطے میں مصلے پر لیٹے لیٹے سو گیا۔

کسی نے مجھے ہلا کر جگایا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ٹیوب لائٹ کی مدھم روشنی میں بڑے بھائی جان اسلم میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں۔ غنودگی کی حالت میں مجھے بالکل یہی لگا کہ یہ میرا وہم ہے لیکن جب ''ہارون'' کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔ ذہن پر چھائی ہوئی غنودگی چھٹنے لگی۔ بھائی جان میرے سامنے کھڑے تھے۔ یہ وہم نہیں تھا، نہ ہی جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔ وہ میرے سامنے تھے اور ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ میں تڑپ کر اٹھا۔ انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ میں ان سے چمٹ گیا...... اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ بھی رونے لگے۔ ہماری آوازیں سن کر ارد گرد موجود لوگ جاگ گئے۔ آنکھیں ملتے ہوئے ہمارے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ پتا نہیں میں نے کیا، کیا کہا اور بھائی جان نے کیا، کیا سنا۔ مجھے بس اتنا پتا ہے کہ انہوں نے مجھے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا اور میری کمر پر ہاتھ پھیرے چلے جا رہے تھے۔ ہمارے ملاپ کا وہ منظر دیدنی تھا اور بہت رقت آمیز بھی۔ روضے کے کسی انڈین خادم کی اڑتی اڑتی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''ہارون کے وارث آ گئے۔''

کچھ ہی دیر بعد چچا ابوسیاف بھی موقع پر پہنچ گئے۔ سفر اور تھکن کے سبب بھائی کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ میں ان سے بہت کچھ جاننا چاہتا تھا اور وہ بھی مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن ابھی ہم دونوں کے لیے یہی کافی تھا کہ میں خیریت سے تھا اور میرے گھر میں بھی خیریت ہی تھی۔ یہ رات کے دو بجے کا عمل تھا۔ چچا سیاف نے کھانے کا پوچھا لیکن بھائی کو بھوک نہیں تھی یا شاید مجھے دیکھ کر ختم ہو گئی تھی۔ انہوں نے قہوے اور خشک میووں سے تواضع کی۔ پھر ہم دونوں بھائی نم آنکھوں کے ساتھ باہر احاطے میں آ بیٹھے اور باتیں کرنے لگے...... میرے گھر والوں کو صرف چار دن

پہلے میرا خط ملا تھا۔ بھائی جان نے اسی وقت ارجنٹ پاسپورٹ بنوایا اور کل سہ پہر چار بجے کی فلائٹ بغداد کے لیے پکڑلی۔ وہ رات قریباً ایک بجے بغداد ائرپورٹ پر اترے تھے۔ وہ اکیلے تھے، انجان لوگ تھے۔ انجان زبان تھی۔ سیکیورٹی کا ماحول بڑا سخت تھا۔ ایک نیک دل پاکستانی نے ان کی پریشانی دیکھ کر ان کی مدد کی تھی اور یوں وہ بذریعہ ٹیکسی روضے پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

ہم نے پرنم آنکھوں کے ساتھ بہت باتیں کیں لیکن بھائی کی مہربانی کہ انہوں نے مجھ سے وہ سوال نہیں پوچھے جن کے جواب میں دینا نہیں چاہتا تھا اور ان میں سے سب سے اہم سوال یہی تھا کہ میں اپنی سہاگ رات میں سب کو روتا چھوڑ کر اچانک غائب کیوں ہوگیا تھا؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا اور اگر میں جواب دیتا بھی تو کوئی یقین نہ کرتا۔

اگلے روز صبح سویرے ہم نے قریبی بازار سے ناشتا کیا اور واپسی کے پروگرام پر بات کی...... میں اس سے آگے کی باتوں کو تفصیل سے لکھوں گا تو یہ روداد بہت طویل ہوجائے گی...... مختصر یہ کہ ہم دونوں اس روز روضے سے رخصت ہوکر ایک اچھے ہوٹل میں پہنچ گئے۔ وقتِ رخصت روضے کے بہت سے خادموں نے مجھے بھیگی آنکھوں کے ساتھ الوداع کہا اور دعائیں دیں۔ چچا سیاف نے بہت دیر تک مجھے گلے لگائے رکھا۔ میں حضرت عالی مقام کی قدم بوسی کرنا چاہتا تھا لیکن میرے راستے آسان کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر کہیں اوجھل ہوچکے تھے لیکن وہ کہیں بھی ہوتے، میرے دل میں تھے۔ ان کی باتیں میرے سینے کو روشن کررہی تھیں۔ میرے پاس تھوڑی سی رقم تھی جو میں نے برے بھلے وقت کے لیے بچا کر رکھی ہوئی تھی، وہ میں نے روضے کے تین غریب خادموں میں بانٹ دی۔ یہ کوئی پچاس کے قریب عراقی دینار تھے۔ میں نے اس مقام پر بہت سخت دن بھی گزارے تھے لیکن جب میں بھائی کے ساتھ یہاں سے روانہ ہوا تو مسجد اور روضے کے در و دیوار کو دیکھ کر دل بھر آیا۔

میرے پاکستان روانہ ہونے میں ایک دو قانونی الجھنیں تھیں لیکن اسی نیک دلِ پاکستانی نے ایک بار پھر ہماری مدد کی جو ائرپورٹ پر بھائی جان کا واقف بنا تھا۔ سیکیورٹی اور نگرانی کافی سخت تھی۔ صرف چند دن پہلے اسلام آباد ائرپورٹ پر عراقی سفارت خانے کے سامان میں سے کچھ اسلحہ برآمد ہوا تھا جس کی وجہ سے سفارتی سرگرمیاں متاثر ہوئی تھیں اور دونوں طرف ذرا کشیدگی کا ماحول تھا۔

بھائی نے ہوٹل سے ہی اپنے اس پاکستانی مددگار کو فون کیا اور اس سے کافی دیر تک باتیں کیں۔ اس نے تسلی دی کہ پریشانی کی بات نہیں وہ صبح تک سب ٹھیک کرلے گا۔ یہ شخص ائرپورٹ کا ہی ملازم تھا۔

وہ رات ہم نے اس آرام دہ ہوٹل میں گزاری۔ بھائی جان ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے جدا نہیں ہوئے۔ انہیں جیسے یہ اندیشہ تھا کہ میں پھر کہیں ان کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوجاؤں۔ مجھے ان کی حالت پر ترس آرہا تھا اور انہیں یقیناً میری حالت پر آرہا ہوگا۔ اگلے روز ہم دونوں نے تھوڑی دیر بغداد کی سیر بھی کی۔ سیر کیا ہونا تھی، ہر وقت یہی دھڑکا لگا تھا کہ ائرپورٹ سے کیسے گزریں گے۔ آئندہ چوبیس گھنٹے میں کیا میں واقعی پاکستان پہنچنے والا تھا؟ اپنے گھر والوں کو اور اپنی بیوی کو دیکھنے والا تھا؟ یہ سوال بار بار ذہن میں ابھر رہا تھا۔ ہم ایک پاکستانی کی دکان کے قریب سے گزرے تو وہاں ٹیپ ریکارڈر پر ایک کافی کے بول گونج رہے تھے۔ آواز بھی ریشماں جیسی کسی لوک گلوکارہ ہی کی تھی۔ بول کچھ اس طرح تھے کہ اے خدا میں اپنے وعدوں کا پاس نہ رکھ سکا، اب شرم کے سمندر میں غرق ہوں......

بقول عالی مقام میری کہانی بھی تو ایک وعدے کی خلاف ورزی کی کہانی ہی تھی۔ وہ وعدہ جو میرے آباؤ اجداد میں سے کسی نے کیا اور اسے نبھایا مگر مجھ تک پہنچتے پہنچتے اس وعدے کی اہمیت بہت کم ہوگئی اور نتیجے میں مجھے ایک سزا بھگتنا پڑی، میں دیر تک اس کافی کے بولوں میں گم رہا۔

ائرپورٹ پر ہونے والی کاغذی کارروائی کے دوران میں میرا دل بری طرح دھڑکتا رہا۔ کسی بھی وقت کوئی پریشانی سامنے آسکتی تھی۔ مجھ میں اب اور تکلیف جھیلنے کی ہمت نہیں تھی۔ بھائی جان بھی سخت تناؤ میں تھے۔ خدا خدا کرکے وہ گھڑی آئی جب ہم بورڈنگ کارڈز لے کر ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچے۔ ہم نے عشا کی نماز پڑھی۔ میں نے رو رو کر خدا کا شکر ادا کیا جس نے بالآخر میری مشکلیں آسان کی تھیں۔ ہمارا جہاز فضاؤں میں بلند ہوا تو نیچے روشنیوں کا سمندر نظر آیا۔ یہ بغداد تھا۔ میری نشست کھڑکی کی طرف تھی۔ میں نے نیچے دیکھنا شروع کیا۔ مجھے دریائے دجلہ اور اس میں رواں کشتیوں کی روشنیاں نظر آئیں۔ اس دجلہ کے کنارے پر کہیں جعفر کا گھر بھی تھا۔ اس گھر میں معصوم صورت والی مہرو اور ابراہیم بھی رہتے تھے۔ پچھلے دو روز میں کئی بار میرے دل میں آیا تھا کہ رخصت ہونے سے پہلے ایک بار ان سے مل لوں لیکن سفر کی تیاری کے لیے وقت

بہت کم تھا اور جو کچھ ہو رہا تھا اتنی تیزی سے ہو رہا تھا کہ اس کی مہلت ہی نہیں ملی۔ میں نے آسمان کی بلندیوں سے ہی ان دونوں کو خداحافظ کہا اور ان کو پرمسرت زندگی کی دعائیں دیں۔

اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور میں دل ہی دل میں مسکرادیا۔ مہرو کی پکائی ہوئی بریانی ایک بار پھر میرے ہونٹوں تک نہیں پہنچ سکی تھی (آج میں نے ان کے گھر کھانا کھانے کا وعدہ کیا ہوا تھا) سچ کہتے ہیں کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔

ہمارا جہاز کچھ دیر کے لیے کویت میں رکا اور پھر وہاں سے دوبارہ پرواز کرکے لاہور کی طرف روانہ ہوگیا۔ جوں جوں منزل قریب آتی گئی میری حالت خراب ہوتی گئی۔ دل جیسے سینے کے بجائے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا، مجھے کیسی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ مجھ سے کیا، کیا سوال پوچھے جائیں گے؟ میں عارفہ کا سامنا کیسے کروں گا؟ اپنے والدین سے کیسے معافی مانگوں گا...... بھائی جان جہاز کے اندر مجھے مسلسل تسلی دے رہے تھے۔ جب لاہور کے در و دیوار نظر آئے تو میں اپنے دکھ کو ضبط نہ کرسکا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بھائی جان نے مجھے گلے سے لگا کر حوصلہ دیا۔ وہ بولے۔ ”تم بالکل بے فکر ہوجاؤ۔ تم سمجھو کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ سب کچھ پہلے کی طرح ہوجائے گا۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ بے شک ایک غلطی ہوئی ہے لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ کبھی کوئی اس غلطی کا ذکر تک نہ کرے گا۔ تم اپنی مرضی سے کچھ بتانا چاہو تو ٹھیک ہے، ورنہ ہم تم سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔ کبھی نہیں پوچھیں گے۔ ہمارے لیے یہی بہت ہے کہ تم پھر سے ہمارے پاس ہو۔“

بھائی جان کی باتوں نے میرے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو کافی حد تک کم کردیا...... ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی جب ہم لاہور ائرپورٹ پر اترے۔ گھر میں کسی کو خبر نہیں تھی کہ ہم لاہور میں لینڈ کرچکے ہیں۔ بھائی جان نے ائرپورٹ سے فون پر اپنی آمد کی خوش خبری سنائی۔ ائرپورٹ سے چوبرجی پارک تک میں نے ٹیکسی میں جو سفر کیا وہ ایک مشکل ترین سفر تھا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور لگتا تھا کہ میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ جب گھر کے سامنے پہنچی تو وہاں اہلِ خانہ کے علاوہ خاندان کے کئی افراد بھی جمع تھے۔ میں ان مناظر کو شاید لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا اور نہ اس کیفیت کا نقشہ کھینچ سکتا ہوں جو وہاں موجود تھی۔ میں جیسے صدیوں کا سفر طے کرکے اپنے پیاروں تک پہنچا تھا۔ وہ مجھ

سے لپٹ رہے تھے، مجھے چوم رہے تھے، دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور میں بھی رو رہا تھا۔ پورا گھر آوازوں سے گونج رہا تھا۔ میں اپنی ماں کے قدموں میں گر گیا۔ ”مجھے معاف کردیں...... میں نے آپ کو بہت دکھ دیے...... آپ کی خوشیوں کو غارت کیا...... میں آپ کا مجرم ہوں۔“

ہر طرف سے جیسے ایک ”خاموش آواز“ ابھر رہی تھی اور چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ دُلہا واپس آگیا...... دُلہا واپس آگیا۔

لوگوں کے ہجوم میں، میں نے اپنی دلہن کو بھی دیکھا۔ وہ اللہ کی بندی خاموشی سے میری طرف دیکھتی چلی جارہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے...... یہ آنسو کہہ رہے تھے...... میں کوئی شکوہ نہیں کروں گی...... نہ ہی کچھ پوچھوں گی، تم بھی کچھ نہ بتانا۔ بس میرے لیے یہی کافی ہے کہ تم آگئے ہو۔

☆☆☆

قارئین! ان واقعات کو اب قریباً چالیس برس گزر چکے ہیں۔ میری عمر 67 سال کے لگ بھگ ہے۔ میرے ماشاءاللہ تین بچے ہیں اور ان کے بھی بچے ہیں۔ میں ایک خوش و خرم زندگی گزار کر ریٹائرمنٹ کے دور میں پہنچ چکا ہوں۔ کافی عرصے سے میں بہت تبدیل ہوچکا ہوں۔ نماز روزے کی پابندی کرتا ہوں۔ چھوٹی سی ڈاڑھی بھی رکھ لی ہے۔ اپنی طاقت اور حیثیت کے مطابق صدقہ خیرات بھی کرتا ہوں، خاص طور سے ضرورت مند، مستحق لوگوں کو کھانا کھلانے سے مجھے بہت راحت ملتی ہے۔ اپنے بڑوں کی ہدایت کے مطابق اپنی طویل گمشدگی کے سلسلے میں میں نے اپنی زبان تقریباً بند ہی رکھی ہے۔ اس زبان بندی کی وجہ سے مختلف افواہیں بھی پھیلتی رہی ہیں۔ کسی نے کہا ہارون کو ہوائی چیزیں اٹھا کرلے گئی تھیں، کسی نے کہا یہ جھوٹ بولتا ہے۔ بغداد وغیرہ نہیں گیا تھا، یہیں کہیں چھپا ہوا تھا۔ کسی نے خیال ظاہر کیا، یہ شادی سے بھاگا ہے اور کچھ ایسے بھی تھے، جنہوں نے کہا کہ اس کے بھائی جان اسے کراچی سے لے کر آئے تھے اور شاید کسی نے اسے اغوا کیا تھا۔ بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں۔ جب کوئی بہت پوچھتا تو میں یہی بتاتا کہ مجھے کسی نے کوئی نشہ آور چیز کھلادی اور اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا، میں نے خود کو کراچی میں پایا...... اور پھر اتنا دلبرداشتہ ہوا کہ واپس آنے کے بجائے آگے جانا بہتر سمجھا۔

میں جانتا تھا کہ اگر میں حقیقت بتاؤں گا اور ان واقعات کا ذکر کروں گا جو پیش آئے تو کوئی یقین نہیں

کرے گا۔ اسے میری دیوانگی کہا جائے گا۔ بہرحال اپنے طور پر میں گئے برسوں میں بہت سوچ بچار کرتا رہا ہوں۔ اللہ والوں سے ملا ہوں، سائیکالوجسٹ اور پیراسائیکالوجسٹ سے بھی رجوع کیا ہے۔ روحانیت کے دعوے دار لوگوں سے بھی تبادلہ خیال کیا ہے لیکن آج چالیس سال گزرنے کے باوجود کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ وہ سب کیا تھا؟ کیا واقعی اس کائنات میں کچھ ہیولے ہمارے اردگرد موجود رہتے ہیں؟ کیا ایسے ہی ایک ہیولے نے مجھے شادی کی رات لاہور سے اٹھایا اور میرا پیچھا کرتے کرتے مجھے بغداد تک پہنچایا؟ جہاں مجھے ایک کہانی کو مکمل کرنا تھا۔ ایک مجبور شخص کے بے پناہ دکھ کا مداوا کر کے اسے اس کی بچھڑی محبت سے ملانا تھا۔ شاید جس طرح خود کھانا کھانے سے پہلے ایک فاقہ زدہ کو کھانا کھلایا جاتا ہے، اسی طرح قدرت نے میرے ذمے بھی یہ لگا دیا تھا کہ میں خود ازدواجی خوشیاں حاصل کرنے سے پہلے کسی دوسرے کو ان خوشیوں سے ہمکنار کروں...... اور اگر نہ کروں تو خود بھی انجانی سرزمینوں پر بھٹکتا رہوں...... اوپر والے کے رمز اوپر والا ہی جانتا ہے۔

میں چالیس سال پہلے کے ان واقعات کو اپنے دل ودماغ سے کھرچ دینا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں دوبارہ کبھی ان کرداروں سے نہیں ملا جن سے اس ہولناک سفر میں میرا واسطہ پڑا تھا۔ فیروز خاں، جعفر، من موہنی صورت والی مہرو سچی محبت کی آگ میں کندن بننے والا ابراہیم، عطا صاحب، چچا سیاف...... میں نے کبھی کسی سے ملنے یا اس کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے بغداد سے پرواز کرتے ہی ان سب کرداروں کو ہمیشہ کے لیے خیرآباد کہہ دیا تھا۔ وہ جہاں رہیں خوش رہیں۔ ان کرداروں میں سے بھی کسی نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ وہ کرتے بھی کیسے؟ صرف رحیم یار خان والے امین کے سوا کسی کے پاس میرا اتا پتا نہیں تھا اور مجھے یقین تھا کہ امین اس ہولناک رات میں، لانچ پر ہونے والی خونی جھڑپ میں زندہ نہیں بچ پایا ہوگا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو اس نے کبھی نہ کبھی رابطہ ضرور کرنا تھا۔

آخر میں پھر وہی سوال کہ اس سفید پوش ہیولے کی حقیقت کیا تھی؟ کیا وہ صرف میرے ذہن کی پیداوار تھا یا سچ مچ... اس کا کوئی وجود تھا۔ اگر میں ایک پڑھا لکھا، روشن خیال شخص نہ ہوتا تو میرے لیے اس کے وجود پر یقین کرنا بالکل مشکل نہیں تھا لیکن میں اپنی سوچ کے انداز اور اپنے سائنٹیفک مزاج کا کیا کروں جو مجھے ہمیشہ ایک کرب میں مبتلا رکھتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میں کینیڈا سے آئے ایک معروف مذہبی اسکالر سے ملا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''قدرت نے ہمارے ذہن میں اتنی طاقت رکھی ہے کہ وہ کسی بھی سوچ کو ایک جیتی جاگتی ٹھوس شکل دے کر ہمارے سامنے لا سکتا ہے اور کسی بھی ٹھوس شکل کو سچ مچ ناپید کر سکتا ہے۔'' تو کیا وہ ہیولا بھی حقیقت اور خیال کے درمیان کی ایک شکل تھا اور ان سچائیوں میں سے ایک تھا جن کے بارے میں ہمیں آنے والے دور کی سائنس بتائے گی؟

میں آخر میں ایک بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ بات پڑھنے والوں کو ضرور چونکائے گی اور کچھ سوچنے کی دعوت دے گی۔ میری کہانی کا آغاز شادی کی رات ہوا تھا۔ میں نے شامیانے کے اندر بیٹھی ہوئی دو مجلے دار عورتوں کی زہریلی گفتگو سنی تھی۔ یہ گفتگو میرے بارے میں تھی۔ اس گفتگو نے میرے اندر کی ساری روشنیاں ایک دم بجھا دیں اور مجھے تاریکیوں کے سفر پر روانہ کر دیا۔ بغداد سے واپس آنے کے دو تین دن بعد میں نے باتوں باتوں میں والدہ سے پوچھا۔ اور مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ وہ دو عورتیں تو شادی میں آئی ہی نہیں تھیں (ان میں سے ایک کا نام استانی فوزیہ اور دوسری کا آنٹی ممتاز تھا) وہ دونوں پڑوسنیں تھیں اور عین میری شادی کے دن ان دونوں کو ایک فوتگی میں گجرات جانا پڑا تھا۔

مجھے یقین نہیں آیا...... مجھے لگا شاید والدہ کو کوئی مغالطہ ہو رہا ہے لیکن جب دیگر اہلِ خانہ نے بھی یہی بات بتائی تو میں سناٹے میں رہ گیا۔ میں نے ان دونوں آنٹیوں کو نہ صرف سنا تھا بلکہ دو تین بار انہیں اپنی برات میں دیکھا بھی تھا۔ مجھے ان کے کپڑوں کے رنگ تک یاد تھے...... بہرحال میں نے اس بارے میں بھی کسی سے بحث نہیں کی۔

اور اس سے بھی زیادہ پراسرار بات یہ ہے کہ ان دونوں آنٹیوں کو میرے علاوہ میری دلہن عارفہ نے بھی دیکھا اور باقاعدہ ان سے بات کی تھی۔

تاہم جب بعد میں ان عورتوں سے بات ہوئی اور انہوں نے خود کہا کہ وہ اس دن لاہور میں نہیں گجرات میں تھیں تو پھر میری بیوی نے بھی یہی سمجھا کہ اسے دھوکا ہوا تھا میرے لیے اس سلسلے میں خاموش رہنا ہی بہتر تھا اور میں خاموش ہی رہا۔

اب ان باتوں کو کیا کہا جائے، اتفاق...... وہم...... ماورا یا پھر انسانی ذہن کی بے بسی۔ فیصلہ آپ کریں۔